The Harf E Raaz

Part 1st

This is a collection of columns written by **Orya Maqbool Jan** and Published in Express News Paper (www.express.pk) during 2009,10 and 2011.

اوریا مقبول جان
حرف راز
orya_m@yahoo.com

آئے عشاق' گئے وعدہ فردا لے کر

مجھے لگتا ہے آپ کے آنے سے پہلے ہی ہمارا بلاوا آ جائے گا۔ میں نے کہا میں صرف ایک رات کے لیے تو جا رہا ہوں۔ کل واپس لوٹوں گا تو آپ کے پاس حاضری دوں گا اور آپ کو ابھی نہیں جانا چاہیے' ابھی آپ کے اس جہاد کی فتح کے دن آنے والے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں پر اللہ کا کتنا کرم ہوتا ہے، انہیں کس قدر یقین ہوتا ہے' انہیں کتنی تڑپ ہوتی ہے اپنے رب سے ملاقات کی۔ نفس مطمئنہ کے جس مقام پر اللہ تعالیٰ انہیں فائز کرتا ہے تو انہیں دنیا چھوڑنے کا ذرا بھی ملال تک نہیں ہوتا۔ میں 28 دسمبر کی شام ان سے یہ وعدہ کر کے شورکوٹ ایئر فورس بیس پر قائداعظم اور دو قومی نظریے پر منعقدہ تقریب کے لئے چلا گیا۔ مجھے کس قدر یقین تھا کہ میں واپس آؤں گا تو ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ اور انہیں کس قدر ایمان تھا کہ ان کا بلاوا آ چکا ہے۔ آخری فقرہ یہی تھا کہ لگتا ہے ہماری ملاقات نہ ہو سکے۔ ساری زندگی ایک مقصد کی لگن میں لڑتا ہوا ایک مجاہد اپنے رب کی بارگاہ میں اپنی جدوجہد کا انعام حاصل کرنے جا پہنچا۔ عبدالودود خان۔ اس ملک میں کتنے لوگ ہوں گے جو اس شخص کے کام سے آشنا ہوں گے۔ زندگی کی چکاچوند میں اور میڈیا پر ابھرتے' ڈوبتے اور بدلتے مناظر میں یہ عظیم مجاہد کتنا گمنام تھا۔ لیکن کبھی کبھی میں نظر دوڑا کر اس شخص کی محنت' لگن اور جدوجہد کو دیکھتا ہوں تو حیرت سے سوچتا رہ جاتا ہوں کہ اللہ نے اسے کس قدر توفیق عطا فرمائی تھی۔ زندگی بھر ملک سے باہر رہے۔ سرمایہ کی بھی کوئی کمی نہ تھی لیکن اپنا تمام سرمایہ' حوصلہ اور زندگی کا ایک ایک لمحہ سودی نظام کے خلاف جدوجہد میں گزار دیا۔ میں نے سود کے بارے میں ان کی کتاب آج سے دس سال قبل کوئٹہ میں مشرق اخبار کے دفتر میں ایک جانب گرد آلود پڑی ہوئی دیکھی' میں نے کتاب اٹھا کر ورق گردانی شروع کی اور پھر اخبار کے ایڈیٹر کامران ممتاز سے سوال کیا' یہ شخص کون ہے' اس نے کہا' ہے ایک دیوانہ' دنیا کے خلاف اکیلا لڑنا چاہتا ہے۔ میں کتاب اٹھا کر گھر لے آیا اور پھر زندگی کے معمولات میں گم ہو گیا۔ کچھ سالوں بعد میں نے سود پر اپنے کالموں کا ایک سلسلہ شروع کیا تو ان کا سعودی عرب سے ایک تفصیلی خط ملا۔ میں بالکل غور نہ کر سکا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی کتاب میں نے مشرق اخبار کے گرد آلود ڈھیر سے اٹھائی تھی۔ لیکن اس خط میں میرے لئے بہت سے حیرت کے سامان تھے۔ عبدالودود خان اس حقیقی اسلامی معاشرتی نظام کی بات کر رہے تھے جس میں سود مکمل طور پر نہیں ہوتا۔ کسی بھی صورت میں اس کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ پھر ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ وقت کی دھول میں ہم لوگ کہاں کہاں کھو جاتے ہیں لیکن دیوانے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں' اپنی منزل کھوٹی نہیں کرتے۔ آج سے دو سال قبل ان کا فون آیا۔ کہنے لگے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ کہ قویٰ مضمحل ہیں' ہمت بہت کم ہے لیکن پھر بھی خود آؤں گا۔ اگلے دن ایک نحیف و نزار فرد' بمشکل قدم اٹھاتا ہو' میرے دفتر میں داخل ہوا۔ لیکن اس چہرے کے گرد ایک ایسا نور کا ہالہ تھا کہ میں دم بخود رہ گیا۔ آنکھوں میں ہلالی چمک۔ ہاتھوں میں کاغذوں کا ایک پلندہ پکڑے' مجھے یوں لگا جیسے اس میں کوئی فرد جرم ہے جو مجھ پر لگنے والی ہے اور قضا و قدر نے اس شخص کو میرا احتساب کرنے کے لیے بھیجا ہے۔

یہ ملاقات کیا تھی' مجھ پر علم اور آگہی کے دروازے کھلنے لگے۔ انہوں نے اس مملکت خداداد پاکستان میں سود کے نظام کے خلاف اپنی جدوجہد سنانا شروع کی تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ ہمارا میڈیا' ہمارے لکھنے والے' ہمارے اہل دانش اس ساری جدوجہد سے کس قدر ناآشنا بھی تھے۔ اور اگر آشنا تھے تو انہوں نے کس قدر مجرمانہ غفلت سے اس جدوجہد کا ذکر تک نہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پورے ملک میں اسلامی بینکنگ کا شور تھا' اسلامی شریعت بینچ کا فیصلہ آ چکا تھا اور وہ لوگ جو اس سودی نظام کے ساتھ اپنی زندگیاں وابستہ کیے ہوئے تھے' جن کی سیاست اور سیادت سب کی سب اس نظام کی بقا کے گرد گھومتی تھی۔ جب یہ ساری بحث عدالت کے دروازے کھٹکھٹا رہی تھی تو عبدالودود خان بھی اپنی درخواست لے کر وہاں جا پہنچے۔ حکومتیں مہلت مانگ رہی تھیں کہ ہمیں اپنے سارے بینکاری نظام کو اسلامی بنانے کے لئے کچھ وقت درکار ہے اور دوسری جانب عبدالودود خان اپنی زندگی بھر کی تحقیق لے کر عدالت جا پہنچے جس میں انہوں نے بتایا کہ اس سارے سسٹم کو نافذ کرنے کے لئے ان کے پاس ایک جامع نظام موجود ہے۔ ملاقات کے دوران انہوں نے مجھے اپنی وہی کتاب عطا کی جسے میں نے دس سال قبل گرد آلود ڈھیر سے اٹھایا اور پھر بھول گیا۔ کتاب کیا تھی سودی نظام کے مقابل میں اسلام کے بینکاری نظام کا ایک مکمل اور جامع خاکہ' ایک ایک ترتیب اور مرحلے کے ساتھ۔ میں نے سوال کر دیا کہ یہ جو موجودہ بینکاری ہو رہی ہے اسلام کے نام پر۔ مسکرا دیئے اور میرا شک مزید گہرا ہو گیا۔ کہنے لگے یہ کیسا نظام ہے کہ ایک عمارت میں ایک کھڑکی اسلامی نظام والے سسٹم کی ہے اور دوسری سودی نظام والی۔ اسلام کے اس نظام بینکاری کو جس طرح دنیا بھر کے سرمایہ دارانہ نظام نے یرغمال بنایا ہے اور جس طرح اس کو ایک مخصوص مفاد کے تابع کر کے اپنی ضروریات کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے، عبدالودود خان اس پر سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے۔ کون سی ایسی جگہ تھی جہاں وہ نہیں گئے' کون سی ایسی شخصیت تھی جس سے وہ نہیں لڑے۔ سٹیٹ بنک کے گورنر سے لے کر بڑے بڑے بنکوں کے اسلامی بورڈوں میں بیٹھے علماء تک سب سے ان کی شدید بحثیں چلتی رہیں۔ ان کے ایک سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا کہ اگر یہ اسلامی بینکنگ سسٹم اتنا ہی اچھا ہے تو سارے بنکوں میں سے باقی سودی نظام کی کھڑکیاں بند کیوں نہیں کر دی جاتیں۔ ظاہر ہے یہ ایک دکھاوا اور ڈھکوسلا ہے۔ پوری دنیا کے علماء اسے ایک عارضی صورت حال بتاتے ہیں' ایک ایسی کیفیت جس کو طوعاً و کرہاً قبول کیا جائے' کوئی اس سے مکمل طور پر مطمئن نہیں۔ لیکن عبدالودود خان جو ایک متبادل نظام لے کر ان لوگوں کے پاس گھومتے رہے وہ حیران کن حد تک قابل عمل اور اسلامی اصولوں کے مطابق تھا۔ آخری دنوں میں انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ان کا یہ نظام صرف میڈیا کے ذریعے لوگوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اس ضمن میں میرے اللہ کا کرم ہے کہ ان کی نگاہ انتخاب مجھ پر پڑی۔ اور پھر ان سے روز فون اور ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اس قدر محبت سے ملتے' بمشکل چل سکتے تھے لیکن خود آ کر دروازہ کھولتے۔ آخری ملاقات میں کہنے لگے۔ میں نے اپنے سارے پیسے جمع کئے' 20 لاکھ روپے عمران خان کے شوکت خانم کو دینے کا کہا تاکہ ملاقات کا وقت مل سکے اور پھر وہ ان سے خود ملے اور کہا کہ میں نے وعدہ لے لیا ہے کہ اگر وہ اقتدار میں آ گیا تو سودی نظام ختم کر دے گا۔ مجھے کہنے لگے کہ میں ان کے بعد عمران کو یہ وعدہ یاد دلاتا رہوں۔ آخری دنوں میں نے ان کے اس سسٹم کے بارے میں ان کے دو انٹرویو ریکارڈ کروائے' وہ بہت مطمئن تھے۔ شاید وہ یہ جدوجہد کسی اور کے سپرد کر کے جانا چاہتے تھے اس لیے یہ نشر نہ ہو سکے۔ ان کا کام آج بھی اس پوری امت کے لئے تشہیر چاہتا ہے' یہ بتانے کے لئے کہ اس امت میں ایک ایسا عظیم شخص بھی تھا جس نے اسلام کے اصولوں کے مطابق ایک مکمل بینکنگ سسٹم بنایا۔ جس کو نافذ کرنے کے لئے لوگ ہچکچاتے رہے۔ پاکستان کے ہر کالم نگار' دانشور اور میڈیا کے فرد کو انہوں نے خط لکھے' انہیں آخری عمر تک جواب نہ مل سکے۔ اپنا تمام سرمایہ علم ایک امانت کے طور پر اس امت کے لئے چھوڑ گئے۔ آخری عمر کے چند مہینے مجھے ان کی محبتیں اور دعائیں سمیٹنے کا موقع ملا لیکن جس جہاد کا پرچم وہ خاموشی سے میرے ہاتھ پکڑا گئے دعا کریں میں اس میں ثابت قدم رہ سکوں' میرے پاؤں میں ان کے جذبے کی ایک رتی بھی شامل ہو گئی تو میرے لیے حوصلے کا باعث اور بخشش کا سامان ہو گی۔ نفس مطمئنہ کے ساتھ جانے والوں کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے' انہیں اپنے اللہ سے ملنے کی تڑپ دیوانہ کیے رکھتی ہے اور اپنی ساری زندگی کی جدوجہد پر انعام ملنے کا یقین سا ہوتا ہے۔

کانچ کا آدمی‘ فولاد کا ضمیر

یہ ستر کی دہائی تھی۔ اس ملک میں نظریاتی سیاست ابھی باقی تھی‘ یوں تو پیپلزپارٹی کا عوامی طوفان عوام کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا، لیکن کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامی جمعیت طلبہ کے اسلامی انقلاب کے نعرے گونج رہے تھے۔ بائیں بازو کے کمیونسٹ خیالات رکھنے والے دانشور ذوالفقار علی بھٹو سے وابستہ امیدیں ٹوٹنے پر پریشان اور غصے میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کبھی بھی پیپلز سٹوڈنٹ فیڈریشن مقبول تو دور کی بات سرے سے وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ بایاں بازو نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (این ایس ایف) کے بینر تلے یونیورسٹی الیکشن لڑتا تھا۔ کیسے کیسے نام تھے اس زمانے کے‘ جو آج سیاست کے آسمان پر طلوع ہیں۔ ادھر ملک میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت بنی اور ادھر پنجاب یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس یونین کی صدارت ایک ایسے شخص کو نصیب ہوئی جو اس سیلاب کے مقابلے میں انقلاب‘ انقلاب‘ اسلامی انقلاب کے نعرے لگایا کرتا تھا۔ جاوید ہاشمی‘ یوں لگتا تھا اس شخص کے وجود میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں‘ ہر زیادتی پر سراپا احتجاج‘ ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہوا‘ سمن آباد گرلز کالج سے دو بہنوں کا اغوا ہوا‘ الزامات اس وقت کے گورنر غلام مصطفےٰ کھر تک جا پہنچے تو یہ شخص گورنر ہاؤس کی دیواروں سے جا ٹکرایا۔ پاکستان اسلامی کانفرنس میں بنگلہ دیش منظور کرنے کی کوشش میں تھا کہ جاوید ہاشمی پولیس کی مار کھاتا پنجاب اسمبلی کے سامنے سے بنگلہ دیش کا جھنڈا اتارنے میں کامیاب ہوگیا۔ ایک ایسا شخص جس کے دل میں پاکستان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ گرفتاریوں کی ایک داستان ہے‘ تشدد کے اتنے قصے ہیں کہ بیان کرنے پر آؤں تو لوگ آنسو نہ روک پائیں۔ برف کی سلوں پر لٹانے سے لے کر رات بھر زنجیروں سے باندھنے اور بہیمانہ جسمانی تشدد جاوید ہاشمی کا مقدر کر دیا گیا۔ بنگلہ دیش نامنظور مہم تھی یا ختم نبوت کی تحریک‘ جیل کے دروازے اس پر ہمیشہ کھلتے رہے۔ اس زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو کا وہ مشہور فقرہ انتظامیہ میں زبان زد عام تھا "WhoisHashmigivehimkalaBaghtreatment" (یہ ہاشمی کون ہے‘ اسے نواب کالاباغ کی طرح سلوک کرو)۔ نواب کالاباغ گورنر امیر محمد خان مخالفین کو تشدد کے ذریعے مجبور کرنے پر مشہور تھے۔ اس سارے عرصے میں جب جاوید ہاشمی عوامی جلسوں سے خطاب کرتا تو ہجوم والہانہ طور پر جیوے جیوے ہاشمی کے نعرے بلند کرتا۔ مقبولیت تو اللہ کی عطا ہوتی ہے لیکن جاوید ہاشمی سے عوام اور طلبہ کی یہ والہانہ محبت اسلامی جمعیت طلبہ کے نظم میں موجود اراکین پر گراں گزرتی تھی۔ معلوم نہیں انہیں اس کھرے اور سادہ سے انسان سے کیا خوف تھا‘ یوں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے دعائیں اور محبتیں سمیٹنے والا یہ نوجوان دلبرداشتہ سا ہوتا گیا۔ اس دور میں اس کا اکثر وقت رانا چیمبرز میں قومی ڈائجسٹ کے مدیر مجیب الرحمان شامی کی صحبت میں گزرنے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نوے فیصد سے زیادہ کالجوں میں اسلامی جمعیت طلبہ کی سٹوڈنٹ یونین جیتتی تھیں۔ ان سارے طلبہ رہنماؤں کو جماعت اسلامی کے پلڑے میں ڈالنے کے لئے ایک ینگ پالی ٹیشنز کنونشن منعقد کیا گیا جہاں جاوید ہاشمی کی فطری قیادت کی جگہ فرید پراچہ کو آگے لایا گیا۔ ہاشمی کو جماعت اسلامی نے کھو دیا۔ ملتان کا یہ مخدوم اپنی شناخت ڈھونڈتا مجیب الرحمان شامی کی ماہرانہ چابکدستی میں ینگ پاکستانیز کونشن منعقد کروا بیٹھا۔ سیاست کی وادی پرخار میں یہ معصوم اس قوم سے امیدیں لگائے ہوئے تھا جس کو مدتوں اپنی رہنمائی کے لئے ایسے لوگوں کی تلاش ہی نہ تھی۔ ادھر ملک ایک ایسی جمہوریت کی زد میں تھا جس میں پورا عرصہ بلوچستان پر فوج کشی رہی تھی۔ عطاء اللہ مینگل کی حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے "جمہوری" مزاج پر گراں گزرتی تھی اسی لئے اس خطے کو ہزاروں لاشوں کا تحفہ دیا گیا۔ ادھر جو بھی آواز بلند ہوتی اسے خاموش کر دیا جاتا۔ ڈاکٹر نذیر جیسا شریف النفس شخص‘ خواجہ رفیق جیسا درویش‘ عبدالصمد اچکزئی جیسا سیاسی مجاہد زمین کا رزق ہو گئے۔ جیل صرف جاوید ہاشمی کے لئے ہی عقوبت خانہ نہ تھی، میاں طفیل محمد اور ملک قاسم کی روداد تو لرزا دینے والی تھی۔ انسان کی ایسی تذلیل تو شاید ہی کسی نے دیکھی ہو۔ یہی وہ زمانہ تھا جس کی کوکھ سے 1977ء کی اس تحریک نے جنم لیا جس کے جلوسوں میں جاوید ہاشمی تو تھا ہی اس کے بدترین مخالف اور غلام عباس جیسے پیپلزپارٹی کے وفادار بھی شریک تھے۔ یہی تحریک تھی کہ جس کے بہاؤ میں اعتزاز احسن بھی اپنی وہ پارٹی چھوڑ گئے جس نے انہیں تمام حکومتی مشینری کے استعمال سے گجرات سے ضمنی الیکشن جتوایا تھا۔ قوم ایک امید کے ساتھ نکلی لیکن مارشل لاء کے طویل اندھیروں میں کھو گئی۔ کتنے بڑے بڑے نام تھے جو ضیاء الحق کے وعدۂ خوش کن میں اس کے ساتھ ہو لئے۔ بابائے جمہوریت نوابزدہ نصراللہ سے لے کر طویل جدوجہد کے امین ولی خان تک۔ ادھر بلوچستان کا یہ عالم تھا کہ ضیاء الحق کے دور میں ایسے خاموش ہوا کہ جیسے بھٹو دور کے آرمی ایکشن کے بعد وہاں سکھ کا سانس میسر آیا ہو۔ جاوید ہاشمی انہی خوش فہمیوں کا اسیر ہوا لیکن اس کا ضمیر اسے کہاں چین لینے دیتا تھا۔ اس کے ہاں تو آمریت ظلم تھا اور وہ اس کا ساتھ کیسے دیتا۔ ایک بے چین روح جسے قرار نہیں‘ ایک مضطرب ضمیر جسے سکون نہیں۔ لیکن ایک بات جو اس صوفی منش شخص کو اپنے آباؤاجداد سے وراثت میں ملی وہ اس کی نرم خوئی اور ادب واحترام۔ وہ جمعیت میں تھا تو ان سب کا احترام کرتا جو اس کی تنظیم کے کرتا دھرتا تھے۔ مولانا مودودی سے تو اسے والہانہ قسم کی عقیدت تھی۔ لیکن پھر بھی لوگ اس کی شخصیت سے خائف رہتے۔ اس کی مقبولیت کو خطرہ تصور کرتے‘ اس کی پذیرائی کو وبال جان تصور کرتے۔ وہ چلا گیا لیکن آج تک اس کی زبان سے اپنے پرانے ساتھیوں کے بارے میں ایک لفظ نفرت کا نہ نکل سکا۔ حالانکہ جب وہ چھوڑ رہا تھا تو گز گز بھر کی زبانیں اس کے خلاف زہر اگلتی تھیں۔ ہم نے بنایا‘ ہم نے جیوے جیوے ہاشمی کے نعرے لگا کر اسے ہیرو بنایا۔ ہم جس کو چاہیں ہیرو سے زیرو کر دیں لیکن انہیں شاید اس خدائے واحد و کریم پر یقین نہ تھا کہ ہیرو کو زیرو اور زیرو کو ہیرو تو وہ بناتا ہے۔

اسمبلیوں‘ وزارتوں اور سیاستوں کی بھول بھلیوں میں گھومتا جاوید ہاشمی مجھے کبھی اچھا نہ لگا۔ مجھے کبھی اس پر پیار نہ آیا‘ میں بہت دور ہو گیا تھا‘ بلوچستان‘ جس طرف لوگوں کی نگاہ ہی بہت کم جاتی ہے اور وہ وزیر۔ فاصلے ہی فاصلے۔ لیکن ایک اور امتحان جاوید ہاشمی کا انتظار کر رہا تھا۔ مشرف کا مارشل لاء۔ اب اس کی عمر تشدد برداشت کرنے والی نہ تھی۔ وزارت نے اسے سہل پسند بھی بنا دیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب میں نے سرکاری نوکری کی پروا کئے بغیر کالم لکھنا شروع کئے اور جاوید ہاشمی نے اپنے مرتبے‘ سابقہ حیثیت اور عمر کی پروا کئے بغیر طالب علم سیاسی کارکن کی طرح تشدد برداشت کرنے کی ٹھانی۔ میرا اس سے ایک بار محبت کا رشتہ قائم ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب بڑی سے بڑی سیاسی جماعت کی سب سے اہم مصروفیات سالگرہ کا کیک کاٹ کر تصویریں اخبار میں چھپوانا ہوتی تھی۔ ایسے میں جاوید ہاشمی کی زبان شعلے اگلتی تھی۔ وہ بے ایمان ہوتا تو اس پر کرپشن کا مقدمہ بناتے‘ وہ ساتھ چھوڑنے والا ہوتا تو اسے وزارت دے کر خوش کرتے‘ وہ ضمیر بیچنے والا ہوتا تو اسے دولت سے مالامال کرتے۔ بس ایک مقدمہ باقی رہ گیا تھا، بغاوت۔ اس کی گرفتاری کے بعد اس پر تشدد کی داستان بھی اگر بیان کر دی جائے تو لوگ اپنے آنسو نہ روک سکیں۔ وقت بدلا لیکن جاوید ہاشمی نہ بدل سکا۔ جب سب مشرف سے وزارت کا حلف لے رہے تھے تو وہ اکیلا تن تنہا اس جرم میں شریک نہ تھا۔ بہار تو آ گئی لیکن اس پر میر تقی میر کے اس شعر کی حالت قائم رہی۔

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہو گی

پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہوں گے

فولاد کے ضمیر کا یہ آدمی کانچ کا بنا ہوا ہے‘ یہ جسمانی تشدد تو برداشت کر سکتا ہے لیکن آبرو کی موت اسے کرچی کرچی کر دیتی ہے۔ اس سے لوگ محبت کرتے تھے‘ اس کو پذیرائی ملتی تھی‘ لیکن اس کی پذیرائی کتنے لوگوں کا سکون برباد کر دیتی تھی۔ اس دوران وہ جب بھی ملا میں اس کے چہرے کا دکھ پڑھ تو سکتا تھا لیکن برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اب کی بار اس کا دکھ اسے بستر پر لے گیا‘ وہ ایسا بیمار ہوا کہ اس کی وہ چکا چوند ماند پڑ گئی۔ کانچ کا بت کرچی کرچی ہو گیا لیکن ضمیر کا فولاد زندہ رہا۔ ضمیر کے اس فولاد نے اسے ایک بار پھر کسی اور سمت امیدیں وابستہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس صوفی منش شخص کے لبوں پر گزشتہ تعلق کے حوالے سے کوئی شکوہ گلہ اور شکایت نہیں‘ بلا کا شخص ہے‘ لیکن جس دھرتی پر پیدا ہوا‘ جس سیاست کے کھیل میں اس نے قدم رکھا وہاں رہنما ایسے ہیں جو اپنے گھروں میں کانچ کے ڈیکوریشن پیس سالوں سنبھال کر رکھتے ہیں لیکن کانچ کے آدمی کو کرچی کرچی کر دیتے ہیں

۔

حل کیا ہے (1)

اگر جمہوریت نہیں الیکشن نہیں ‘لوگوں کی رائے نہیں تو پھر تبدیلی کا اور کونسا راستہ ہے۔ روز کبھی کمیونزم کے خلاف لکھتے ہو اور کبھی مغربی جمہوریت کے خلاف ‘راستہ بتاؤ راستہ۔ لوگوں کو الجھا کر رکھا ہوا ہے۔ یہ ایک طرح کے سوال ہیں جو پوچھے جاتے ہیں۔ دوسری جانب پورے یقین کے ساتھ پہلے کچھ فقرے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً کیا جمہوریت کے بغیر کوئی ملک چل سکتا ہے‘ ہمارا ایک آئین ہے‘ جسے ہم نے بڑی محنت سے بنایا ہے‘ ساری سیاسی پارٹیوں کے اس پر دستخط موجود ہیں۔ یہ سب اکائیوں کی متفقہ دستاویز ہے۔ اس سے ماوراء کوئی بھی اقدام ہو گا تو وہ قابل قبول نہیں ہو گا۔ کوئی اس کو نہیں مانے گا۔ اب تو سپریم کورٹ بھی اس اقدام کا دفاع نہیں کرے گی۔ اور اگر فوج نے ہی آنا ہے تو اس کو تو ہم پہلے ہی تین بار آزما چکے ہیں۔ تم ایسی کونسی نئی تبدیلی لانا چاہتے ہو۔ کونسا راستہ ہے تمہارے پاس۔ اسلام کی بات کرتے ہو‘ اسلامی نظام کی بات کرتے ہو‘ اسلامی قوانین کا نفاذ چاہتے ہو‘ تو اس آئین کے تحت جو چاہے کر لو‘ جیت کر آؤ اور جیسا قانون چاہے بنا لو‘ اور ویسے بھی پاکستان میں تو کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف بن ہی نہیں سکتا۔ یہ سب تم لوگوں کے دماغ کی خرابی ہے‘ چار ووٹ نہیں ملتے اور غیر جمہوری راستوں سے برسر اقتدار آکر اس ملک کے عوام کی قسمت سے کھیلنا چاہتے ہو۔ کونسا اور طریقہ ہے صرف جمہوریت کو گالی دے کر تو مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کوئی حل بتاؤ اس سب کا۔

یہ سارے سوال وہ ہیں جو ہر اس شخص کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو سوچتا ہے‘ غور کرتا ہے اور اس دنیا میں انسان پر جو بیت رہی ہے اس پر کڑھتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا نے صدیوں کی مغزماری کے بعد بالآخر ایک نظام وضع کر لیا ہے جس کے ذریعے حکمران منتخب کیے جا سکتے ہیں۔ اب یہی ٹھیک ہے۔ آج سے دو سو سال پہلے کے انسان سے کوئی یہ سوال کرتا کہ بادشاہ کیسے بنتے ہیں‘ حکومت کیسے کرتے ہیں تو اس کے ذہن میں پہلی بات تو یہ آتی کہ بادشاہ کے گھر میں پیدا ہونے سے بندہ بادشاہ بن سکتا ہے۔ پھر وہ سوچتا کہ کبھی کبھی بلکہ کئی دفعہ تو صرف بادشاہ کے گھر میں پیدا ہونا بھی ضروری نہیں۔ جہانگیر بھی تو پیدا ہوا تھا۔ رومانوی شہزادہ، انارکلی کا ہیرو لیکن بادشاہ بننے کے لئے اسے پہلے باپ سے جنگ لڑنا پڑی۔ پھر بھائی کی فوج کو قتل کر کے اس کی آنکھوں میں گرم گرم سلائیں پھروانا پڑیں۔ شاہجہان‘ تاج محل کا خالق‘ شالامار باغ کا مکین لیکن ماں کو تنگ حویلی میں قید کرنا پڑا اور سارے بھائیوں کا سر اڑانا پڑا۔ اشوک‘ انسان دوست بادشاہ‘ جانوروں پر مہربان لیکن اسے بھی ننانوے بھائیوں کو قتل کرنا پڑا اور کلنگہ کی جنگ میں دس لاکھ لوگوں کی لاشوں سے میدان کو بھرنا پڑا۔ آدمی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ صرف بادشاہ کے گھر میں پیدا ہونا ہی اس بات کی ضمانت نہیں کہ آپ بادشاہ بن جائیں بلکہ آپ کو اپنی بادشاہت کے حصول کے لئے ساری زندگی ایڑھیوں پر کھڑے ہو کر گزارنا پڑتی ہے۔ آپ سب سے چھوٹے بھائی ہوں‘ آپ کو والد بالکل پسند نہ کرے بلکہ وہ کسی اور بھائی کو تخت پر بٹھانا چاہے تو آپ کو اورنگ زیب کی طرح سارے بھائیوں کے ساتھ لڑنا بھی اور باپ کو معزول کر کے قید بھی کرنا پڑے گا تب جا کر آپ بادشاہ بنتے ہیں۔ یہ کس قدر جان جوکھوں کا کام ہوتا تھا۔ لیکن اگر اُس دور کے کسی فرد سے پوچھا جاتا کہ بتاؤ بادشاہ کیسے بنتے ہیں تو وہ سیدھا سادا سا جواب دیتا کہ بادشاہ تو وہی بنتا ہے جو بادشاہ کے گھر میں پیدا ہو۔ حکومت حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ وہ تھا جو مختلف مواقع پر تاریخ میں ہر دور میں رائج رہا۔ یعنی کسی نہ کسی طریقے سے ایک مناسب سی فوج جمع کرو‘ سب سے پہلے ایک چھوٹے سے علاقے پر یا شہر پر اپنی حکومت مسلط کرو اور پھر اس چھوٹی سی حکومت کو وسعت دینا شروع کر دو۔ اس کے لئے آپ کے پاس بہت سارے وسائل کی بھی ضرورت نہیں تھی بلکہ صرف توسیع پسندانہ ذہن ہونا چاہیے۔ منگولیا جہاں ڈھنگ سے گھاس بھی نہیں اگتی تھی‘ جو دنیا کے ایسے مقام پر ہے جہاں نہ کوئی سمندر لگتا ہے اور نہ دریا‘ نہ تجارت اور نہ کاروبار‘ کھیتی باڑی بھی ایسی کہ بس اپنا اور گھوڑوں کا گزارا ہو سکے۔ آبادی کے حساب سے دیکھا جائے تو دنیا کی سب سے چھوٹی قوم۔ لیکن چنگیز خان نے جس طرح پوری دنیا کو روندا اور علاقوں پر علاقے فتح کیے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایسے ہی فاتحین کی ایک طویل قطار ہے جو نہ تو کسی بڑی عالمی طاقت کے سربراہ تھے اور نہ ہی وسائل سے مالا مال ملک کے بادشاہ‘ لیکن جب ان پر دنیا فتح کرنے کا جنون چڑھا تو دنیا ان کے پاؤں تلے روندتی چلی گئی۔ ازبکستان کے علاقے کا تیمور ایران اور عظیم ہندوستان پر غالب آیا۔ نادر شاہ کہ جس کی افشار قوم کو شاید ہی کوئی جانتا ہو‘ لیکن اس کی فتح کی نشانیاں اور لوٹ مار کی علامتیں تاریخ کا حصہ ہیں۔ یونان جہاں سے لوگ علم و فن اور فلسفہ کی تاریخ اور جمہوریت کی ابتدا کا درس لیتے ہیں‘ وہاں سے سکندر نکلا تو کسی نے سوچا ہو گا کہ وہ دنیا فتح کرے گا۔ اس لیے اگر اس دور کے افراد کو پوچھا جاتا کہ بتاؤ بادشاہ کیسے بنتے ہیں‘ حکومت کیسے ملتی ہے تو اس کے ذہن میں دو جواب آتے ‘ایک یہ کہ آپ بادشاہ کے گھر میں پیدا ہوں یا پھر کوئی دوسرا بادشاہ اگر پہلے والے کو شکست دے کر تخت پر قبضہ کر لے‘ پھر جو بھی قبضہ کرے اس کا پہلے تو سکہ ملک میں چلنے لگتا اور پھر اس کا نظام ملک میں رائج ہو جاتا۔ یہ تو ابھی کل کی بات ہے۔ انگریز جو دنیا تو ایک طرف یورپ کی آبادی کے لحاظ سے ان تمام ممالک میں ایک چھوٹا ملک ہے۔ سرد موسم‘ وسائل سے محروم‘ علم و ادب‘ فلسفہ‘ طب اور ٹیکنالوجی سے عاری لیکن دنیا فتح کرنے نکلا تو اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ جب اس برطانیہ نے امریکہ‘ کینیڈا سے لے کر آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ تک اپنا اقتدار مستحکم کر لیا‘ اپنی حکومت قائم کر دی تو پھر وہاں اپنا نظام نافذ کر دیا۔ جب نظام ایک طویل عرصے تک نافذ ہو جاتا ہے تو لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو یقین سا ہو جاتا ہے کہ اس کے بغیر مملکت کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔

برصغیر پاک و ہند میں انگریز کی آمد سے قبل کیا کبھی کسی نے سوچا تھا کہ میونسپل کمیٹی بھی ہوتی ہے‘ ٹاؤن کمیٹی سے لیکر لیجسلیٹو اسمبلی تک لوگوں کو ووٹ دینے کی عادت ڈالی گئی اور پھر ان عوامی نمائندوں کو ان کی حدود و قیود سمجھا دی گئیں کہ تم نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ جنگ عظیم میں لڑنے یا نہ لڑنے کا فیصلہ ہم نے کرنا ہے تم نے نہیں‘ تمہارا کام بس فوجی بھرتی کے مراکز کو کامیاب بنانا ہے۔ سڑکیں بنانا ہے‘ پانی فراہم کرنا ہے‘ سکول اور ہسپتال چلانے ہیں لیکن اس جمہوریت کے نافذ کرنے سے پہلے انگریز نے ایک وسیع تر نظام یہاں وضع کر کے نافذ کر دیا تھا۔ تمام قوانین جن میں تعزیرات ہند‘ ضابطہ فوجداری‘ ضابطہ دیوانی اور دیگر تمام قوانین جن میں سب سے اہم معاملات زمین اور لینڈ ریونیو قوانین شامل تھے۔ انہیں نافذ کر کے اور 1773ء سے ایک وسیع سول سروس کا نظام بنا کر ان قوانین کے نفاذ کی مشینری مہیا کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد اس خطے میں محدود اور پھر نسبتاً آزاد جمہوریت نافذ کی گئی۔ جنہیں اس بات کا مکمل یقین ہو چکا تھا کہ ہندوستان کا نظام تعزیرات ہند‘ ضابطہ فوجداری و دیوانی‘ ہائی کورٹ‘ سپریم کورٹ اور سیشن عدالتوں کے بغیر چل ہی نہیں سکتا جو چھوٹی موٹی تبدیلی لانی ہے اسی مروجہ سسٹم میں لانی ہے کیونکہ یہ انسان نے صدیوں کی محنت سے سیکھا اور بنایا ہے۔ قبضہ کر کے جمہوریت نافذ کرنے کا نسخہ آج بھی اسی طرح کارگر ہے۔ پہلے عراق پر قبضہ کرو‘ اس پر اپنا نظام نافذ کرو‘ محکوم لوگوں کی گردن پر تلوار رکھ کر آئین بناؤ اور پھر کہو کہ یہ ایک مقدس دستاویز ہے۔ یہی حال افغانستان کا کیا گیا‘ پہلے قبضہ حاصل کیا گیا‘ پھر آئین نافذ کیا گیا اور پھر کرزئی کا الیکشن۔ دنیا کے کسی ملک میں آج تک یہ پہیہ الٹا نہیں چلا۔

(جاری ہے)

حل کیا ہے (2)

اللہ پر توکل رکھنے والے' پسماندہ' بے آب وگیاہ اور وسائل سے محروم افغانوں کے ہاتھوں روس کی کمیونسٹ بادشاہت کی ذلت آمیز شکست سے پہلے دنیا بھر تو ایک طرف پاکستان کے عظیم اور آج کے دور کے جمہوری اور سیکولر دانشوروں سے اگر کوئی پوچھتا کہ حکومت قائم کرنے کا کون سا طریقہ ہے تو وہ دو طریقے بتاتا۔ ایک کا نام وہ نفرت سے لیتا جسے وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کہتا اور اس کے پشت پناہ امریکہ کو گالیاں دیتا اور دوسرا طریقہ الیکشن۔ کتنے بڑے بڑے نام تھے جو مسائل کا حل حکومت پر بزور قبضہ کر کے فاقہ کش مزدوروں کی آمریت قائم کرنے کے قائل تھے۔ سجاد ظہیر سے لے کر فیض احمد فیض تک اور دادا جی فیروزالدین منصور سے سی آر اسلم اور عابد حسن منٹو تک۔ انجمن ترقی پسند مصنفین میں شاعروں کا ایک قافلہ تھا جو جمہوریت نام کے سرمایہ دارانہ فیشن سے نفرت کرتا اور مزدوروں کے انقلاب کے ترانے گاتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا اس بات کی قائل نہ تھی کہ جمہوریت کے بغیر کوئی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ آدھی سے زیادہ دنیا میں کمیونسٹ حکومتیں قائم ہیں جہاں طویل ترین جدوجہد' پھر لاتعداد انسانوں کے سروں کی فصل کاٹ کر حکومت بنائی گئی اور پھر انہیں آغاز ہی میں مستحکم کرنے کے لئے کروڑوں لوگوں کی گردنیں کاٹ کر معاشرے کو پاک صاف کیا گیا تاکہ صحیح کمیونسٹ نظام نافذ ہو سکے۔ روس کے 1917ء کے بالشویک انقلاب کے پہلے چار سال یعنی 1924ء تک چالیس لاکھ لوگوں کو لینن اور ٹراٹسکی کے حکم سے مختلف طریقوں سے ہلاک کیا گیا جن میں اجتماعی قتل عام بھی شامل تھا۔ انقلاب کے مخالفین کو ہر طرح کی اذیت دے کر قتل کرنا اور پھر مزدوروں کی بادشاہی کے نام پر انہیں صفحہ ہستی سے مٹانا ایک عام دستور تھا۔ میں نے صرف یہاں لینن اور ٹراٹسکی کے زمانے کے قتل عام کا ذکر کیا ہے جس میں 1918ء کی وہ سول وار بھی شامل ہے جسے رد انقلاب کا نام دیا گیا۔ لیکن یہ سب قتل عام اس لیے کیا گیا کہ ایک شفاف حکومت قائم کرنا ہے اور غاصب لوگوں سے اقتدار چھین کر عام آدمی کے حوالے کرنا ہے۔ چین میں ماؤزے تنگ کا لانگ مارچ بھی اپنی خون آشامی کے حساب سے مختلف نہیں تھا۔ اس کے پاس بھی جب ایک خاص تعداد میں لوگ جمع ہو گئے تو وہ اقتدار پر قابض چیانگ کائی شیک اور اس کے گماشتوں کو شکست دینے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ یہ قتل عام صرف اقتدار حاصل کرنے تک ہی جاری نہ رہا بلکہ اس کو مستحکم کرنے کے لئے ایک سماجی انقلاب کے نام سے زمین کا بوجھ لوگوں کو زمین کی تہہ میں اتار دیا گیا۔ لاکھوں تو ایسے لوگ تھے جنہیں نشئی یا افیونچی کہہ کر سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ ماؤ کو بھی اقتدار پر قابض ہونے کے لئے اور قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے کسی جمہوریت یا الیکشن کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ کیوبا' ویت نام' جنوبی کوریا' یوگوسلاویہ' چیکوسلاویکیہ اور درجنوں ایسے ممالک ہیں جہاں اسی طرح اقتدار پر قبضہ کیا گیا اور پھر وہاں کے لوگوں کی ترقی اور خوشحالی کے نعرے کی بنیاد پر اصلاحات کی گئیں اور حکومتیں قائم ہوئیں۔ اقتدار پر قبضہ کبھی ملک کے اندر سے ایک مسلح گروہ کی مدد سے کیا گیا جسے ان کے نزدیک پسماندہ طبقے کی تائید حاصل تھی یا پھر اگر کہیں کسی ملک میں حکومت بن گئی تو اس کی فوج کی مدد حاصل کر کے اپنے ملک میں انقلاب کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ اس کی آخری مثال افغانستان میں 27 اپریل 1978ء کو سوویت روس کی مدد سے کمیونسٹ پارٹی کا اقتدار پر قبضہ کرنا تھا۔ اسے ثور انقلاب کہا جاتا ہے۔ 1917ء سے 1992ء تک 75 سال ایسے ہیں کہ جب آدھی دنیا میں ایسا ہی طریقہ کار رائج تھا کہ کسی بھی طریقے سے اقتدار پر قبضہ کر کے وہاں پر موجود مخالف یا رد انقلاب لوگوں کو قتل کر کے ایک نظام نافذ کر دو۔ ان انقلابات کو لانے اور پھر ان کو مستحکم کرنے میں ایک اندازے کے مطابق 10 کروڑ لوگ مارے گئے۔ ان سب کا قتل دنیا کے ایک خاصے بڑے دانشور طبقے نے عین جائز اور حلال قرار دیا۔ کسی ساحر لدھیانوی' فیض احمد فیض' اختر الایمان یا علی سردار جعفری نے ان کی موت پر نظمیں نہیں لکھیں۔ اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سرمایہ دار' جاگیر دار اور ظالم اشرافیہ اقتدار پر قابض ہیں اور ان سے زمین کو پاک ہونا چاہیے۔ دنیا کی پہلی اجتماعی قبر پولینڈ میں 1939ء میں دریافت ہوئی جو روس کے اس ملک پر قبضہ کر کے مزدوروں کا اقتدار قائم کرنے کے بعد وجود میں آئی تھی۔ دنیا بھر کے ادیبوں' دانشوروں' لکھاریوں اور انسانیت کے علمبرداروں کے نزدیک یہ سارے قتل جائز اور درست تھے' اس لیے کہ یہ سب لوگ اس لیے قتل کئے جاتے تھے تاکہ انسانوں کو ان کے ظلم سے نجات دلا کر غریب کسان اور مزدور کو اقتدار کا بلا شرکت غیرے مالک بنایا جائے۔ یہ سب لوگ جنہوں نے لاکھوں لوگوں کا قتل عام کیا تھا ان کے مجسمے بنائے گئے۔ ان کے بیج سینوں پر لگائے گئے' پوسٹر چھپے اور سٹیکر تقسیم ہوئے۔ میرے ہی ملک میں ماؤزے تنگ اور لینن کے بیج لوگوں کے سینوں پر مدتوں رہے۔ ان سب کے فیصلوں کو انسانیت کی بقا کے فیصلے کہا جاتا تھا۔ غرض اس سارے دور میں کوئی کتنا بڑا ادیب' دانشور یا تجزیہ نگار کیوں نہ ہو' وہ قطعاً اس بات پر یقین نہیں رکھتا تھا کہ دنیا میں حکومت چلانے کے لئے جمہوریت بہت ضروری ہے۔ عوام کی رائے کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ' آئین اور جمہوری اقدار ان کو سرمایہ داروں کی عیاشیاں لگتی تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح جمہوری نظام سے وہی طبقہ برسر اقتدار آتا ہے جو صدیوں سے انسانوں کا خون چوس رہا ہے۔

لیکن 1992ء کے بعد سے ان سب کو ایک خمار چڑھا ہوا ہے۔ جمہوریت' انسانی حقوق' عوام کی رائے اور عوام کی حاکمیت۔ گزشتہ 19 سال جمہوریت کے خمار کے سال ہیں۔ یہ خمار ایسا ہے کہ وہ سارے بڑے بڑے نام جو کبھی زبردستی قبضہ کر کے انقلاب کے قائل تھے ان کے کلام اور خیالات کو مشرف بہ جمہوریت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ سارے بڑے بڑے انقلابی انسانی حقوق کے متحرک علمبردار ہو گئے ہیں اور سارے عظیم دانشور' شاعر' ادیب اسی سرمایہ دارانہ جمہوریت جس کو وہ کبھی گالیاں دیا کرتے تھے اس کے گن گانے لگ گئے۔ پہلے کمیونسٹوں پر الزام لگتا تھا کہ یہ روس اور چین سے مدد لیتے ہیں۔ وہ اپنی محفلوں میں اس کا اقرار بھی کر لیتے تھے کہ انقلاب کے لیے سب جائز ہے لیکن اب تو مدد کو "این جی اوز فنڈنگ" کے نام پر ایک سکہ رائج الوقت بنا دیا گیا ہے۔ یہ سب لوگ کہتے ہیں کہ انقلاب' تبدیلی طاقت سے نہیں بلکہ لوگوں کی رائے اور ان کے ووٹ سے آنی چاہیے۔ ان کے نزدیک فوجی آمریت یا ڈکٹیٹر شپ لعنت ہے۔ اس لیے جمہوری اقدار کو آہستہ آہستہ عوام میں پروان چڑھنا چاہیے۔ چاہے دو سو سال لگ جائیں۔

لیکن ان سب جمہوریت کے علمبرداروں کے پاس ایسے وقت میں اور کوئی حل باقی نہیں رہتا۔ جب کسی ملک میں جمہوری طریقے سے تبدیلی نہ آ رہی ہو یا ان کی مرضی کے انسانی حقوق نہ مل رہے ہوں۔ ایسے میں یہ وہی کرتے ہیں جو چنگیز خان کرتا تھا' ہلاکو کا دستور تھا یا پھر لینن اور ماؤزے تنگ نے کیا۔ یعنی پہلے زبردستی اقتدار پر قبضہ کرو۔ زمین کو اپنی مرضی کے مخالف لوگوں سے پاک کرو اور اپنا نظام نافذ کر دو۔ افغانستان میں ملا عمر کی حکومت تھی۔ تمام جمہوری حوالوں سے وہ ایک عوامی سپورٹ سے اقتدار میں آیا تھا۔ کہا نہیں۔ فوج بھیجو' اقتدار پر قبضہ کرو' مخالفین کا صفایا کرو۔ اپنا آئین بنا کر دو اور نعرہ بلند کرو ہم نے جمہوریت نافذ کر دی۔ یہی حال عراق میں صدام حسین کے ساتھ کیا گیا۔ دس لاکھ لوگ قتل کیے' اپنا آئین نافذ کیا اور کہا جمہوریت نافذ ہو گئی۔ ہمارا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ یہاں پر مرنے والوں کے لئے کوئی دانشور ادیب' شاعر نہیں رویا۔ سب نے کہا کہ یہ جمہوریت کے دشمن' دہشت گرد تھے۔ تاریخ ایک بات ثابت کرتی ہے کہ جب کسی ملک میں ایک گروہ اپنی دھونس' طاقت اور دولت سے ملک پر قابض ہو جائے۔ خواہ وہ غیر جمہوری طریقے سے ہو یا جمہوری طریقے سے تو سب سے پہلے اس گروہ سے ملک کا قبضہ چھڑایا جاتا ہے۔ پلاٹ پر ناجائز قبضہ چھڑانے کے لئے ایس ایچ محلے میں جا کر الیکشن نہیں کراتا کہ کتنے لوگ اس کے حق میں ہیں یا کتنے مخالف۔

(جاری ہے)

حل کیا ہے (3)

پوری دنیا اس وقت ایک ایسے بحران کے دہانے پر کھڑی ہے جہاں گزری تین چار صدیوں میں نافذ نظاموں کے بت ٹوٹ چکے ہیں۔ وہ لوگ جو اشتراکیت یا کمیونزم کی بنیادیں قدیم قبائلی زندگی میں ڈھونڈتے تھے' پھر یونان کے فلسفیوں میں انسان کی مساوات اور محنت کے صلے کی منطقیں دریافت کرتے تھے' جنہوں نے کارل مارکس اور اینگلز کے لکھے ہوئے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں درج اس معاشرے کے خواب دیکھے تھے جس میں جب نجی ملکیت ختم ہو جائے گی تو لوگوں میں جھگڑا اور فساد بھی نہیں رہے گا' جب جھگڑا اور فساد نہیں ہو گا' کوئی بے انصافی نہیں ہو گی تو پھر نہ ریاست کی ضرورت' نہ پولیس کی اور کسی اور محکمے کی۔ لیکن وہ جب اس نظام کو نافذ کرنے لگے تو انہیں یہ ایک ایسا خواب لگا جس کی تعبیر اس دنیا میں تو ممکن نہ تھی۔ یوں انہوں نے مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ کے نام پر آدھی دنیا پر پچھتر سال تک بدترین آمریت کے ذریعے ایک نظام نافذ کیا اور ٹھیک بیس سال پہلے اس کا سورج غروب ہو گیا۔ دوسری جانب مزدوروں کی بادشاہت کے مقابلے میں سرمایہ داروں کا اقتدار آدھی دنیا پر گزشتہ دو سو سال سے قائم ہے۔ اس سرمایہ دارانہ آمریت کا سب سے بڑا فریب جمہوریت ہے۔ لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے انہی میں سے لوگ لے کر آؤ لیکن وہ ان کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتے رہیں۔ سرمایہ کی لذت' مارکیٹوں کی چکا چوند' اخلاقی اصولوں سے ماورا تعیش' کھیل تماشے اور جنسی ہیجان' آگے بڑھنے' دولت کے حصول میں ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے ہوئے لوگ' آرٹ' ادب اور کلچر کے نام پر رنگ و نور میں بجتی' سنورتی' بازار کی زینت عورت اور سب سے بڑھ کر سود جس کی بھول بھلیوں میں بہتے ہوئے لوگ' جن کی ساری متاع حیات کریڈٹ کارڈ یا پلاسٹک منی کے ہاتھ میں گروی رکھی جا چکی ہو۔ معیار زندگی کی دوڑ میں ماں باپ کو اولڈ ایج ہوم بھیجنے والے' شادی کے بندھن کو ایک بوجھ تصور کرنے والے اور زندگی کو لذتوں کے حصول کے لیے تین تین نوکریاں کرتے ہوئے تھکے ہارے لوگ۔ یہ تھا اس نظام کا خلاصہ جس سے تنگ آئے لوگوں نے کتوں کے گلے میں کتبے لٹکائے کہ ہم 99 فیصد ہیں اور ہم پر ایک فیصد سرمایہ دار جمہوریت کے نام پر حکومت کر کے خون چوس رہے ہیں۔ جو عوام کے خادم ہم اسمبلیوں میں بھیجتے ہیں وہ ہمیں اتنا ہی دیتے ہیں کہ ہمارے اشک خشک ہو جائیں اور باقی ہماری محنت سرمایہ دار کی جھولی میں گرا دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں ساڑھے چار سو افراد اتنے امیر ہیں کہ ان کی دولت تقسیم کر دی جائے تو دنیا میں کہیں قحط نہ ہو' کوئی صاف پانی سے محروم نہ رہے اور کسی علاقے کے لوگ بھی تعلیم اور صحت کی سہولیات کا رونا نہ روئیں۔

گزشتہ تین صدیوں میں دونوں نظاموں سے بیزار لوگ ایک ایسی خلا میں ان دنوں سانس لے رہے جہاں کہیں کہیں کوئی آواز بلند ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں نے بھی دنیا پر ایک نظام کی حیثیت سے حکمرانی کی ہے۔ خصوصاً سود کے معاملے میں تو اکثریت یہ نعرے لگاتی نظر آتی ہے کہ مسلمانوں کا غیر سودی نظام آزمایا جائے تاکہ سکھ کا سانس آئے۔

اس عالمی خلاء میں کیا مسلمانوں کا نظام خلافت یا شرعی طرز حکومت واحد حل رہ جاتا ہے۔ یہ سوال دنیا کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ یہ سب سے بڑا موضوع اس لیے ہے کہ اس کے راستے کو روکنے کے لئے جتنے لوگ سرگرم عمل ہیں ان کا ایک فیصد بھی اس کو قائم کرنے کے لئے جدوجہد نہیں کر رہا۔ اس خلاء کے عالم میں اگر پچاس سے زائد مسلمان ملکوں میں سے کسی ایک نے اس نظام کو اصل روح کے ساتھ نافذ کر کے اس کے ثمرات سے دنیا کو آشنا نہ کیا تو شاید اس دنیا کی ذلت تو ہمارا مقدر ہے ہی' آخرت کی جوابدہی سے بھی ہم نہ بچ سکیں گے۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت کا سب سے بڑا ہتھیار میڈیا ہے۔ یہ لوگ نہ تلوار اٹھاتے ہیں اور نہ توپ' بس میڈیا کے ذریعے جسے چاہا جتنا برا بنا کر پیش کر دیا۔ پھر اگر ان کے خون سے ہولی بھی کھیلی جائے تو لوگ تالیاں بجاتے ہیں۔ یہی حال انہوں نے کمیونسٹ حکومتوں سے کیا۔

اس ہتھیار کا پہلا وار خلافت کے نظام پر یہ ہے کہ اگر یہ اتنا ہی کامیاب تھا تو تیس سال چلنے کے بعد ختم کیسے ہو گیا۔ تاریخ اور علم سیاسیات کی اس قدر غلط تفسیر کسی نے نہیں پیش کی۔ کسی بھی نظام یا کسی بھی طرز حکومت میں صرف ایک حکمران کا انتخاب یا اس کے برسر اقتدار' آنے کے طریقے کے علاوہ اس کا معاشی' تعلیمی' سماجی اور قانونی نظام بھی ہوتا ہے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ خلفائے راشدین کا تیس سالہ دور، جو حضرت امام حسنؓ کے امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے' خلفائے راشدین کی طرز پر اسلام کی اصل روح کے تحت حکمران برسر اقتدار نہیں آتے رہے جو نظام کا جزو ہے۔ لیکن کئی صدیوں تک اسلام کے شرعی قوانین اور اسلام کا عدالتی نظام رائج رہا۔ برصغیر میں 1857ء تک اسلامی قوانین اور مسلمان قاضی ہی شریعت کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ خلافت عثمانیہ کے زوال یعنی 1924ء تک یہی عدالتی اور شرعی نظام نافذ العمل رہا اور یہ اس قدر انصاف پر مبنی تھا کہ ان تمام ادوار میں اگرچہ کہ رعایا زیادہ تر غیر مسلم تھی لیکن کسی نے کبھی اس پر عدم اطمینان کا اظہار تک نہ کیا بلکہ جس طرح ہم مسلمان آجکل انگریزی قانون کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اسی طرح غیر مسلم مسلمانوں کے شرعی قوانین کی تعلیم حاصل کرتے اور اس پر کتابیں تحریر کرتے تھے۔ اس کی مثال سلیم الباز ہے جو غیر مسلم تھا لیکن اس نے اسلامی قوانین کی مشہور کتاب ال مجلّہ کی شرح (Commentary) لکھی۔ اسی طرح مسلمانوں نے وہ تمام قوانین تجارت اور قوانین حقوق تک مدون کیے۔ دوسرا اسلام کا محاصل یعنی ٹیکس کا نظام ہوتا ہے۔ جس میں عشر، زکوۃ' جزیہ اور خراج شامل ہوتا ہے' یہ قوانین بھی خلافت عثمانیہ تک نافذ العمل رہے۔ کسی مغربی ٹیکس سسٹم سے کوئی چیز مستعار نہ لی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام ادوار میں کبھی مسلمان یا ان کی حکومتوں میں موجود رعایا نے ٹیکسوں اور بلوں سے تنگ آکر حکومتوں کے خلاف احتجاج بلند نہ کیا۔ ان تمام علاقوں میں خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ پوری سلطنت میں کوئی فقیر نظر نہیں آتا تھا۔ جب کہ اسی دوران فرانس کا بدترین انقلاب آیا تھا جس میں غربت سے تنگ لوگوں نے بادشاہوں کی گردنیں اڑا دی تھیں۔ اس پورے دور میں کسی ٹیکس چوری یا بد دیانت افسر کی مثال نظر نہیں آئی۔ اس لیے کہ مسلمان افسران زکوۃ کو عبادت سمجھ کر اکٹھا کرتے اور امانت سمجھ کر انہی جگہوں پر خرچ کرتے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ رسول اللہ کے زمانے سے لے کر 1918ء تک یہی عدالتی نظام اور یہی معاشی سسٹم نافذ رہا۔

دنیا کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں مسلمان وہ پہلے حکمران تھے جنہوں نے ایک تعلیمی پالیسی دی اور پھر اسے نافذ کیا۔ دنیا بھر کے علم کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور اسے اپنے مدرسوں میں آزادانہ طور پر پڑھایا اور اس پر طویل بحثیں کیں۔ سوال کرنے اور اس کا جواب تلاش کرنے کا پورا حق دیا گیا۔ یہ تمام علوم اسلامی نظام تعلیم کے تحت قائم لاکھوں مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ یہی نظام تعلیم تھا کہ جس کی وجہ سے چار صدیوں تک مسلمان سائنس دانوں' فلسفیوں' تاریخ دانوں اور ماہرین طب کا دنیا کے علوم پر راج رہا۔ جب دنیا اعلیٰ تعلیم کی درس گاہوں کے نام سے آشنا نہ تھی مسلمانوں نے بغداد' دمشق' سکندریہ اور قرطبہ میں یونیورسٹیوں کا ایک نظام قائم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر جیسے علاقے میں بھی 1911ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی شرح خواندگی نوے فیصد سے زیادہ تھی۔ یہ سب اس نظام تعلیم کی بدولت تھا جو اسلام کے اصولوں کے مطابق نافذ رہا۔ ریاست کی ایک اہم چیز اس کی خارجہ پالیسی ہوتی ہے۔ اس تمام دور میں یہ خارجہ پالیسی اسلام اور مسلمانوں کی عزت و وقار کی بنیاد پر ہی مرتب ہوتی رہی۔ کبھی مصلحت' ڈر یا خوف کی وجہ سے سمجھوتے نہیں کیے گئے۔ زندگی کے تمام شعبوں' صحت' تعلیم' وسائل آمد و رفت' قانون' عدالت' ٹیکس اور دیگر معاملات میں اسلام کے قوانین اور اصول نافذ رہے۔ یہ قوانین اسقدر انسانیت کے خیر خواہ تھے کہ اس پورے دور میں کسی عوامی بغاوت' حقوق کی جدوجہد یا انقلاب کی گھن گرج سنائی نہ دی' حالانکہ ان تمام جگہوں پر اکثر علاقوں میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ ہاں اقتدار حاصل کرنے' اس پر قابض ہونے کیلئے لوگ کھڑے ہوتے رہے۔ مسلمان فقیہوں کی قربانی بھی کسی دوسرے نظام کیلئے نہیں تھی بلکہ اسی نظام کو جب وہ بگڑتا دیکھتے تو اٹھ کھڑے ہوتے۔ یہ بات تسلیم کہ خلیفہ کا انتخاب اس طرح نہ رہا جیسا اسلام کا مقصود تھا۔ لیکن باقی نظام نافذ العمل رہا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ آج ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ یہ نظام تیس سال بعد کیوں فیل ہو گیا۔ کوئی مغرب سے یہ سوال نہیں کرتا کہ ان کی حکومت کے تمام عرصے میں جس طریقے سے بھی کلائیو آئے یا ماؤنٹ بیٹن' 1920ء میں عورتوں کو ووٹ کا حق حاصل ہو یا سوئٹزر لینڈ میں 1973ء میں' قوانین یا دیگر نظام قائم رہے تو یہ نظام کامیاب اور ہمارے ہاں صرف حکمران کا طرز انتخاب بدلے تو ہم ناکام۔

(جاری ہے)

حل کیا ہے (آخری قسط)

مدتوں اس امت مسلمہ کو افیون کی طرح یہ درس گھول گھول کر پلایا گیا کہ تم ترقی کی راہ میں بہت پیچھے رہ گئے ہو‘ دوسری قومیں تم سے کس قدر سرفراز ہو گئی ہیں‘ انہوں نے سائنس میں ترقی کی‘ علم میں آگے بڑھے‘ دنیا کو ایجادات سے ایک خوبصورت اور رہنے کی جگہ بنایا۔ جمہوریت‘ انصاف اور انسانی حقوق کا پرچم بلند کیا۔ اپنے آپ کو مذہب سے آزاد کر کے دنیا میں چین اور سکھ کے ساتھ جینے کا راستہ نکالا۔ تم ایک دقیانوسی اور ماضی کے مزاروں کو پوجنے والی قوم ہو۔ تمہارے آباؤ اجداد نے مقبرے‘ مزار اور مسجدیں بنانے کے سوا کیا ہی کیا ہے۔ یہ لوگ اپنی پر تعیش زندگی گزار کر چلے گئے اور تم کو جہالت کے اندھیروں میں پھینک گئے۔ آج بھی تمہیں ماضی کے خواب دکھانے والے چودہ سو سال پرانی طرز معاشرت میں نافذ سادہ سے قوانین کو موجودہ ترقی یافتہ معاشرے میں نافذ کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ بے وقوف ہیں یہ لوگ، دنیا کتنی ترقی کر چکی ہے۔ قانون کی ضخیم کتابیں آج انسانی زندگی کے ہر معاملے پر ایک جامع قانون بنانے کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ اس دور کے مسائل اور تھے‘ آج تو ٹیکنالوجی‘ ماحولیات‘ سمندری حیات‘ آسمانی راستے‘ ادویات بنانے اور تحقیق کے اصولوں تک قانون مرتب ہوتے ہیں۔ ان سب میں کہاں کہاں اسلام کو لا کر کھڑا کرو گے۔ یہ سب تو موجودہ دور کی پیداوار ہیں۔ ”رولز آف گیم“ ہی اور ہیں۔ سادہ سی زندگی میں تمہارے اسلاف کے قانون ٹھیک تھے مگر اب دنیا بہت آگے نکل چکی ہے لیکن اصل معاملہ یہ ہے کہ جیسے تم لوگ خود جاہل ہو‘ اسی طرح تمہیں مدتوں پرانی جاہلیت کے زمانے کی باتیں ہی پسند آتی ہیں۔

اس افیون کی لت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم اپنی تمام تر زندگی میں کسی بھی کام کا آغاز کرنے یا کسی تحقیق میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس بات کے قائل ہو جاتے ہیں کہ اس دنیا کو ترقی مغرب نے دی اور اسے تہذیب کا گہوارہ اس نے بنایا اور آج کا نظام اسقدر پیچیدہ ہو چکا ہے کہ اسلام کے پاس تو اس کا کوئی حل ہو ہی نہیں سکتا۔ اپنے بچپن سے لے کر آج تک میں ایک فقرہ سنتا آیا ہوں کہ آج کے اقتصادی نظام میں اسلام کہاں نافذ ہوتا ہے‘ اس دنیا نے ایک بینکنگ کا پیچیدہ نظام وضع کیا ہے‘ کرنسی‘ شرح مبادلہ اور اقتصادیات کی ایک پوری سائنس بنائی ہے‘ ڈالر اور دیگر کرنسیوں کی شرح کیسے اوپر اور نیچے ہوتی ہے۔ اجناس کی شرح اور ان کی قیمتوں کا تعین کیسے کیا جاتا ہے۔ یہ سارے کے سارے گورکھ دھندے ہیں ان کا اسلام کے پاس کیا حل ہے۔ مدتوں ہم نے یہ دعوے سنے اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے کہ ہم نے کبھی اس بات پر کامل یقین ہی نہیں کیا کہ اللہ نے اپنی کتاب میں جو ان گورکھ دھندوں کا آسان ترین حل بتایا ہے وہی اس دنیا کی فلاح کا باعث ہے۔ ہم مرعوب تھے‘ ہم اپنے آپ کو جاہل نکمے اور ناکارہ سمجھتے تھے‘ اپنے علم کو ناقص ہی خیال کرتے تھے لیکن ہم نے اپنی کم علمی اور مرعوبیت کی وجہ سے اللہ کے احکامات کو بھی ناقابل عمل‘ فرسودہ اور دقیانوسی خیال کرنا شروع کر دیا۔ لیکن جب میرے رب نے سچ کو واضح کرنا ہوتا ہے‘ جب اس نے اپنے پیغام کی حقانیت کو دنیا پر آشکار کرنا ہوتا ہے تو پھر اسے چند لمحے لگتے ہیں‘ نہ کسی تقریر و تحریر کی ضرورت اور نہ خطبہ وارشاد کی۔ آج کی دنیا اس سارے معاشیاتی گورکھ دھندے کی اہلیت سے ایسے آشنا ہوئی کہ لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لوگ حیران رہ گئے کہ یہ سارا گورکھ دھندا تو بنایا گیا تھا۔ یہ ساری معیشت صرف ایک چیز کے تحفظ کے گرد گھومتی تھی اور وہ تھا سود۔ اس سود کے نظام کو تحفظ دینے اور بقا بخشنے کے لئے کرنسی کی شرح کا چکر چلایا گیا۔ سونے کی جگہ کاغذ کے نوٹ جاری ہوئے اور پھر ان کاغذ کے نوٹوں کو کبھی زرعی اجناس کے مقابل رکھ کر قیمت لگائی گئی‘ کبھی سونے کے اور آج کی دنیا میں تو دنیا کی مضبوط ترین کرنسی پٹرول کے متبادل اپنی شرح نمو بنانے کی جدوجہد میں دنیا کے پٹرول کے ذخیرے پر قابض ہونے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ اس سارے معاشی چکر میں لوگوں کو اس بات کا یقین دلا دیا جاتا ہے کہ آج جو ایک لاکھ روپیہ وہ بچاتے ہیں‘ دس سال بعد اس کی حیثیت دس ہزار سے بھی کم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے آدمی کو بنک میں پیسے رکھنے چاہئیں تاکہ اسے سود ملتا رہے اور اس کی قیمت کی قدر کم نہ ہو۔ یوں سود کے جس سسٹم کے گرد معاشرے کو گھمایا گیا اس کا نتیجہ آج پوری دنیا کے عوام نے یوں دیکھا کہ لاکھوں گھر اجڑے اور کروڑوں لوگ برباد ہو گئے۔ یوں اسلام کا وہ سادہ سا اصول کہ سود کا کاروبار کرنے والے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا اعلان کرتے ہیں آج چودہ سو سال بعد اسی طرح سچا اور کھرا ثابت ہوا جس طرح مدینہ کی چھوٹی سی شہری ریاست میں تھا۔ اس ایک اصول کی بنیاد پر آج دنیا بھر کی گورکھ دھندوں والی معیشت لوٹ رہی ہے اور دنیا بھر کے معیشت دان کرنسی کے عذاب سے نکلنے کے لیے سونے اور چاندی کے سکوں کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اسلام نے وہ سادہ سے اصول وضع کیے جو آج بھی معاشرتی‘ معاشی‘ اخلاقی اور ریاستی قوانین کی بنیاد ہیں۔ انصاف کی بالادستی‘ عہد و پیمان کی اہمیت‘ ناپ تول میں کھرا پن‘ منافع کی کم سے کم شرح‘ معاشرے کے پسماندہ طبقوں کی مدد اور ریاستی ذمہ داری‘ اخلاقی بے راہ روی روکنے کے لئے حدود کا تعین‘ معاشرے سے قتل و غارت ختم کرنے کے لئے قصاص اور معاشرے میں صلح جوئی روا رکھنے کے لئے معاف کرنے کا اجر اور دیت۔ سب سے اہم ترین اصول یہ کہ تمام زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ جو شخص زمین کاشت کرتا ہے فصل اس کی ہے۔ اگر کوئی زمین تین سال تک کاشت نہیں ہوتی تو ریاست کی ملکیت ہو جاتی ہیں۔ پانی‘ چراہ گاہیں اور آگ پر کوئی قیمت وصول نہیں کی جا سکتی۔ یہ عوام کی فلاح کے لئے ہے۔ اب آگ میں بجلی اور گیس سب آتے ہیں۔ معدنیات اللہ کا عطیہ ہیں اور پوری امت کی ملکیت ہیں۔ کوئی ہیرے‘ سونے یا قیمتی دھاتوں سے ذاتی طور پر امیر نہیں بن سکتا۔ یہ سب اصول آج سے چودہ سو سال پہلے اللہ کے رسول ﷺ نے واضح کر دیئے‘ جن سے نہ جاگیرداری رہتی ہے اور نہ سرمایہ داری۔ اس سب کے علاوہ ایک اور چیز جو دنیا کے تمام نظاموں سے اس کو الگ کرتی ہے‘ وہ آخرت کی جوابدہی کا احساس ہے۔ اس سے بہتر اور کیا اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی ہو گی کہ موصل کا حاکم عمر ابن خطاب کو بعد میں اور اللہ کو پہلے جواب دہ ہے اور اس کے ہر عمل کو دیکھنے کے لئے ایک قاضی مقرر ہے جو دیکھتا ہے کہ یہ اپنے تمام کام اللہ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق کر رہا ہے کہ نہیں۔ اسی لیے وہاں کسی سیکرٹریٹ یا بیوروکریسی کی ضرورت نہ تھی۔

یہ سب کیسے نافذ ہو گا‘ کون کرے گا‘ آج کے دور میں یہ کیسے ممکن ہے۔ آج کے دور کے طرز انتخاب میں اگر اگلے دو سو سال بھی لگے رہیں تو اسلام کا منشاء مقصود حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس لیے کہ یہ جمہوری نظام چند طبقات کے تحفظ کے لیے پیدا کیا گیا جو اسے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ تبدیلی اور انقلاب جمہوریت کی ضد ہے۔ غنڈوں کا قبضہ کسی شہر پر اس شہر کے سرمایہ دار اپنی دولت کے بل بوتے پر کروا دیں تو پہلے وہ قبضہ چھڑوانا ضروری ہے۔ قبضہ چھڑوا لیا تو پھر۔ یہاں پر وہ سب سے بڑا خلا ہے جو پوری مسلم امت میں نظر آتا ہے۔ امریکہ میں 1300 تھنک ٹینک ہیں جو پالیسیاں بناتے ہیں‘ قانون کی تدوین کرتے ہیں‘ تبدیلی کے مطابق چیزیں بہتر بنانے کے لیے لائحہ عمل بناتے ہیں۔ مسلم امہ میں نظریاتی سطح پر بہت کچھ لکھا جا چکا۔ اب ضرورت ہے ایک ایسے تھنک ٹینک کی جو محنت کے ساتھ مسلم امہ کے آئین کا خاکہ تیار کرے‘ معاشی نظام‘ بنک کے طریق کار‘ ضابطہ فوجداری اور دیوانی سے لے کر ایک ایک قانون کو شق وار مرتب کرے۔ جس میں سب ماہرین اس امت کے اہم دماغوں کی سربراہی میں یہ سب کام سرانجام دیں۔ تاکہ اگر ایک دفعہ کسی ریاست سے غنڈوں کا قبضہ چھڑوا لیا جائے تو یہ سب نافذ کرنے کے لیے ایک لمحے کی بھی دیر نہ ہو۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس

کبھی کبھی مجھے دنیا بھر کے میڈیا کی خوفناک کامیابی پر حیرت ہونے لگتی ہے' جب ساری زندگی مسجد کی چٹائیوں پر بیٹھ کر قرآن پاک کے ترجمے اور تفسیر کا علم حاصل کرنے والا' رسول ﷺ کی احادیث کا بغور مطالعہ کرنے والا' پھر مدتوں اپنی چٹائیوں پر بیٹھے شاگردوں کو قرآن وحدیث کا درس دینے والا عالم دین اپنی شرعی شکل وشباہت اور وضع قطع کے ساتھ ٹی وی کے کیمروں کے سامنے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ میری پارٹی کی ساری جدوجہد جمہوریت کی بقا اور اس کی سلامتی سے عبارت ہے۔ مجھ اس وقت میڈیا کے جادو کا یقین سا ہونے لگتا ہے کہ جب ایک مغربی طرز تعلیم سے آراستہ لیکن ساتھ ہی دینی علوم سے آشنا اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا علمبردار ایک مذہبی رہنما اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس ملک میں ہم جس انقلاب کے داعی ہیں وہ جمہوری راستے سے آئے گا ۔ہم آئین اور قانون کی پاسداری اور جمہوری اقدار کے فروغ کے لئے کام کر رہے ہیں۔ کتنے سادہ ہیں یہ انقلاب کے دعوے دار اور اللہ کے دین کی سربلندی کا دعویٰ کرنے والے۔ انہیں کس قدر یقین ہے کہ وہ جمہوریت جو دنیا کے مہذب ترین ممالک میں دولت مند اور سرمایہ دار مافیا کے ہاتھوں میں غلام ہے' جہاں آج جمہوریت کے ڈیڑھ سو سالہ زخم خوردہ معاشرے میں لوگ اس استحصال کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے ہیں اور ان کا ایک ہی نعرہ ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ جمہوریت ننانوے فیصد عوام پر ایک فیصد سرمایہ داروں کی بدترین آمریت ہے۔ ایسے سسٹم اور ایسے انتخابی نظام میں یہ انقلاب کے دیوانے اور اسلامی شریعت کے علمبردار دوسو سال بھی سرگرم عمل رہیں تو ناکام ہی لوٹیں گے۔ اس لیے کہ جمہوریت کے خمیر میں انقلاب کی مٹی ہی نہیں۔ انقلاب تو آمریت اور جمہوریت دونوں کی ضد ہوتا ہے۔ انقلاب تو ایک ریلا ہے' ایک طوفان ہوتا ہے جو لٹیروں کو بہا کر لے جاتا ہے' خواہ ایک آمر ہو یا چار سو پارلیمنٹیرین کی آمریت۔

پوری دنیا میں جمہوریت کا سفر دوسو سال سے زیادہ کا نہیں۔ اس سے پہلے دنیا پر بادشاہ حکومت کیا کرتے تھے۔ یہ سارے بادشاہ اپنی حکومت کے لیے ایک خاص طبقے کے مرہون منت ہوتے تھے جو ان کے لیے پیادہ اور گھڑسوار سپاہی فراہم کرتا اور ان کی جنگوں اور معرکوں کے اخراجات اٹھاتا تھا۔ یہ طبقہ پہلے جاگیردار تھا اور پھر صنعتی انقلاب کے بعد سرمایہ دار۔ یہ جب اپنے سرمایہ کے زور پر کرایہ دار افواج کے ذریعے کسی ایک شخص کو تخت پر بٹھا دیتے تو پھر عام آدمی کو جی بھر کر لوٹتے۔ اس کے خون پسینے کی کمائی سے اپنے محل بھی تعمیر کرتے اور محبوب بیوی کی قبر پر تاج محل بھی۔ روم کے پر تعیش درباروں سے لے کر فرانس کے سونے میں جڑے ہوئے ورسائی محل تک اور چین کے شہر ممنوعہ (FORBIDDENCITY) سے اصفہان کے چہل ستون تک ان بادشاہوں اور ان کے ساتھیوں کے محلات نظر آتے ہیں جو عام آدمی کی دولت سے تعمیر ہوئے۔ لیکن تین سو سال قبل جب اس پسے ہوئے عام آدمی نے انگڑائی لینا شروع کی' چہروں پر غصہ اور زبان میں نفرت آئی تو اس کا پہلا مظاہرہ فرانس کا انقلاب تھا جس نے صرف بادشاہ کا سر ہی نہیں' ان سب لوگوں کی گردنیں بھی کاٹ کر رکھ دیں جو اس ظلم وجبر اور استحصال کے ساتھی تھے۔ اب اس طبقے نے حکومت تو کرنا تھی۔ اس کے پاس سرمایہ بھی تھا۔ لیکن اب لوگوں کو بندوقوں اور سپاہیوں سے زیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس بیدار قوم کو کیسے فتح کیا جائے۔ یوں جمہوریت کا ایک خوبصورت جال بچھایا گیا جس میں ایک آمر' ڈکٹیٹر اور فرعون کی آمریت کو چار سو منتخب نمائندوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان کو گروہوں اور پارٹیوں میں منظم کیا گیا۔ پہلے بہت سے سرمایہ دار اور جاگیردار مل کر ایک بادشاہ کی مالی اور افرادی مدد فراہم کرتے تھے۔ اب بہت سے سرمایہ دار اور جاگیردار مل کر ایک پارٹی کی مالی مدد اور مادی وسائل فراہم کرنے لگے تاکہ جب بھی وہ برسر اقتدار آئے تو ان کے شکنجے میں جکڑی رہے۔ جہاں ضروری سمجھا گیا پارٹیوں کو دولت کے انبار سے نوازا گیا تاکہ جو بھی برسر اقتدار آئے ان کے قابو میں رہے۔ اسمبلی کے ممبران کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں' پارٹی مفاد سرمایہ دار کے ہاتھ میں۔ امریکہ کا صدر خواہ موچی کا بیٹا ہو لیکن جیتنے کے لئے کئی ارب ڈالر کا محتاج ہو جو اسے سرمایہ دار مل کر ادا کریں اور پھر وہ صرف اور صرف ان کے مفادات کا تحفظ کرے۔

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت امریکہ میں گزشتہ الیکشن میں اوباما نے ایک ارب ڈالر اپنے الیکشن پر خرچ کیا اور اس کے مدمقابل کے بھی اتنا ہی خرچ کیا' جبکہ تمام چھوٹے موٹے سینٹ وغیرہ کے الیکشن ملا کر ساڑھے پانچ ارب ڈالر امیدواروں نے خرچ کیے جو انہیں کارپوریٹ کلچر کے عوام کا خون چوسنے والوں نے فراہم کیے۔ اگلے الیکشن کے لیے دونوں جانب سے چھ ارب ڈالر جمع کرنے کی حد رکھی گئی ہے۔ دنیا کی قدیم جمہوریت برطانیہ میں الیکشن کمیشن نے ایک امیدوار کو چھ لاکھ پونڈ تک خرچ کرنے کی اجازت دی ہے۔ سرکاری گوشواری کے مطابق پارٹیوں نے فی کس اشتہارات پر دس لاکھ پونڈ' رہائش پر 3 لاکھ پونڈ' جلسوں پر 2 لاکھ پونڈ' ٹرانسپورٹ پر دو لاکھ پونڈ اور دیگر اخراجات پر 180 لاکھ پونڈ خرچ کیے۔ اس کے علاوہ وہاں مختلف گروہ' ادارے اور میڈیا ہاؤس ہیں جو پارٹیوں کی مدد کرتے ہیں' انہوں نے 300 لاکھ پونڈ خرچ کیے۔ فرانس نے گزشتہ صدارتی الیکشن میں پہلے مرحلے میں امیدواروں نے 17 ملین یورو فی کس خرچ کیے اور دوسرے مرحلے میں 21 ملین یورو۔ بھارت کے الیکشن میں امیدوار ہر دفعہ 4 ارب ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ یہ ان تمام اخراجات کے علاوہ ہیں جو مختلف سرمایہ دار کمپنیاں مختلف اشتہارات' ٹی وی شوز' سپانسر اور جہازوں کے ٹکٹ اور گاڑیوں کی صورت میں خرچ کرتی ہیں' جو ان اخراجات کا حصہ نہیں ہوتے۔ ان الیکشنوں کے بعد عوام کے نمائندے یوں تو لہراتے ہوئے جیت کر آتے ہیں اور پھر اگر ایک کمپنی یونی کول کا ٹھیکہ طالبان قبول نہیں کرتے تو جمہوریت کے یہ آزاد ارکان سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس ملک پر چڑھ دوڑتے ہیں اور اپنے ہم وطنوں کی لاشیں اٹھاتے ہیں۔ لیکن کمال ہے اس جمہوریت اور اس کے کامیاب ہتھیار میڈیا کا کہ اسے عوام کا فیصلہ کہا جاتا ہے کیا خوب لفظ ایجاد کیا گیا ہے' پارلیمنٹ میں Publicwill (عوام کی آواز) بولتی ہے۔ یہ پارلیمنٹ ایک بدمعاش' چور' اچکے' بددیانت کو لوگوں کو لوٹنے دے' چھینی سے عوام کا خون چوسنے کا اختیار دے' عام آدمی کی دولت سے دنیا بھر میں جائیدادیں خریدنے کا سرٹیفکیٹ دے دے۔ کیا مضحکہ خیز بات ہے کہ یہ سولہ کروڑ عوام کی رائے ہے۔ یہ ان کا فیصلہ ہے۔ یہ ہے ایک فرعون کا اختیار جو چار سو لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اب یہ طبقہ بھی بہت ہوشیار ہو گیا ہے۔ انہیں پتہ ہے لوگ ایک فرعون کا چہرہ زیادہ دیر دیکھنا نہیں چاہتے۔ اس لیے چار سال یا پانچ سال بعد بدل دو' جب دو سے اکتا جائیں تو تیسرا لے آؤ' کیا کرے گا ۔ہمارے سرمائے پر پلا ہے' ہمارے میڈیا نے اسے ہیرو بنایا ہے۔ ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں۔ یہ میاؤں آج تک کسی نے نہیں کرنے دی۔

پچاس کی دہائی میں رینڈ کارپوریشن نے ایک رپورٹ مرتب کی تھی کہ اللہ کی شریعت' خلافت اور مسلمانوں کی بالادستی کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کی مذہبی پارٹیوں کو مغربی جمہوری نظام کا حصہ بنا دو' ان کے انقلاب کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی۔ میرے دین کے سادہ لوح رہنما جانتے ہیں کہ اسلام غلبے کا قائل ہے۔ غلبہ کیا ہوتا ہے۔ ایک گاؤں میں پانچ سو لوگ رہتے ہیں لیکن پانچ بدمعاشوں کا غلبہ ہوتا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان پانچ بدمعاشوں کے غلبے کو ختم کر کے اس کے قانون کا غلبہ قائم کیا جائے۔ اور یہ اس جمہوری نظام میں دوسو سال تک ناممکن ہے۔ اقبال نے اپنے ظریفانہ کلام میں کہا تھا۔

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب

یہ دستور گزشتہ پچاس سال سے اس مملکت میں چلا آرہا ہے کہ محرم کی آمد سے قبل انتظامیہ تمام مکاتیب فکر کے علماء کو جمع کرتی ہے۔ ہر شہر میں ایک بڑی میز کے اردگرد یہ سارے رہنما جبہ و دستار کے ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں۔ امن وامان' بھائی چارے اور اتحاد کی باتیں کی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے کے عقائد کے احترام کے دعوے ہوتے ہیں۔ انتظامیہ کا سربراہ ان کا شکریہ ادا کرتا ہے اور انہیں امن وامان قائم رکھنے کیلئے تعاون پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ سب کے سب یقین دہانی کروا کر اپنے اپنے مدرسوں' مسجدوں' حجروں کی جانب لوٹ جاتے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے ایسے اتحاد قائم کروانے والے اجلاس ربیع الاول کی آمد' کسی بڑے صوفی بزرگ کے سالانہ عرس کی تقریبات سے پہلے بھی منعقد ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ اس لیے کہ وہ فرقہ واریت یا مذہبی تقسیم جس نے اسلامی معاشرے کو تقسیم کر رکھا تھا جو پہلے کبھی اکادکا جان لیتی تھی، اب اس کا شکار کئی سو نہیں بلکہ کئی ہزار لوگ ہوتے جارہے ہیں۔ نشانہ باندھ کر ایک دوسرے کا قتل ہو یا بم دھماکہ' یہ سب اس یقین پر کیا جاتا ہے کہ مارنے والا ایک نیک کام سرانجام دے رہا ہے اور مرنے والا یقیناً جہنم واصل ہوگا۔ آپ ان بڑی بڑی میٹنگوں میں علماء کی گفتگو سنیں تو ایسے لگے گا جیسے دنیا میں ایک دوسرے کا احترام کرنے والا کوئی ان سے بڑھ کر نہیں ہے۔ ٹیلی ویژن آنے کے بعد سے ان لوگوں کو آپ کسی بھی ٹاک شو میں دیکھ لیں۔ سیاسی لیڈر تو آپ کو روز لڑتے اور ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتے دکھائی دیں گے لیکن یہ علماء اتحاد کو وقت کی ضرورت بتاتے اور مسلمانوں کو متحد کرنے کے غم میں گھلے جارہے ہوں گے۔ اگر یہ سب کے سب اتنے شیریں سخن ہیں۔ ان کے سینے ایک دوسرے کے بغض اور تعصب سے اس قدر پاک ہیں تو پھر یہ قتل وغارت کون کررہا ہے۔ لوگوں کی لاشیں تو برابر گررہی ہیں۔ ہر فرقے میں کہیں نہ کہیں اسلحہ بردار شدت پسند ضرور نظر آئیں گے' جبکہ ان سب کے عظیم مذہبی پیشوا اعلان کرتے پھریں گے کہ ہم تشدد کی مذمت کرتے ہیں۔ ہم انسانی جان کا احترام کرتے ہیں۔ ہم فتنہ وفساد پھیلانے والے پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن آپ ان سب کے مخصوص خیالات اور اپنے مسلک اور فرقہ کے دفاع میں کی جانے والی تقریریں سنیں جواب تو یوٹیوب پر وافر تعداد میں میسر ہیں تو آپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ ہر مکتبہ فکر کا آدمی جو اپنے مسلک کے مدرسے سے تعلیم حاصل کرکے مسند پر بیٹھتا ہے وہ اگر بالکل اپنے ماننے والے گروہ میں ہوگا تو دوسرے مسلک کے بارے میں اس کی زبان آگ اگل رہی ہوتی ہے لیکن اگر ذرا ماحول مختلف ہو اور اس میں دوسرے لوگ بھی ہوں تو ہر مولوی' عالم' ذاکر اس طرح بات شروع کرے گا، "ہم سب کا احترام کرتے ہیں' ہر کسی کو اپنے عقیدے کی پیروی کا حق ہے' ہم کسی کے دشمن نہیں لیکن دوستو! حق بات تو کہنی چاہیے" اور پھر کبھی ذو معنی فقروں سے اور کبھی تاریخ کے حوالوں سے اسلام کی ایک ایسی تفسیر پیش کی جاتی ہے کہ بس تیل تو چھڑک دیا' آگ دکھانے کی دیر ہے۔ لیکن اس میں اصل دکھ کی بات ہے کہ یہ سب کے سب قرآن کی آیات کا سہارا لیتے ہیں اور ان کے مقلدین آنکھیں بند کرکے ان کے ترجمے اور تعبیر پر یقین کرکے دوسرے کو کافر بھی سمجھ لیتے ہیں' ان سے نفرت بھی کرنے لگتے ہیں اور موقع ملے تو انہیں قتل بھی کردیتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے۔ کیا کبھی کسی نے غور کیا۔ ہم فرقہ بندی کی اس وباء کا کیوں شکار ہیں۔ اور ہر کسی کو اپنے فرقے کے حق اور دوسرے کے خلاف قرآن کی آیات کیسے مل جاتی ہیں۔ اس میں قرآن کا قصور نہیں۔ اس لیے کہ ہم نے قرآن کو اس طرح پڑھا ہی نہیں جیسا ایک عام کتاب کا بھی حق ہوتا ہے۔ ایک پنجابی اگر اپنے کسی سندھی' بلوچی یا پٹھان بھائی کو ہیر وارث شاہ سنائے اور پھر اس کا ترجمہ کرکے یا مفہوم کرکے بتائے تو آخر میں یہ ضرور کہے گا کہ یار میں تمہیں صحیح طرح نہیں بتا سکا کیوں اصل مزا اور لطف تو پنجابی میں آتا ہے۔ تم سمجھ ہی نہیں سکتے جب تک تمہیں پنجابی نہ آئے۔ اسی طرح اگر کوئی پشتون رحمٰن بابا کے اشعار یا کوئی سندھی شاہ لطیف کے بیت سنانے لگے اور پھر آدھ گھنٹہ بھی اس کی تفسیر کرتا رہے' یہی کہے گا بس یوں سمجھو میں نے کافی حد تک سمجھا دیا' ورنہ اصل مزا تو پشتو اور سندھی میں ہی ہے۔ سائنس کی کتابیں پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ہزاروں ایسی الجھنیں ختم ہوجاتی ہیں اگر انہیں وہ زبان یعنی انگریزی آتی ہو جس میں یہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ قانون کے طالب ہزاروں ایسی لاطینی زبان کی اصلاحات استعمال کرتے ہیں جن کا وہ عام طور پر ترجمہ نہیں کرپاتے' لمبے لمبے فقروں سے اس کا مفہوم بتاتے ہیں۔ اسی لیے مدتوں برطانیہ میں قانون لاطینی زبان میں پڑھایا جاتا رہا لیکن آپ وکیل ہوں یا جج اگر آپ نے اس زبان میں قانون پڑھا ہے تو آپ کے سامنے اگر Resjudicata بولا جائے گا یا MutatisMutandi کہا جائے گا تو اسے کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ہمارا عالم یہ ہے کہ جس دن ہمارے گھر میں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہم اس کے بارے میں خواب دیکھنا شروع کرتے ہیں کہ اسے ڈاکٹر بنائیں گے یا انجینئر' وکیل یا اعلیٰ افسر۔ پھر ہم خواہ پنجابی بولتے ہیں' سندھی' بلوچی یا پشتو' ہم پلاننگ کریں گے کہ اسے ایسے مدرسے میں ڈالا جائے جہاں انگریزی سیکھ جائے تاکہ اگر اس نے ایف ایس سی میں سائنس پڑھ کر ڈاکٹر انجینئر بننا ہے تو اسے انگریزی کی کتابیں سمجھنے میں دقت نہ ہو' اس نے سول سروس کا امتحان دینا ہے' اس نے باہر ملک جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہے۔ اسے انگریزی پڑھا دو تاکہ علم کو براہ راست سمجھ سکے۔ یہ صرف علم کی بات نہیں کینیڈا یا آسٹریلیا وغیرہ کی شہریت حاصل کرنے کے لئے ہر ہفتے میرے ملک کے ہزاروں لوگ انگریزی زبان کا ٹیسٹ دیتے ہیں تاکہ وہاں جاکر رزق کما سکیں۔ جس کو شاعری' افسانہ نگاری سے شغف ہوتا ہے وہ غالب' فیض یا اقبال کو پڑھنے کے لئے اپنی اردو کو بہتر بناتا رہتا ہے۔ آپ کو کتنے ایسے دیوانے نظر آئیں گے جو فرانسیسی، ہسپانوی اور جرمن زبان میں اس شوق میں داخلہ لیتے ہیں کہ اگر ان ملکوں میں سیر کے لئے جانا پڑے تو کوئی دقت نہ ہو۔

لیکن واحد چیز اللہ کی وہ الہامی کتاب ہے' قرآن حکیم کہ جس کا جو ترجمہ اور جو تفسیر ہمیں منبر پر بیٹھا مولوی یا ذاکر بتا دیتا ہے، ہم ایمان لے آتے ہیں۔ وارث شاہ' بلھے شاہ یا شاہ لطیف کے کلام کے بارے میں تو ہم کہتے ہیں اصل سمجھ پنجابی یا سندھی میں آئے گی لیکن قرآن حکیم کے بارے میں بس ایک فقرہ بول کر بات ختم کردی جاتی ہے' اتنے ترجمے موجود ہیں اصل عربی سمجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم بھٹکتے ہیں اور روزانہ ایک دوسرے کی لاشیں اٹھاتے ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی زبان چھ ماہ سے ایک سال کے درمیان سیکھی جاسکتی ہے۔ ہم قرآن کو سمجھنے کے لئے چھ ماہ یا ایک سال بھی صرف نہیں کرتے۔ اگر ہمارے نصاب تعلیم میں پہلے روز سے اسی طرح عربی لازم ہو اور قرآن پڑھایا جائے جیسے سائنس، فلسفہ اور قانون پڑھنے کے لئے انگریزی لازم ہے تو پھر اس ملک کے ہر بچے کو قرآن کے معانی ومفاہیم سمجھنے کے لیے کسی مولوی یا ذاکر کی تقریر کی ضرورت نہ ہوگی۔ اسے خود پتہ ہوگا توحید کیا ہے' رسالت کا کیا مقام ہے' قرآن صحابہ کے بارے میں کیا کہتا ہے اور اہل بیت کا کیا مقام ہے۔ اسے شرک اور بدعت کی تعریف سمجھانی نہیں پڑے گی' اسے اولیا اللہ کے بارے میں بتانا نہیں پڑے گا۔ وہ قرآن کی آیات کا ویسا ہی لطف لے گا جیسے وہ اپنی زبان میں کسی شاعر کی شاعری پڑھتے ہوئے لیتا ہے۔ یہ سب صرف دس سال کے عرصے میں اس ملک میں کیا جاسکتا ہے۔ نہ کسی کو خطیب کی ضرورت رہے گی اور نہ نماز پڑھانے کے لئے امام کی۔ ہر کوئی خود نماز پڑھا سکے گا اور خود قرآن کا مفہوم سمجھا سکے گا۔ فرقہ بندی اور قتل وغارت کا اور کوئی حل نہیں۔ ورنہ پھر ہر سال محرم اور ربیع الاول میں علماء کے اجلاس ہوں گے' اتحاد بین المسلمین کی باتیں ہوں گی اور ساتھ ساتھ لاشیں بھی گرتی رہیں گی۔ اس لیے کہ ہم ان سے مرض کی دوا مانگتے ہیں جو خود مرض کی وجہ ہیں۔

آخری معرکہ خیر وشر

سلالہ چیک پوسٹ پر نیٹو کا حملہ اور پاکستانی فوج کے سپوتوں کی شہادت' حسین حقانی کا میمو' منصور اعجاز کا راز فاش کرنا' کیا یہ سب بس اچانک بے ترتیب سے واقعات ہیں' جنہیں ہر کوئی اپنے مفادات کے حق میں یا دوسرے کی حیثیت کو کمزور کرنے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ کیا دو مئی کو اسامہ بن لادن کی شہادت اور اس کے بعد میڈیا پر گونجنے والی گھن گرج ایک فوری جذباتی اشتعال تھا جسے کچھ عرصے بعد مقتدر قوتوں نے کنٹرول کر لیا۔ روز ایسے واقعات ہوتے ہیں' ٹی وی چینلوں پر میدان سجتے ہیں' اخبارات کے صفحات کالے ہوتے ہیں' پارلیمنٹ میں دھواں دھار تقریریں اور سڑکوں پر مظاہرے کئے جاتے ہیں۔ ایک معاملہ دم توڑتا ہے اور دوسری گرم بازاری شروع ہو جاتی ہے۔ میرے ملک میں اکثر دو طرح کے تبصرہ نگار اور دانشور پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو ان سب کے پیچھے ایک گہری سازش ڈھونڈ نکالتے ہیں اور پھر واقعات کی ترتیب کو ایسے جوڑتے ہیں کہ ایک خوبصورت' دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی سب کو حیران کر دیتی ہے۔ جس دانشور اور تجزیہ نگار کا جو ہدف ہوتا ہے وہ کہانی اس ہدف کے ارد گرد لا کر ختم کرتا ہے۔ کوئی امریکہ کی گہری چال بتاتا ہے تو کوئی اسٹیبلشمنٹ کا شاخسانہ' کسی کو اس میں حکومت کا خود ساختہ بحران نظر آتا ہے اور کوئی اپوزیشن کا شور و غوغا قرار دیتا ہے۔ دوسرے تجزیہ نگار وہ ہیں جو ان واقعات کو ایک معمول کی بات خیال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جیسا واقعہ ہوا ہے ویسا ہی رد عمل ظاہر کرو اور جس نے کیا ہے اس پر لعنت ملامت کر دو یا اسے شاباش دے دو۔ یہ لوگ یا تو کہانی بننے کے فن سے نابلد ہوتے ہیں یا پھر انہیں ہر واقعے میں سازش ڈھونڈنے میں لطف نہیں آتا۔ لیکن گہری سازش کے تانے بانے جوڑنے والے اپنے مخصوص نظریات کی وجہ سے یا پھر کسی خاص لابی کے زیر اثر واقعات کو اسی پس منظر میں پیش کرتے ہیں جیسا وہ چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان سب واقعات کے پس منظر میں کبھی پاکستان کی امریکہ سے وعدہ خلافی نظر آئے گی تو کبھی افغانستان پر کنٹرول کے پیچھے وسط ایشیا کی ریاستوں کی معدنی دولت اور تیل و گیس کے ذخائر۔ کسی تجزیے میں ہندوستان کے عزائم ہوں گے اور کسی میں دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کا جنون۔ کبھی کسی تجزیہ نگار نے واقعات کو اس بڑے پس منظر میں دیکھنے کی شاید ہی کوشش کی ہو کہ یہ سب آفتیں' مصیبتیں اور جنگیں مسلم دنیا میں کیوں برپا ہوتی جا رہی ہیں اور اس پوری مسلم دنیا میں پاکستان کی کیا جغرافیائی' سیاسی اور جنگی اہمیت ہے۔

سلالہ پوسٹ پر حملے سے کچھ روز پہلے امریکہ کی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن نے فارن پالیسی میگزین میں ایک پالیسی مضمون تحریر کیا جس میں امریکہ کے آئندہ دس سال کے نئے میدان جنگ کا تعین کر دیا ہے۔ اس کے مطابق عراق میں انہوں نے مقاصد حاصل کر لیے ہیں اور افغانستان میں بوریا بستر لپیٹنے کا وقت آ پہنچا ہے۔ امریکہ نے جو کرنا تھا کر لیا۔ اب اگلا میدان مشرق بعید ہے جس میں برما سے لے کر جاپان تک کے ممالک شامل ہیں اور معاشی طور پر مضبوط ملک انڈونیشیا اور ملائشیا بھی ہیں جو مسلمان ہیں اور ان میں دہشت گردی کے جراثیم جڑ پکڑ رہے ہیں ۔ ہلیری کلنٹن مشرق بعید کا نقشہ بھارت سے شروع کرتی ہے اور امریکہ کے مغربی ساحلوں تک لے کر جاتی ہے ۔ اس پورے خطے کو ایشیا پیسفک کہا جاتا ہے۔ اس خطے کی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہاں پر بسنے والے مسلمان دیو بندی' بریلوی' اہل حدیث وغیرہ جیسی فرقہ بندی سے پاک ہیں۔ وہ صرف اور صرف مسلمان ہیں۔ خواہ وہ بنگلہ دیش کا مسلمان ہو یا انڈونیشیا' برما' ملائشیا' برونائی' فلپائن یا تھائی لینڈ کا' وہاں شیعہ سنی تفریق تک نہیں ہے۔ یہ ایسی خطرناک صورت حال ہے کہ اگر کبھی اس خطے میں بیداری کی لہر دوڑی تو پھر کسی پالتو تجزیہ نگار یا سیاسی رہنما کو یہ سوال کرنے کی جرات نہیں ہو سکے گی کہ کونسا اسلام نافذ کریں' بریلوی' دیوبندی' شیعہ یا اہل حدیث۔ وہاں کے مسلمان ان تمام بحثوں سے ناآشنا ہیں۔ ہلیری کلنٹن نے امریکی پالیسی سازوں کے اگلے دس سالہ اہداف کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ تمام ممالک سمندروں کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اس لیے امریکہ کو اس بڑے سمندر میں ایک بڑی پیسفک طاقت کی حیثیت سے قدم جمانا ہے۔ امریکہ میں بہت سے لوگ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم بیرونی دنیا میں اپنا کردار ختم کر کے واپس لوٹ آئیں کیونکہ ہمارے معاشی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ایسے لوگ ہمیشہ سے رہے ہیں اور یہ گمراہ لوگ ہیں انہیں اندازہ نہیں کہ امریکہ کی طاقت کا راز امریکہ کے لئے نئی تجارتی منڈیاں پیدا کرنا' دنیا میں دیگر ممالک کے ایٹمی پروگرام کو ختم کرنا اور سمندری راستوں کو اپنی طاقت کی وجہ سے محفوظ بنانے میں پوشیدہ ہے۔ ہلیری کلنٹن نے کہا ہے کہ ہم نے گزشتہ ساٹھ سالوں میں ان "HOMECOME" گھر واپس آؤ کہنے والی امریکی عوام کا مقابلہ کیا ہے اور ہم آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

اگلے دس سالوں میں امریکہ کے اہداف کو ان کی دیگر پالیسیوں کے پس منظر میں دیکھا جائے تو پوری تصویر کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ امریکی پالیسی ساز مسلم امہ کو تین مختلف علاقائی وحدتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک شمالی افریقہ سے لے کر عرب دنیا تک جس میں تیونس' لیبیا' مصر اور عرب ممالک شامل ہیں' دوسرا پاکستان' افغانستان' روسی ریاستیں یعنی ترکمانستان' تاجکستان ازبکستان وغیرہ اور ایران اور تیسرا مشرق بعید کے انڈونیشیا' ملائشیا اور برونئی۔ عرب اور شمالی افریقہ میں اسرائیل اور امریکی وفادار عرب ریاستیں موجود ہیں۔ عراق پر قبضے اور اس قبضے کو مستحکم کروانے کے لئے اندرون خانہ ایران کی مدد نے وہاں طاقت کا توازن قائم کیا ہے اور موجودہ شیعہ سنی اختلاف جو خلیجی ریاستوں میں موجود ہے وہ کسی طور پر ایک مستحکم خلافت قائم نہیں ہونے دے گا۔ دوسرے علاقے میں افغانستان کی تباہی اور بربادی کے بعد وہاں مدتوں ایک پائیدار حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ پورا ریجن جو ترکی سے شروع ہوتا ہے اور بوسنیا سے ہوتا ہوا پاکستان تک پہنچتا ہے اس میں کوئی ایسی سمندری گزرگاہ نہیں اور نہ ہی کوئی معاشی طاقت جو امریکہ کے لئے مسئلہ ہو۔ اس لیے یہاں بدحال مسلمان ممالک اور غربت سے لڑتے ہوئے لوگ ہی ٹھیک ہیں۔ یہاں فرقہ بندی بھی بہت ہے اور قومیتوں کو بھی ابھار کر مسلم امہ کو تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تیسرا علاقہ جس میں چین ایک بہت بڑی طاقت بن کر ابھر چکا ہے اور اگر ایسے ہی چلتا رہا تو وہ ان تجارتی شاہراہوں پر بھی کنٹرول حاصل کر سکتا ہے۔ امریکی پالیسی ساز ادارے اس سارے پس منظر میں ایک یقین کیے بیٹھے ہیں کہ مسلمانوں میں اس قدر قومیتوں کے جھگڑے ہم نے شروع کروا دیئے ہیں' اتنی فرقہ بندیاں ہیں کہ یہ کبھی بھی اجتماعی طاقت کے طور پر ایک خلافت پر جمع نہیں ہو سکتے۔ لیکن دوسرا خوف ابھی بھی سوار ہے کہ اگر یہ علاقائی طور پر ہی متحد ہو گئے تو طوفان اٹھ سکتا ہے۔ اسی کو امریکہ کی اگلی پالیسی دستاویز جسے وہ "اگلے سو سال" کہتے ہیں' اس میں ان علاقائی مسلم حکومتوں کو بھی پسماندہ اور غیر محفوظ رکھنا شامل ہے۔

اس تناظر میں حسین حقانی اور منصور اعجاز کا میمو دیکھئے۔ جب تک بھارت پاکستان کی طرف سے بے خطر نہیں ہو جاتا وہ ایک بنیادی کردار ادا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے اسے پسندیدہ ملک قرار دینے' کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی بجائے بھول جانے اور پھر پاکستان کی عسکری طاقت کو عوام کے سامنے ذلت و رسوائی سے ہمکنار کرنے میں عافیت ہے لیکن ایک مسئلہ جو تمام امریکی پالیسی سازوں کی نیندیں اڑائے ہوئے ہے وہ یہ کہ پاکستان کے پاس سو سے زیادہ ایٹم بم ہیں جب تک اس طاقت کو بزور ختم نہیں کیا جاتا اگلے سو سال کی حکمت عملی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ اگلے سو سال کیا ہیں۔ یہ رسول ﷺ کے ارشادات کے مطابق آخری معرکوں کے سال ہیں۔ دجال کی آمد کے لئے اس کی ہم رکاب طاقتیں تیاریاں مکمل کر رہی ہیں۔ لیکن دوسری جانب وہ جنہوں نے اس کا مقابلہ کرنا ہے وہ بھی غافل نہیں۔ ایک دوسرا سٹیج بھی تیار ہو رہا ہے۔ امام مہدی کے قافلہ برداروں کا۔ یہ مملکت جس میں ہم رہتے ہیں یہ اس کا گریژن ہے۔ اسی لیے اسے کوئی اور ترقی اللہ نے عطا نہیں کی صرف ایٹمی قوت بنایا کیونکہ گریژن میں ٹی وی' فرج نہیں رکھے جاتے ہتھیار رکھے جاتے ہیں۔ معرکہ خیر و شر کے اسی آخری مرحلے میں خلافت کا قیام پاکستان اور افغانستان میں ہو گا۔ یہ ایک مشترک گریژن ہے جہاں سے جب کالے جھنڈے نکلیں گے تو میرے آقا کے بقول انہیں بیت المقدس تک کوئی روک نہیں سکے گا۔

نیست ممکن جزبہ قرآن زی ستن

جس قدر ناپائیدار انسانی عقل اور مشاہدے سے جنم لینے والے سائنسی علوم ہیں اور وہ جس طرح روز بروز اپنے قاعدے اور کلیے بدلتے ہیں' دنیا میں اور کوئی چیز اتنا نہیں بدلتی' نہ اخلاق نہ اقدار اور نہ روایات۔ سچ بولنا' صحیح تولنا' وعدے کی پاسداری کرنا' انصاف سے کام لینا اور اسی طرح اور بہت سے ایسے اصول ہزاروں سال سے یکساں چلے آرہے ہیں۔ کسی محقق' فلسفی یا سائنسدان نے تحقیق کے بعد یہ اصول وضع نہیں کیا کہ جھوٹ بولنا یا دھوکہ دینا اقدار میں شامل کر دیا جائے۔ لیکن سائنس کے علوم ہیں کہ ہر لمحہ ایک نئے مشاہدے کے بعد مکمل طور پر بدل دیئے جاتے ہیں۔ آج سے صرف پچاس سال پہلے تک فزکس کی دنیا پر نیوٹن اور اس کے ساتھیوں کے علوم کا راج تھا۔ اس کے قوانین حرکت کو سچائی کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا بلکہ اس کا تیسرا قانون حرکت ''ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے'' ہماری سماجی' معاشرتی اور سیاسی زندگی کا محاورہ بن گیا تھا۔ ڈالٹن کا نظریہ جس کے مطابق مادہ ناقابل تباہی اجزاء ایٹم کا مجموعہ ہے اور ایٹم کو نہ توڑا جا سکتا ہے اور نہ تباہ کیا جا سکتا' مدتوں سائنس کا اٹل اصول ثابت ہوتا رہا۔ فزکس کی دنیا میں اس دور میں آسمان اور زمین کے درمیان ایک پردے کا وجود بھی مانا جاتا تھا جسے ایتھر کہتے تھے۔ سائنس دانوں نے اس ایتھر کی وجہ سے روشنی کی رفتار طے کی' حرارت ناپنے کے پیمانے بنائے۔ یہ تمام سائنسی علوم دو سو سال تک نصاب میں لوگ پڑھتے رہے اور انہیں ایسے سچ مانتے رہے جیسے کوئی الہامی فرمان ہو۔ اچانک ایک شخص سائنس کے دروازے پر دستک دیتا ہے جس کا نام آئن سٹائن ہے اور وہ ان تمام نظریات کو باطل قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تم دو سو سال تک لوگوں کو جہالت اور جھوٹ پڑھاتے رہے ہو۔ جس ایتھر کی بنیاد پر تم نے روشنی اور حرارت کے پیمانے بنا رکھے ہیں وہ تو وجود ہی نہیں رکھتا۔ اس سب کے باوجود' روز اپنا موقف بدلتی سائنس کے باوصف آپ کسی بھی شخص یا طالب علم سے بات کریں تو اسے ان علوم کی بنیادی تعلیم اور نظریات پر کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ جتنی دیر بچے نیوٹن اور کاپرنیکس کو پڑھتے رہے وہ اس پر ایمان کی حد تک یقین رکھتے اور جو آج آئن سٹائن کو پڑھ رہے ہیں انہیں اس پر مکمل ایمان ہے۔ انہیں کوئی شک نہیں کی ایٹم کو توڑا بھی جا سکتا ہے اور اس سے توانائی بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔

نہ اس علم کے بارے میں کسی پڑھانے والے کے درمیان کوئی اختلاف ہوتا ہے اور نہ ہی پڑھنے والے بچے کے نزدیک کوئی دوسری رائے پھٹکنے پاتی ہے۔ جتنی دیر تک یہ سائنسی نظریات جھٹلائے نہیں جاتے سب کے سب اسے ایک حقیقت مانتے ہیں اور کئی نسلوں تک مانتے رہتے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے عالم بھی توجیہات پر اختلاف رکھتے ہیں لیکن کسی سائنسی نظریے کی اصل اور اساس کو نہیں جھٹلاتے جب تک وہ غلط ثابت نہ ہو جائے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ وہ جو ازلی اور ابدی سچائی کا ماخذ ہے' جو اللہ کا کلام ہے' جو قرآن کی صورت نازل ہوا ہے' اس کی تعلیمات پر آپ کو اختلاف کرنے والے گلی گلی اور شہر در شہر مل جائیں گے۔ یہ اختلاف کرنے والے اس قدر سخت جان ہوتے ہیں کہ دوسرے کی جان لینے سے بھی نہیں ٹلتے۔ ایک دوسرے سے اس قدر شدید نفرت کرتے ہیں کہ ان کی شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ ایسا کیوں ہے۔ ہم سے کہاں غلطی ہوئی۔ ہم کس مقام پر بھٹک گئے۔ امت مسلمہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو ایک حیرت انگیز انکشاف ہوگا۔ آپ سوچتے رہ جائیں گے یہ سب اس وقت رونما ہونا شروع ہوا جب اس امت کے لوگوں نے اس نور ہدایت کے اصل ماخذ قرآن کو پڑھنا اور سمجھنا چھوڑ دیا۔ اور وہ ذمہ داری جو قرآن ہر مسلمان پر عائد کرتا ہے کہ اس پر غور و فکر کروا سے مسجد میں بیٹھے مولوی تک محدود کر دیا کہ وہ پڑھے اور پھر جو اس کی سمجھ میں آئے اسے آگے بتا دے۔ جب کہ دیگر دنیاوی علوم کی جدوجہد میں ہم نے اپنی نسلوں کو اصل ماخذ اور اصل اصولوں تک رسائی دی۔ ہم جو آج فقہی اختلاف اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں' حنفی' مالکی' شافعی' حنبلی اور جعفری کہلاتے ہیں ان میں فقہوں کے بانیوں کا کوئی قصور نہیں۔ وہ اسے اپنی رائے سمجھتے تھے اور اگر کوئی اور دوسری رائے رکھتا تو اس کا احترام کرتے تھے۔ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے جب امام مالک کی کتاب موطاء امام مالک کو پوری مملکت میں بطور اسلامی قانون نافذ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے فرمایا کہ آپ کو اس کا کوئی اختیار نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے صحابہ کرام کی جو جماعتیں دوسرے علاقوں میں گئی ہیں ان کے پاس رسول ﷺ کی اور احادیث موجود ہوں اور وہ قرآن کی تعبیر مختلف کر رہے ہوں۔ یہی وجہ ہے ان چاروں آئمہ نے کبھی کسی ایک مسلک کو دوسرے پر فوقیت نہ دی اور نہ دوسرے ماننے والے کو کافر گردانا۔ اس لیے کہ ان کے زمانے اور بہت بعد کے زمانے تک لوگوں قرآن پر غور کرتے اور سمجھتے تھے کہ یہ سب اختلاف معمولی اور فروعی ہے لیکن پھر جب اس امت نے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی ذمہ داری صرف ایک طبقے اور مولوی کو دے دی اور خود اس سے علیحدہ ہو گئے تو سب سے تکلیف دہ بات یہ ہوئی کہ خانہ کعبہ میں جہاں پوری امت کو متحد نظر آنا چاہیے تھا وہاں کئی سو سال تک چار حصے تھے اور ہر کوئی اپنے مسلک کے امام کے پیچھے نماز پڑھتا تھا۔ مصلیٰ حنفی رکن عراق کے پاس' مصلیٰ شافعی مقام ابراہیم کے سامنے' مصلیٰ مالکی رکن شامی کی جانب اور اس کے تھوڑے فاصلے پر مصلیٰ حنبلی تھا۔ اسی طرح مسجد نبوی میں پانچواں مصلیٰ فقہ جعفریہ کا بھی تھا۔ خانہ کعبہ میں ان جگہوں پر پختہ عمارتیں تعمیر تھیں اور امت کے اختلاف کا تماشہ عین اللہ کے گھر میں نظر آتا تھا۔ امت کے اس اختلاف کو شاہ فیصل مرحوم نے اپنی ان تھک کوشش سے 1386 ہجری یعنی 1965ء میں ختم کروا کر سب کو ایک امام کے پیچھے نماز پڑھنے پر متفق کروایا۔ دوسرا بڑا موڑ اس وقت آیا جب انقلاب ایران کے بانی امام خمینی نے اہل تشیع کو کسی بھی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کو جائز ہونے کا فتویٰ جاری کیا اور آج حرم کعبہ اور حرم مسجد نبوی میں یہ نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب بھی میرے ہی ملک کے کچھ اختلاف امت پر شادیانے بجانے والے علماء وہاں الگ نماز پڑھتے ہیں اور اللہ نے انہیں حرم کی اجتماعی نمازوں سے محروم رکھا ہوا ہے۔

حرم کعبہ اور مصلیٰ رسول کے قریب نمازوں کے دوران امت تو ایک نظر آنے لگ گئی لیکن اختلاف اس کی جڑوں میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ یہ ہاتھ باندھنے اور کھلا چھوڑنے پر لڑتی ہے' پاؤں کو دھونے یا مسح کرنے پر جھگڑتی ہے اور آمین بلند آواز سے کہنے اور نہ کہنے پر دست و گریبان ہو جاتی ہے۔ گزشتہ دنوں حج پر جاتے ہوئے جب میں نے حج پر لکھی جانے والی درجنوں کتابوں کا مطالعہ کیا تو حیران رہ گیا کہ ان میں بال ٹوٹنے' مچھر مارنے' منہ پر احرام لگنے پر کیا کفارہ ہے اور کون کون سے دم واجب ہوتے ہیں' سب تفصیل سے بتایا ہے لیکن اس مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع کی اصل روح اور مقاصد کے بارے میں صرف چند سطریں نظر آتی ہیں۔ حج کے دوران میں جس بھی یورپی یا امریکی نو مسلم سے ملا اُسے خالصتاً مسلمان پایا' ہر فقہ سے بالاتر۔ اس لیے کہ انہوں نے اس الہامی پیغام کے ماخذ قرآن کو اسی غور و فکر سے خود پڑھا ہے جس کا وہ سب ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے۔ ہمارا اختلاف' ہماری فرقہ بندی ہمارے درمیان قتل و غارت نہ کسی قانون سے ختم ہو سکتا ہے اور نہ علماء کے اتحاد بین المسلمین کے لمبے لمبے اجلاسوں سے۔ اس کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ ہے کہ جس طرح ہم بچوں کو فزکس' کیمسٹری اور سائنس کو دنیا کی کامیابی کے لئے محنت اور تگ و دو سے پڑھاتے ہیں' ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں' اصل ماخذ تک رسائی دیتے ہیں، ویسے ہی ایک ٹیوشن' ایک نصاب' ایک کورس اس الہامی پیغام قرآن پاک کی تعلیم کا بھی ہو۔ آپ قرآن تک رسائی دے دیں اس کو اسی لگن سے بچوں کو پڑھائیں جیسے دیگر علوم پڑھائے جاتے ہیں پھر آپ دیکھیں گے اس امت میں نہ شیعہ رہے گا نہ سنی' نہ دیوبندی رہے گا نہ بریلوی۔ اقبال نے کہا تھا۔

گر تو می خواہی مسلمان زی ستن

نیست ممکن جزبہ قرآن زی ستن

(اگر تو چاہتا ہے کہ مسلمان کی طرح زندگی گزارے تو یہ قرآن کے بغیر ممکن ہی نہیں)

اللہ مدد کو نہیں آئے گا

پچیس سال بلوچستان میں گزارنے کے بعد جب میں واپس پنجاب کی سرزمین پر لوٹ رہا تھاتو طرح طرح کے خدشات ذہن میں ابھرتے تھے۔یوں تو میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی بیس سال یہیں گزارے تھے لیکن اس دھرتی میں عام آدمی کی عزت نفس کے ساتھ ہر روز جو کھیل کھیلا جاتا ہے اس کے مناظر ذہن پر نقش تھے۔ سرکاری دفتروں میں ہاتھ باندھے ہوئے کانپتے ہوئے درخواست گزار۔وہ جو سائل ہوتے ہیں لیکن افسر کے سامنے ان کی گھگی بندھی ہوتی ہے۔درخواست پکڑاتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپ رہے ہوتے ہیں اور ایک انجانا خوف ان کے بدن پہ طاری ہوتا ہے۔انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ تو پہلے سے لٹے پٹے یہاں آئے ہیں۔کچھ مانگنے آئے ہیں خواہ انصاف کی بھیک ہی کیوں نہ ہو۔اب مانگنے والوں سے کوئی کیا چھین سکتا ہے۔ لیکن ایک متاع تو ان سے چھنی جاسکتی تھی۔وہ ہے عزت نفس۔کوئی ان کی درخواست منہ پہ دے مارے ،گھنٹی بجائے گارڈ اور چپراسی کو بلا کر دھکے مارتے ہوئے اسے دفتر سے باہر نکال دے۔اسی لیے یہ درخواست گزار آہستہ آہستہ بولتے ہیں۔چہرے سے بار بار پسینہ صاف کرتے ہیں۔خشک حلق کو تھوک نگل نگل کر تر کرتے ہیں۔افسر کے سوالات کا جواب زیادہ سے زیادہ ہاں یا ناں میں دیتے ہیں۔میں نے یہ مناظر اوائل عمر میں چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے دفاتر میں دیکھے ہیں۔اس علاقے میں سڑکوں ،چوراہوں اور دکانوں پر بھی عام آدمی کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک روا رکھا جارہا ہوتا ہے۔کسی غریب آدمی کی سائیکل اگر کسی گاڑی والے سے ٹکرا جائے تو وہ غصے میں ابلتا ہوا باہر نکلتا ہے۔گاڑی کی جانب دیکھتا ہے اور آگ بگولہ ہوتا ہوا اس سائیکل والے کی پٹائی شروع کر دیتا ہے۔تانگے والا ،ریڑھی والا یا گدھا گاڑی والا اگر کسی چوراہے یا سڑک پر کسی پولیس والے کی زد میں آجائے تو اسے اس کے چھانٹے ہی سے مار مار کر لہولہان کر دیا جاتا ہے۔آپ کسی بھی ناکے یا ٹریفک سگنل پر کھڑے ہو جائیں۔آپ کو پولیس کی خونخوار نظروں کے سامنے کاغذات دکھاتے یا تو موٹر سائیکل والے ملیں گے یا پھر پرائی بوسیدہ کاروں والے۔تھانوں ،پٹوار خانوں اور عدالتوں میں تذلیل کا عالم میرے بچپن کی تلخ یادوں میں سے ایک ہے۔

انہی خدشات میں ڈوبا جب میں بلوچستان سے آج سے صرف چند سال قبل پنجاب کی جانب روانہ تھا تو راستے میں ایک مقام پر ٹھہرا۔صبح جب اس ڈپٹی کمشنر صاحب کے دفتر میں ملاقات کے لئے گیا تو چند ایک ماتحت افسران اپنے گزشتہ دن کی کارکردگی بتا رہے تھے۔یوں تو کارکردگی مناسب تھی اور میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اگر شاباش نہیں تو کم از کم انہیں آرام سے جانے ضرور دیا جائے گا۔لیکن ایک پٹواری کی رپورٹ پر ڈپٹی کمشنر صاحب کا پارہ چڑھا ،فائل اٹھا کر دور پھینکی گئی ،مغلظات سے بھرپور گفتگو شروع ہوئی ،پٹواری سر جھکائے سنتا رہا اور پھر صاحب کے دفع ہو جاؤ کہنے کے بعد یہ فائل اٹھا کر باہر نکل گیا۔اس کے بعد صاحب نے اسی غصے میں کہا ،تم سب بھی نکل جاؤ ،حرام خور ،کام چور۔جانے کے بعد میں نے سوال کیا۔تم نے ایسا کیوں کیا۔صاحب نے سکڑتے ہوئے کہا ،تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔میں اگر ان کو روز گالیوں کی زد میں نہ رکھوں ،ان کی بے عزتی نہ کروں تو یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔کام نہیں کرتے ،یہ ہیں ہی اس قابل۔یہ پنجاب کا سرحدی ضلع تھا اور ابھی مجھے لاہور تک سفر کرنا تھا۔لیکن اس واقعے کے بعد مجھ پر ایک راز کھلا کہ اس علاقے میں عام آدمی کے ساتھ جو ناروا سلوک ہوتا ہے۔اس کی تھانے ،پٹوار خانے یا سرکاری دفاتر میں جو عزت نیلام ہوتی ہے وہ ایک تسلسل ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ سطح سے ہوتا ہوا نیچے تک پہنچتا ہے۔میرے لئے یہ نیا تجربہ اس لئے تھا کہ میں نے یہاں سرکاری اہلکاروں کے ہاتھوں عام آدمی کی ذلت تو دیکھی تھی لیکن چونکہ سرکاری نوکری بلوچستان میں رہی اس لیے سرکاری اہل کاروں کی سرکاری افسران کے ہاتھوں ذلت ورسوائی کا کبھی مشاہدہ نہیں ہوا تھا۔بلوچستان کی قبائلی سرزمین پر تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔گالی تو دور کی بات ہے اگر آپ کسی شخص کو وہ عزت نہیں دیتے جس کا وہ مستحق ہے تو پھر جواب میں وہ بھی آپ کی عزت نہیں کرے گا۔لیکن پنجاب اور سندھ کے جاگیردارانہ نظام میں انسان کی عزت وتکریم کا جو حشر ہوتا ہے وہ ہمارے گاؤں کے کمیوں اور ہاریوں سے لے کر اعلیٰ ترین عہدیداروں تک سب کے ساتھ یکساں ہے۔

سات سال یہاں ملازمت کے دوران میں نے ایسے ایسے منظر دیکھے ہیں کہ خوف سے کانپ گیا ہوں۔کلرک کی سیکشن آفیسر کے ہاتھوں ،سیکشن آفیسر کی ڈپٹی سیکرٹری کی زبانی اور ڈپٹی سیکرٹری کی سیکرٹری کے دفتر میں یوں عزت نیلام ہوتی ہے کہ ساتھ بیٹھے لوگ بھی دیکھتے ہیں۔پولیس کے سپاہی سے لے کر صوبے کے اعلیٰ ترین سربراہ تک یہ معاملہ ایسے ہی چلتا ہے۔کانپتے ہوئے ماتحت اور گرجتے ہوئے افسران ،فائلیں منہ پر مارتے ہوئے ،مغلظات سے بھری گفتگو کرتے ہوئے۔اس بات تک کا دھیان نہیں کیا جاتا کہ جس کی بے عزتی کی جارہی ہے اس کی عمر شاید افسر کے والد کے برابر ہو۔وہ سفید بال جن کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے ان کی حیا آتی ہے۔ہمیں ان سفید بالوں کی بھی شرم نہیں آئی۔میں نے ان سفید بالوں والوں کو اس سارے مرحلے کے بعد تنہائی میں روتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ سب اس وقت اور زور پکڑتا ہے جب عزتوں کی نیلامی کا کھیل بڑے سے بڑی میز کے اردگرد برپا ہو جائے۔ بڑے بڑے افسران ،دم سادھے ،سانس روکے ،ایک بڑی سی میز کے اردگرد بیٹھے اپنے سامنے کسی اعلیٰ ترین شخصیت کے ہاتھوں اپنے کسی ساتھی کی عزت نیلام ہوتے ہوئے دیکھتے رہیں۔خاموشی سے چپ سادھے رہیں اور وہ شخص جس کی عزت مٹی میں ملائی جارہی ہو دل میں سوچتا رہے کہ کاش کوئی اس کی مدد کو آئے ،اسے اس ذلت ورسوائی سے بچائے۔اسے اس جہنم سے نجات دلائے۔لیکن ایسا یہاں کچھ نہیں ہوتا۔سب چپ چاپ سنتے رہتے ہیں اور شکر ادا کر رہے ہوتے ہیں کہ وہ آج عتاب سے بچ گئے۔یہ مرحلہ سرکاری میٹنگوں سے نکل کر عام درباروں اور کچہریوں میں بھی آگیا۔ایک منہ چڑھے ورکر نے شکایت کی اور پھر کسی بھی شریف آدمی کی عزت بھرے مجمع میں نیلام کر دی گئی۔یہ معاملہ سیاسی رہنماؤں تک محدود نہیں ،عام سا چھوٹا افسر بھی آکر کچہری لگاتا ہے تو وہ اسی فیشن کو اپناتا ہے۔اسی لیے کہ جب لوگوں کے سامنے اپنے اہل کاروں کو ذلیل کرنے کی خبریں اوپر پہنچتی ہیں تو اسے ایک اعلیٰ منتظم اور ان سب کے نزدیک ""قابل"" افسر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔بڑے سے بڑے عہدے سے لے کر عام آدمی کی تذلیل کا چلن میرے ملک میں ہے لیکن شاید وقت کی چاپ اب کچھ اور کہانی سنانے والی ہے۔سید الانبیاء ﷺ کی ایک حدیث ہے۔آپ نے فرمایا ""جو مسلمان کسی ایسے موقع پر دوسرے مسلمان کا ساتھ چھوڑے جہاں اس کی عزت گھٹائی جارہی ہو اور اس کی حرمت پامال کی جارہی ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور ایسے موقع پر اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں جہاں اس کی عزت پامال ہو رہی ہو اور وہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کریں (ابوداؤد)۔ عزتیں پامال ہونے اور لوگوں کے سامنے بے توقیر ہونے کے دن قریب ہیں۔مدتوں کا یہ کھیل انجام تک پہنچنے والا ہے۔وقت کا آتش فشاں جب ابلے گا تو ایسے ہی وہ ذلت ورسوائی کے عالم میں ہوں گے سوچیں گے کہ آج کوئی ان کی عزت بچالے ،انہیں رسوائی سے محفوظ کر دے ،لیکن ایسے وقت میں اللہ ان کی مدد کو نہیں آئے گا اس لئے انہوں نے بھی اپنے مسلمان بھائی کی مدد نہیں کی تھی جب اس کی حرمت پامال ہو رہی تھی۔

حالت کیسے بدلتی ہے

فرعون کے تذکرے کرتے‘ اس کے ظلم کی باتیں بتاتے اور اس کے تکبر کے طوفان کی تصویر کھینچتے ہوئے دنیا بھر کے لکھنے والے اسے ایک ایسا شخص بنا کر پیش کرتے ہیں جس نے اپنی طاقت‘ قوت اور استعداد سے اقتدار حاصل کیا‘ اپنی چالوں سے اسے دوام بخشا اور پھر اپنے محکوموں پر زندگی تنگ کر دی۔ فرعون کے خدائی دعوؤں کا ذکر کرتے ہوئے بھی اسے ایک صاحب اختیار بادشاہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس کے پاس مصر کے تمام خزانے موجود تھے‘ جس کا رزق چاہتا روک دیتا اور جس کا چاہے فراخ کر دیتا۔ فرعون کے ظلم اور جبر کی شکار ایک قوم تھی...... بنی اسرائیل۔ صرف یہودیوں کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مورخین اور ماہرین آثار قدیمہ کی مرتب کردہ کتابوں میں بنی اسرائیل پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستانیں اور شواہد مل جائیں گے۔ دنیا بھر کے مورخ‘ تجزیہ نگار‘ مذاہب کے رہنما اس سارے عمل کو ظالم و مظلوم کی ایک داستان بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل جسے اچھوت بنا کر رکھا گیا تھا اور فرعون جوان سے ہر وہ سخت اور مشقت طلب کام لیتا تھا جس سے ان کی زندگی کے دن مشکل ہو جائیں۔ لیکن اگر اللہ کے کلام قرآن پاک کو کھول کر غور سے مطالعہ کریں اور تدبر کریں جس کا میرے اللہ نے حکم دیا ہے تو آپ حیرت کے جہان میں چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب بنی اسرائیل کے اس معاملے کا ذکر فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تمہیں بدترین عذاب سے نجات دلائی تو تذکرہ یوں ہوتا ہے کہ ایک ایسا عذاب جس میں فرعون تمہارے مردوں کو ذبح کر دیتا اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتا۔ لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کے لئے ایک پتے کی بات درج فرما دی۔ سورہ بقرہ کی انچاسویں آیت یوں ہے ”اور (ہمارے ان احسانات کو یاد کرو) جب ہم نے تم کو فرعون سے نجات بخشی۔ وہ (لوگ) تم کو بڑا دکھ دیتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو تو قتل کر ڈالتے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی سخت آزمائش تھی۔

فرعون کا کسی قوم پر مسلط ہونا اللہ کی طرف سے اس قوم کے لئے ایک آزمائش ہوتی ہے اور اس سے نجات بھی اللہ تبارک و تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے۔ اس بنیادی اصول کو اللہ قرآن پاک میں ایک اور جگہ بیان فرماتا ہے ”کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اللہ کے حکم سے‘ اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے“ (التغابن-11)۔ قوموں پر ظالم حکمرانوں کا مسلط ہونا‘ ان کا بستیوں پر ظلم روا رکھنا اور پھر ان کی مدت حکومت میں توسیع در توسیع اللہ کی طرف سے کسی قوم کی سخت ترین آزمائشوں میں سے ہے۔ اس اصول اور کلئے کو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک حدیث سے واضح کیا۔ جس کا مفہوم یوں ہے۔ ”آپؐ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کی قوم نے سوال کیا کہ ہمیں کیسے علم ہو گا کہ اللہ ہم سے خوش ہے یا ناراض‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا جب اللہ تم سے خوش ہوتا ہے تو وہ تم پر بہترین حاکم مسلط کرتا ہے اور جب وہ ناراض ہوتا ہے تو بدترین حاکم تمہارا جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ حاکموں کے مسلط ہونے اور ان کے ظلم روا رکھنے کو میرا اللہ اپنی طرف سے ایک سخت ترین آزمائش کا نام دیتا ہے۔ اگر اس آزمائش کے دوران آپ اسی اللہ کی طرف رجوع کر لیں‘ اس سے مدد مانگ لیں‘ اسے ٹالنے کے لئے اپنے گناہوں سے استغفار کر لیں تو یہ آزمائش ٹل جاتی ہے لیکن اگر آپ یہ تصور کر لیں کہ ہم طاقتور ہیں‘ ہم تبدیل کر لیں گے‘ عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہمارے ساتھ ہے۔ ہم لوگوں کو اقتدار کے ایوان سے گھسیٹ کر باہر نکال لیں گے تو یہ تکبر اور تفاخر اس آزمائش کو عذاب میں بدل دیتا ہے اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ بستیوں کی بستیاں اٹھ کھڑی ہوئیں‘ ظالم حکمرانوں کی موت کے پروانے بھرائے گئے‘ انہیں ٹھڈوں اور لاتوں پر رکھا گیا‘ ان کے سر تن سے جدا ہوئے‘ دنوں تک ان کی لاشیں سولیوں پر لٹکی رہیں۔ لیکن انقلاب لانے والے اس جم غفیر نے مڑ کر دیکھا تو ان پر ایک اور ظالم‘ ایک اور جابر اور ایک اور بدترین حاکم مسلط ہو گیا۔ انقلاب فرانس کی کوکھ سے ایک اور آمر نپولین نے جنم لیا تو روس کے زار سے جب لوگوں نے نجات حاصل کر لی تو ان پر کیمونسٹ دور کی بدترین آمریت مسلط ہو گئی جس نے سٹالن جیسے ظالم درندے کو جنم دیا اور سربیا کا برف پوش میدان انسانوں کا قبرستان بنا دیا گیا۔ چین کے لوگ اٹھے‘ لیکن ماوزے تنگ کے کلچرل انقلاب کے چار سال انسانی سروں کی فصل کاٹتے رہے۔

ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم اس دور میں سانس لے رہے ہیں جہاں دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ نے ہمیں یہ سبق ازبر کروا دیا ہے کہ انسان اپنی قسمت خود تحریر کرتا ہے۔ انسان ہی زندگی کو بدلتا اور بگاڑتا ہے۔ یہ اپنے مسئلے بھی خود حل کرتا ہے اور اگر یہ اکٹھا ہو جائے‘ ایک معاملے پر متفق ہو جائے تو تحریک چلا کر تبدیلی بھی لا سکتا ہے۔ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ ہم عوام کے سامنے جوابدہ ہیں‘ ہم سب رہنماؤں کو عوام کی عدالت کے سامنے پیش ہونا ہے‘ عوام کو طاقت کا سرچشمہ بنانے والے ”انسان عظیم ہے خدایا“ کے نعرے میں مست یہ لوگ پوری دنیا کو یہ یقین دلا چکے ہیں کہ دنیا میں تبدیلی صرف اور صرف جمہوریت سے آ سکتی ہے۔ یہی لوگ آج سے پچاس سال پہلے اپنی تحریروں‘ نظموں‘ افسانوں‘ ناولوں اور ڈراموں میں آواز بلند کرتے پھرتے تھے کہ تبدیلی انقلاب کے ذریعے آتی ہے۔ یہ غریب آدمیوں کا اکٹھا ہو کر ریاست پر قبضے کر کے اس پر غریب آدمی کی آمریت قائم کرنے سے آتی ہے۔ دنیا کے ساٹھ کے قریب ممالک‘ بلکہ آدھی دنیا میں اسی طرح خون بہا کر‘ ہتھیار اٹھا کر تبدیلی لائی گئی اور باقی جگہوں پر بھی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مسلح جدوجہد کو ہی تبدیلی کا راستہ سمجھا گیا۔ انقلاب کے لئے بندوق اٹھانے والے لوگوں کو شہید کا درجہ دے کر ان کی قربانیوں پر نظمیں لکھی گئیں۔ لیکن لوگوں کو سکھ اور چین نہ طاقت سے انقلاب کے ذریعے حاصل ہوا اور نہ عوامی طاقت کے جمہوری اقتدار سے۔ آج پوری دنیا کے امیر ترین ممالک جن میں جمہوریت نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں اور جس کو کامیاب بنانے میں سرمایہ دارانہ سودی نظام نے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر رکھی ہیں۔ وہاں کے گلی محلوں میں لوگ سڑکوں پر نکلے ہوئے ہیں۔ کتوں کے گلوں میں پلے کارڈ لٹکے ہوئے ہیں کہ ہم ہیں ننانوے فیصد‘ یعنی ننانوے فیصد کتوں کی زندگی گزار رہے ہیں اور جمہوریت کے ذریعے برسر اقتدار آنے والا ایک فیصد ان کے وسائل پر قابض ہے۔

دھواں دھار تقریروں‘ ٹیلی ویژن کے مذاکروں اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے عوام کے سمندروں والی ریلیوں کے موسم میں صرف ایک بات یاد کرانا چاہتا ہوں کہ اگر تبدیلی کی اس ساری جدوجہد میں میرے اللہ سے درخواست شامل نہ ہو گی‘ اس سے منت زاری موجود نہ ہو گی‘ اس کی طرف رجوع موجود نہ ہوا تو یہ ساری محنت‘ ساری جدوجہد ایک ایسے موڑ پر لا سکتی ہے جس سے عوام کو مایوسی کے افسانوں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ اللہ نے واضح کر دیا ہے۔ ”اللہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جس کو اپنی حالت کے بدلنے کا خیال نہ ہو“۔ یعنی حالت اللہ بدلتا ہے‘ عوام کا کام خیال دل میں لانا‘ اور جدوجہد کرنا ہے‘ لیکن اگر یہ طے کر لیا کہ حالت عوام بدلتے ہیں‘ عدالت عوام کی ہے‘ اور طاقت کا سرچشمہ بھی وہی ہیں تو پھر مایوسی کے اندھیروں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

شکست کون تسلیم کرے

سب کے ہونٹ سلے ہوئے ہیں' زبانیں گنگ ہیں' کوئی بولتا ہے' نہ لکھتا ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایسا لگتا ہے میرے ملک کے "عظیم دانش وروں"، تجزیہ نگاروں اور ماہرین معاشیات کو شرم آتی ہے۔ پوری دنیا کا میڈیا چیخ رہا ہے لیکن میرے ہاں خاموشی ہے۔ اس لئے کہ پوری دنیا میں لوگوں نے شعور اور دیانت کے ساتھ ایک نظام کا ساتھ دیا اور پھر جب کروڑوں بلکہ اربوں اس ظالم سودی نظام کی وجہ سے لوٹے گئے' بے گھر ہوئے' بے آسرا ٹھہرے تو وہ چیختے ہوئے اس سودی نظام کے عالمی مرکز وال سٹریٹ میں جمع ہو گئے' اور آج تک برفباری' طوفان' بارش' دھوپ اور آندھی کے درمیان وہیں پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ صرف وال سٹریٹ کے ارد گرد نہیں بلکہ دنیا کے ہر ترقی یافتہ ملک کے سودی نظام کے ہیڈ کوارٹر کے سامنے سراپا احتجاج ہیں۔ ان کے سامنے دنیا کے دو اقتصادی نظام دھڑام سے ٹوٹے ہیں۔ آج سے دو ڈھائی سو سال قبل انہوں نے خواب دیکھنے شروع کیے تھے۔ مزدوروں کی بادشاہت کے' سرمایہ داروں کے زوال کے' نجی ملکیت کے خاتمے اور ایک ایسے معاشرے کے قیام کے خواب جس میں کوئی ذاتی ملکیت نہیں ہوگی۔ کوئی سرمایہ دار مزدور کے خون پسینے پر اپنی صنعت کے تاج محل تعمیر نہیں کرے گا۔ کارل مارکس نے داس کیپٹل لکھی اور پھر کیمونسٹ مینی فیسٹو لکھ کر دنیا بھر کے مزدوروں کو ایک ایسے معاشرے کا انوکھا خواب دکھایا کہ جس میں کوئی ریاست' یا حکومت نہیں ہوگی۔ چونکہ کسی کی کوئی چیز ملکیت نہیں ہوگی' اس لئے لڑائی جھگڑے بھی نہیں ہوں گے' پھر نہ پولیس' نہ عدلیہ اور نہ حکومت' لیکن جب نظام قائم کرنے کا وقت آیا' روس میں انقلاب آیا' لینن کو کارل مارکس کے سارے خواب زندگی کی حقیقت سے اتنے ہی دور نظر آئے جتنی دیوانوں کی بستی ہوتی ہے۔ بس پھر کیا تھا' مزدوروں کی آمریت کے نام پر ایک سوشلسٹ ریاست وجود میں آئی۔ آدھی سے زیادہ دنیا اس اقتصادی نظام کی غلام بنی اور ہر وہ دانش ور' شاعر یا ادیب جسے اللہ یا مذہب سے ذرا سی بھی نفرت تھی اس نے اس اقتصادی نظام کے گن گانے شروع کر دیئے۔ میرے ملک میں ایسے لوگ کم نہ تھے جو اس نظام کے حق میں شعر' افسانے' مضمون اور کتابیں لکھتے رہے اور امریکہ کو ایسی ایسی گالیاں سناتے رہے کہ رہے نام اللہ کا۔ اس نظام کے مداحین یورپ میں بھی کم نہ تھے۔ لیکن پڑوس میں ہونے کی وجہ سے انہیں روس اور دیگر کیمونسٹ ملکوں کے لوگوں کی حالت زار کا علم تھا۔ اس لئے وہ عوام کو قائل نہ کر سکے۔ لوگ تو سرمایہ دارانہ نظام کی پررونق شاموں' رنگین راتوں اور حقیقت بھرے دنوں میں الجھے ہوئے اسے ہی اپنی زندگی سمجھتے تھے۔ کیمونسٹ نظام ٹوٹا تو کیا شور شرابہ ہوا' خوشیاں منائی گئیں' دیوار برلن توڑ کر اس کے پتھر شیشوں میں سجا کر سووینئر کے طور پر بیچے گئے۔ دنیا سرمایہ دار نظام کے شکنجے میں آئی تو وہ سارے دانش ور' شاعر' ادیب جنہیں اللہ یا مذہب سے ذرا بھی نفرت تھی امریکہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ وہ جو کل تک آدم سمتھ کی معاشیات کو سرمایہ دار کی سازش اور غلامی کی دستاویز کہتے تھے اب اس میں انہیں جمہوریت' انسانی حقوق اور سیکولرازم کی خوشبو آنے لگی۔ لیکن تمام نظاموں کے پیچھے ایک بہت طاقت ور سسٹم کام کر رہا تھا۔ یہودی سناروں کا ترتیب دیا ہوا سود پر مبنی بینکنگ سسٹم۔ آج سے صرف چند سال قبل اگر کسی شخص کو کہا جاتا کہ اس دنیا کا نظام سود کے بغیر چلایا جا سکتا ہے تو وہ کہتا یہ دقیانوس' جاہل اور فرسودہ لوگ نہ زمانے کے ساتھ چل سکتے ہیں اور نہ انہیں معاشیات کی الف بے تک آتی ہے۔ اس میں میرے ملک کے لیڈران سے لے کر ذرا سا پڑھا لکھا شخص بھی شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس ملک کی شریعت کورٹ نے سود کے نظام کے خلاف فیصلہ کیا تو اس وقت کے وزیر اعظم بھی مہلت مانگنے سپریم کورٹ میں چلے گئے۔ لیکن میرا اللہ اس مہلت کو نہیں مانتا وہ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ قرار دیتا ہے۔ اسی لئے میرے پیارے آقا نے اپنی زبان مبارک سے سود کھانے والے کے لئے ایسے الفاظ کہے جو انہوں نے کبھی ادا نہ کیے ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا سود کھانے والے کی کم سے کم مثال ایسی ہے کہ جیسے وہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کر رہا ہو۔ سود کا خاتمہ اس عالمی اقتصادی نظام کی طرف اشارہ تھا جس میں انسانیت کی فلاح ہے۔ اور آج جب دنیا اس سرمایہ دارانہ نظام کے شکنجے کو توڑنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تو ان کا پہلا ہدف یہ سودی نظام تھا جس نے ان کی جمع پونجیوں کو لوٹ کر انہیں فٹ پاتھ پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں سرمایہ دار نظام کے خلاف نعرے لگے' جہاں جمہوریت کو بھی اس نظام کی لعنت قرار دیا گیا' وہاں ایک سب سے مقبول نعرہ جو پوسٹروں پر تھا وہ یہ تھا" bank the Muslim Way Let us" ہم اسلامی طریقہ بینکنگ استعمال کریں۔ لیکن میرے ملک کا کوئی عظیم دانش ور' تجزیہ نگار اور معاشیات دان یہ سب بیان کرنے کی جرات نہیں کر رہا۔ سب یہ سمجھتے تھے کہ انسان کے لئے انسان کا بنایا قانون بہتر ہوتا ہے۔ لیکن اللہ کے قانون کو سچ ماننے والے شروع سے کہتے آئے جس نے انسان کو پیدا کیا وہی جانتا ہے اس سے کیا بہتر ہے لیکن اب شکست کون تسلیم کرے۔ انسان ہار جائے' اللہ کے سامنے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

نوٹ: حج کے لئے منی روانگی ہے۔ آئندہ ہفتے آپ سے رابطہ نہ ہو سکے گا۔ انشاء اللہ حج کے بعد حاضر خدمت ہوں گا۔

جو خاک ترے در سے ہے جاروب سے اڑتی

مسجد نبوی کے منقش در و دیوار اور قیمتی پتھروں سے آراستہ محرابوں گنبدوں اور چھتوں کے بیچوں بیچ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے سبز گنبد کی طرف آنکھیں لگائے سوچ رہا تھا کہ اب تو پورے کا پورا شہر مدینہ مسجد نبوی بن چکا ہے۔ یہ اسقدر شاندار پتھروں سے ڈھانپ دیا گیا ہے کہ اب ہم گرد راہ' اس غبار مدینہ سے بھی محروم ہو چکے ہیں جس کے بارے میں حالی نے کہا تھا۔

جو خاک ترے در سے ہے جاروب سے اڑتی

وہ خاک ہمارے لئے داروئے شفا ہے

وہ خاک مدینہ کہ جب اس کا گرد و غبار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر پڑتا تو اس کو صاف نہیں فرماتے' اور اگر صحابہؓ میں سے کوئی اپنے چہرے اور سر کو گرد و غبار سے چھپاتا تو منع فرماتے (جذب القلوب)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس ہوئے تو ساتھ آنے والوں میں سے کسی نے مدینہ کے گرد و غبار سے منہ ڈھانپا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے' مدینہ منورہ کے غبار میں شفا ہے" (خلاصۃ الوفا)۔ مدینہ کی ہواؤں اور اس کی مٹی سے میرے آقا ﷺ کو اس قدر محبت تھی کہ جب سفر سے لوٹتے اور مدینہ قریب آتا تو اپنی سواری کو حرکت دے کر تیز کر دیتے' وفور شوق سے بے چین ہو جاتے' چہرہ مبارک گرد آلود ہو تا تو اسے صاف نہ فرماتے' جب کبھی کسی بیمار کے لئے دعا فرماتے' اس پر دم کرتے تو مدینہ منورہ کی خاک پاک کو بھی دعاؤں میں شامل فرماتے۔ احادیث کی کتب میں یہ دعا مدینہ ارض پاک سے آپ کی محبت کی علامت ہے جو آپ زخم' پھوڑے' پھنسی وغیرہ پر دم کرتے ہوئے پڑھتے تھے۔ (بسم الہ بتربتہ ارض نا بری قتہ بعض نای شفی سق یمنا باذن ربنا) اللہ کے نام سے اور اللہ کے اذن سے یہاں کی زمین سرسبز ہو' یہاں سے کدورتیں دور ہوں اور ہمارے بیماروں کو شفا میسر ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ بنو حارث کے ہاں تشریف لے گئے ان میں سے کسی نے بخار کی شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا "وادیٔ ص عیب کی مٹی لے کر پانی میں حل کرو' وہ پانی اپنے اوپر چھڑک دو"۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بخار ختم ہو گیا۔ ثابت بن قیسؓ بیمار ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دم کیا اور وادیٔ ب طمان کی مٹی ایک پیالہ میں ڈالی' اسے پانی میں گھولا اور اس پانی کے ثابت بن قیس پر چھینٹے مارے۔ حضرت سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا "مدینہ منورہ کا غبار کوڑھ پن کو ختم کر دیتا ہے"۔ (خلاصۃ الوفا)۔

یہ ساری باتیں محبت کی ہیں' یہ سارے معاملے عشق کے ہیں' عشق کرنے والوں سے کوئی یہ سوال نہیں کرتا کہ محبوب کے ہاتھوں سے لمس حاصل کرنے والی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو کیوں سنبھال کر رکھتے ہو' انہیں آنکھوں سے کیوں لگاتے ہو' انہیں بار بار کیوں چومتے ہو' انہیں دیکھ کر آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کا دریا کیوں امڈ آتا ہے۔ سب اسے شوق' عشق' الفت' محبت اور اگر حد سے بڑھ جائے تو دیوانگی کا نام دیتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے والے سے سوال نہیں کیا جاتا۔ اس سے ایسا کرنے کی دلیل نہیں مانگی جاتی۔ لیکن اگر کوئی ایسے عشاق سے کوئی دلیل مانگ لے تو ان کا جواب بھی عشق کی وارفتگی سے رچا ہوا ہوتا ہے۔ اقبال یاد آتے ہیں۔ آخری عمر میں بہن کے کہنے پر حجاز مقدس کی حاضری کی تیاری کرنے لگے تو کہتے ہیں کہ کسی کے گھر جاؤ تو کوئی تحفہ لے کر جاتے ہیں۔ میرے دامن میں تو گناہوں کے سوا کچھ نہیں۔ رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اشعار لکھنے شروع کئے جو حاضری کے دوران توشۂ کی صورت پیش کرنا مقصود تھے۔ سو سے زیادہ ان قطعوں میں عشق و مستی اور میرے آقاؐ سے محبت کا والہانہ پن ہے۔ درخواستیں ہیں' اپنی کم مائیگی کا احساس ہے' اشک ہیں' آرزوئیں ہیں' انہیں اشعار میں اقبال نے حجاز کے حاکم عبدالعزیز سے مخاطب ہو کر اپنے جذب و مستی اور شوق و عشق کا عجیب جواز پیش کیا ہے جو صرف عشاق کی فرہنگ میں ہی قابل قبول ہے ورنہ دیوانگی۔ اقبال فرماتے ہیں۔

سجودے نیست اے عبدالعزیز ایں

بروبم از حشرہ خاک در دوست

"اے عبدالعزیز میں یہاں سجدہ تو نہیں کر رہا۔ میں تو دوست کی چوکھٹ پر اپنی پلکوں سے جھاڑو دے رہا ہوں"۔ اقبال کے ان اشعار میں یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کی چاشنی اور گداز ہے یا پھر امت مسلمہ کے زوال کا نوحہ' وہ امت جس کا سرمایہ ہی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ان کا اس سرزمین سے محبت اور تعلق کا رشتہ بھی آپ کی ذات گرامی کی وجہ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اقبال سفر حجاز کی تیاریوں کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اپنی آخری منزل مدینہ بتاتے ہیں۔

بدن وا ماندہ جانم در تگ و پوست

سوئے شہر کہ بطحا در رہ اوست

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز

کہ من دارم ہوائے منزل دوست

"میں اس نقاہت اور پژمردگی کے عالم میں ایک ایسے شہر کی طرف جا رہا ہوں جس کے راستے میں مکہ آتا ہے۔ اے میرے دوست تو یہاں ٹھہر اور خاص لوگوں سے مل کہ مجھے تو دوست کے شہر کی ہوا کھینچے لئے جا رہی ہے۔ سید الانبیاءؐ سے یہی تعلق اور یہی نسبت ہے جب حالی اپنی مسدس کے آخر میں اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے لکھتے ہیں تو اس امت کی رسول اللہؐ سے تعلق کی گواہی یوں دیتے ہیں۔

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف

اب تک وہی قبلہ تیری امت کا رہا ہے

جس شہر نے پائی تیری ہجرت سے سعادت

کعبے سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

سعدی' جامی' اقبال' حالی اور کتنے ایسے تھے جن کے اشعار ذہن میں گونجتے رہے اور گنبد خضرا پر الوداعی نگاہیں ڈالنے کا وقت آ گیا۔ خاک مدینہ جس سے خود میرے آقاؐ نے محبت کی' سوچتا تھا ہمارے نصیب میں کہاں' لیکن پتا نہیں ہمارے درمیاں ایسا کون طلب گار تھا' کس کا عشق سچا تھا' کس کی دعاؤں میں اثر تھا کہ جب 29 اکتوبر' 2 ذوالحج کو عصر کے وقت آقاؐ کے شہر سے روانہ ہونے لگے' تو پتا نہیں اچانک زور کی آندھی آئی' اور خاک مدینہ سے میرے جیسے گناہگار کے چہرے اور بالوں کو روشن کر گئی۔ اللہ اس کو آباد رکھے جس کی دعا اور طلب کی بھیک میں ہمیں بھی اس خاک کی سعادت میسر آئی۔ یہ چہرہ تو اس قابل ہرگز نہیں تھا۔

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

بیت اللہ کی راہداریوں میں گھومتے' طواف کی لذتوں میں گم لوگوں کو دیکھتے اور اشکوں' آہوں' سسکیوں سے لبریز دعاؤں کے ہجوم میں میری نظر جب بھی اردگرد موجود مختلف رنگ و نسل کے لوگوں پر پڑتی ہے تو حیرت میں گم ہو جاتا ہوں۔ اس دنیا میں شاید ہی کوئی نسل' قبیلہ' علاقہ یا لسانی گروہ ایسا ہو جس کے افراد نے اس حرم کی چوکھٹ پر سجدہ ریزی نہ کی ہو۔ ہر کسی کے ہاتھ میں اپنی زبانوں میں ترجمہ کی ہوئی دعاؤں کی کتاب ہے' اپنی ہی زبان میں ہدایات درج ہیں لیکن دعاؤں کے موتی ان مختلف زبانیں بولنے والوں کے منہ سے صرف ایک ہی زبان سے جھڑتے ہیں جو میرے پیارے رسول ﷺ کی زبان تھی' جس میں قرآن نازل ہوا۔ اس امت میں بڑے بڑے راستہ بدلنے والے آئے لیکن شاید کمال اتاترک سے زیادہ خلوص کے ساتھ امت سے ترکوں کو علیحدہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے ترک قوم کا لباس تبدیل کیا' اسے یورپ کے رنگ میں رنگا' ان کا رسم الخط جو عربی سے ملتا جلتا تھا تبدیل کر کے رومن الفاظ میں ترکی زبان کو رائج کیا۔ اذان ترکی میں دینا شروع کی۔ خطبے اور دعائیں ترکی میں شروع ہوئیں۔ یوں تقریباً سو سال تک ترک قوم اپنے اس ورثے سے دور رہی جو اسے مسلمان ہونے کی وجہ سے میسر آیا تھا۔ لیکن اس امت مسلمہ میں بھی ایک عجیب کمال ہے۔ پوری دنیا کے مقابلے میں یہ لوہے کے چنے ہیں جنہیں چباتے ہوئے صرف دانت ہی توڑے جا سکتے ہیں۔ اتاترک اور اس کے مداحین نے ترکوں کو سو سال تک اپنے کلچر اور اپنی زبان کے ساتھ ساتھ اپنے یورپی ہونے کے غرور کا بھی درس دیا۔ لیکن کمال ہے اس دین کا اور اس کے پیغمبر سے محبت کا کہ اس کے حضور نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو اپنی زبان نہیں اس زبان میں دعائیں اور امیدیں لگانے لگے جس کے معانی تک نہ جانتے تھے۔ بس اتنا جانتے تھے کہ ایک رسول ﷺ ہیں جو عرب میں پیدا ہوئے اور اس لیے اللہ نے اپنا کلام بھی اسی زبان میں اتار دیا۔ برونائی سے لے کر ہوائی کے جزیرے تک کہیں بھی مسلمان آپ کو ملے گا تو نماز سے لے کر دعا اور تلاوت تک عربی زبان میں کر رہا ہوگا۔ کسی کو اگر کوئی ایک شخص بھی کسی اور زبان میں نماز پڑھتا دکھائی دے تو دنیا کو اس عالمی بریکنگ نیوز سے ضرور باخبر کرے جبکہ دنیا کے تمام مذاہب علاقائی زبانوں میں یوں ڈھلے کہ ماخذ کو واپس بھی نہ لوٹ سکے۔ یہ سب مجھے یوں یاد آیا کہ اس دفعہ حرم کے قافلے میں میرا ساتھی ایک ایسا شخص ہے جو ڈنمارک سے تعلق رکھتا ہے۔ فرینک ہین۔ یہ تیرہ سال پہلے مسلمان ہوا۔ اسے وہی سوالات اسلام کی طرف کھینچ کر لے آئے جو آج یورپ کے ہر اس ذی روح کے سامنے ہیں جو اس بری طرح بکھرتے ہوئے گھروں اور تباہ ہوتی معاشرتی اقدار میں پاگل ہوا جا رہا ہے۔ فرینک نے ایک دن پادری سے سوال کر دیا' جب خدا ایک ہے' تو پھر خدا کا بیٹا اس کے ساتھ شریک کیسے ہو سکتا تھا۔ اول تو یہ کہ بیٹا بنا کیسے' اور پھر یہ تثلیث بائبل میں کہاں ہے۔ جواب نہ ملا تو قرآن کا ترجمہ ہاتھ آ گیا۔ اس کے سحر نے فرینک کو یوں قابو میں لیا کہ ڈنمارک کی رنگارنگ دنیا چھوڑی اور مصر جا کر عربی زبان سیکھنے کے لئے داخلہ لے لیا تاکہ عربوں کے درمیان رہ کر عربی سیکھی جائے۔ میں نے اسے کہا اب تو بہترین سے بہترین ترجمے موجود ہیں۔ کہنے لگا عربی سیکھ کر دیکھو پتہ چل جائے گا قرآن کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔

میرے ساتھ ایک آذربائی جان کا یوسف ہے۔ جس کا ملک روس کی بدترین کمیونسٹ حکومت کا ڈسا ہوا ہے۔ روس سے آزاد ہونے والی مسلمان ریاستوں میں ستر سال تک نہ نماز پڑھنے کی اجازت تھی اور نہ ہی کسی اور رسم الخط میں کوئی کتاب۔ یوں قرآن بھی اسی پابندی میں آتا تھا۔ اس لیے چھپا چھپا کر رکھا اور پڑھا جاتا۔ لیکن کمال ہے مسلمانوں کا کہ انہوں نے پورے کا پورا قرآن روسی رسم الخط میں محفوظ کر ڈالا۔ یوسف کے پاس جو دعائیں تھیں وہ اسے پڑھتا تو عربی میں ہے لیکن وہ لکھی ہوئی آذری میں ہیں جو روسی رسم الخط میں ہے۔ لیکن اب ان ریاستوں میں جہاں آزادی کے بعد لوگوں نے اپنے ٹرنکوں اور تہہ خانوں سے بوسیدہ قرآنی نسخے نکال کر' آنکھوں سے چومتے ہوئے انہیں دوبارہ پڑھنا شروع کیا تھا۔ وہاں اب واپس عربی رسم الخط بھی لوٹ رہا ہے۔ لیکن چودہ سو سال سے آج تک نہ قرآن بدلا' نہ اس کی زبان بدلی' نہ نماز تبدیل ہوئی اور نہ مسنون دعائیں۔ پوری دنیا قرآن پاک کو یاد کرتی ہے اور حافظ کہلاتی ہے۔ بغیر ترجمہ جانے' صرف اللہ کے کلام کے احترام میں اسے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کلام الٰہی کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن آج تک اس ترجمے کو کسی نے کلام الٰہی کے طور پر اپنے سینے میں محفوظ نہیں کیا۔ ایک ارب ساٹھ کروڑ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ کلام الٰہی وہی ہے جو عربی زبان میں ہے۔ ایک دفعہ پھر پوری دنیا گھوم لیں' برونائی سے فیجی تک اور کسی بھی حافظ قرآن سے قرآن سنئے' اگر پوری دنیا میں زیر' زبر' پیش یا شد کی کوئی ایک غلطی یا فرق بھی آپ کو نظر آئے تو دنیا کو اس دوسری بڑی بریکنگ نیوز سے مطلع ضرور کیجئے گا۔ قرآن پاک کا یہی وہ اعجاز تھا کہ جس علاقے میں میرے رسول ﷺ کے ساتھی یعنی صحابہ دین لے کر پہنچے' وہاں کی مادری زبان بھی تبدیل ہو گئی' عراق' شام' اردن' مصر' تیونس' لیبیا' یہاں کبھی عربی نہیں بولی جاتی تھی۔ میرے اللہ کے رنگ میں ایسے رنگے کہ آج یہی عرب دنیا ہے۔ کمال کی بات ہے کہ جس دین کی محبت میں ان کے آباؤ اجداد نے اپنی مادری زبان تک ترک کر دی یہ سارے عرب اس دین کو فخر کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ اس زبان کو بناتے ہیں حالانکہ یہ زبان تو تمہارے آباؤ اجداد نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کی خاطر سیکھی تھی۔ حرم کی راہداریوں میں کسی بھی رنگ' نسل' زبان یا علاقہ کا فرد زبانی پڑھے یا دعاؤں کی کتاب سے' ایک ہی زبان میں اپنے رب کو پکارتا ہے۔ وہ زبان جو میرے پیارے آقا کی زبان تھی اور جن سے محبت کا یہ عالم کہ میرے اللہ نے اپنا کلام بھی اسی زبان میں اتارا۔

قانون نہیں انصاف کی بالادستی

برطانیہ اس برصغیر میں جہاں اور بہت سی قباحتیں چھوڑ کر گیا ہے وہاں اس کا دیا ہوا نظامِ قانون ہمارے معاشرے کا وہ ناسور بن چکا ہے جس سے مسلسل بے انصافی اور ظلم کی پیپ رستی چلی آ رہی ہے۔ اس نظام کے تحت بالادستی قانون کو حاصل ہے خواہ وہ کتنا ظالمانہ اور غیر منصفانہ کیوں نہ ہو۔ اس قانون کے پاؤں تلے اگر انصاف آ کر کچلا جائے تو بھی اس پورے سسٹم کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی اس لئے کہ یہ سسٹم انصاف کی بالادستی کے لئے نہیں بنا بلکہ قانون کی بالادستی کے لئے بنایا گیا تھا۔ ایک انتہائی ایماندار اور قابل جج اس نظام کے شکنجے میں ایسے بے بس ہو جاتا ہے کہ فیصلہ لکھتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ قانون کی کتابیں ایسے مقدموں سے بھری پڑی ہیں جن میں بے گناہ تختہ دار پر لٹک گئے اور فیصلہ کرنے والے جج اپنی اس بے انصافی پر ماتم بھی نہ کر سکے اس لئے کہ ان بے گناہوں کو دی جانے والی سزا قانون کے عین مطابق تھی۔

آپ ایک ایسے مقدمے پر غور کیجئے جس میں ایک شخص کہیں سرراہے قتل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ویران مقام، جیسے کوئی کھیت وغیرہ، ہے۔ مقتول بااثر خاندان کا فرد ہے جس کا ایک عام سے گھرانے کے ساتھ عناد ہے۔ تھانے کا ایس ایچ او، کہ جس گروہ میں دیانتدار ڈھونڈنا اندھیری رات میں کالے پتھر پر کالی چیونٹی تلاش کرنے کے مترادف ہے، وہ ایس ایچ او لالچ' سفارش یا پھر اپنی پوسٹنگ کی خاطر ایک ایسا چالان مرتب کرتا ہے جس میں تین چار گواہ عین موقع پر شہادت دیتے ہیں اور پھر جس پستول کی قسم سے فائر کیا گیا ویسا ہی پستول خرید کر اس میں سے چند فائر کر کے اسے مٹی میں دفن کر کے مقتول کی لاش کے اردگرد سے برآمد کر لیا جاتا ہے' پھر ایک مضبوط وکیل کے ذریعے اس بے گناہ کو قاتل ثابت کر دیا جاتا ہے تو پھر سپریم کورٹ تک کوئی اس کی دادرسی کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایسے ہزاروں بے گناہ آپ کو جیلوں میں سڑتے اور پھانسیوں پر چڑھتے ہوئے ملیں گے۔ قتل ایک شخص نے کیا ہوتا ہے اور چالان میں دس دس لوگوں کے نام لکھوا کر بددیانت تھانیداروں اور جھوٹے گواہوں کے ذریعے اپنے دشمنوں کو سزائیں دلوائی جاتی ہیں۔ وکالت کا سارا دھندا اصل کہانی کے مقابلے میں ایک مضبوط کہانی ترتیب دینے کے گرد گھومتا ہے۔ یہ کہانی قاتل کو بے گناہ ثابت کر سکتی ہے اور بے گناہ کو قاتل۔ کوئی ناکے پر کھڑا پولیس والا رشوت نہ دینے پر آپ کی جیب میں سے چرس برآمد کر دے' آپ کو آوارہ گردی میں پکڑے یا پھر آپ کو واردات کی نسبت سے نکلے ہوئے مشتبہ افراد میں شامل کر کے جیل بھجوا دے۔ اس ملک کا نظام قانون آپ کی کھوئی ہوئی عزت واپس دلانے سے معذور ہے۔ جھوٹے گواہوں' اللہ کو حاضر ناظر جان کر قسم اٹھانے والے بددیانت تفتیشی افسروں اور کہنہ مشق وکیلوں کی قانون کی کتابوں سے الجھی ہوئی گفتگو سے سجا ہوا ہے۔ یہ وہ سسٹم ہے جس میں شہر بھر اس بات کی گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ یہ شخص بددیانت ہے' چور ہے' قاتل ہے لیکن عدالت کی کارروائی اس سے برعکس چل رہی ہوتی ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جج کو روزِ روشن کی طرح یقین ہوتا ہے کہ میرے سامنے پیش ہونے والا شخص انتہائی بددیانت ہے۔ خود اس کے اپنے جاننے والوں نے اسے رشوت دے کر کام کروایا ہوتا ہے لیکن مقدمے کی جو مثل تفتیشی آفیسر نے اس کے سامنے بنا رکھی ہوتی ہے وہ اسے بے گناہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اور جج بے بسی کے ساتھ اس کو رہا کرنے کے پروانے پر دستخط کر دیتا ہے۔ اس پورے سسٹم میں عدالت کا کام انصاف کرنا نہیں ہے بلکہ کہیں قانون کے خلاف کوئی کام ہوا ہے تو اس پر سزا دینا۔ بے شک وہ قانون اسمبلی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے انسانوں پر ظلم کرنے کے لئے ہی بنایا ہو۔ ضابطہ فوجداری میں ایس ایچ او کے اختیارات پڑھ لیں آپ کو حیرت ہو گی کہ وہ قانون کے تحت محض شک کی بنیاد پر کسی بھی شریف آدمی کو گرفتار کر کے رسوا کر سکتا ہے۔ عدالت بس اس کی ضمانت لے سکتی ہے یا کیس خارج کر سکتی ہے۔ کوئی تھانیدار کسی شخص کو گرفتار کرتا ہے' کسی نجی مکان میں کئی دن رکھ کر تشدد کرتا ہے پھر ایک دن اس کی گرفتاری ڈال کر ریمانڈ لے لیتا ہے تو گزرے ہوئے اذیت ناک دن عدالت کی دسترس سے باہر ہیں۔ شہر میں کوئی غنڈہ' بدمعاش یا بااثر شخص لوگوں کی زندگی حرام کئے ہوئے ہے' نہ کسی شکایت پر ایف آئی آر درج ہوتی ہے اور نہ سیاسی سطح پر کوئی شکایت سننے کو تیار ہے۔ عدالت کے سارے جج بھی جانتے ہوں کہ اس شخص نے لوگوں کا جینا عذاب کر رکھا ہے لیکن بے بسی کے عالم میں کچھ نہیں کر سکتے۔ یہی وہ نظام قانون ہے جس نے بددیانت' ظالم' قاتل' کرپٹ اور بھتہ خور لوگوں کی ایک نسل پیدا کر دی ہے جو لوگوں کے سامنے سینہ تان کر کہتے ہیں جاؤ جا کر عدالت میں ثابت کرو' ہم پر الزام مت لگاؤ۔ پورا شہر ان کے ظلم سے واقف ہوتا ہے' پورے ملک کو ان کی کرپشن کی داستانیں معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ پوری قوم کے سامنے ڈھٹائی کے ساتھ بولتے ہیں۔ ان میں سے ایک کیس بھی عدالت میں ثابت نہیں ہوا۔ یہ سب سیاسی مقدمے ہیں۔ انگریز کے دیئے ہوئے اس نظام قانون میں سب سے بدترین چیز رحم کی اپیل منظور کرنے کا اختیار ہے۔ اس سارے سسٹم میں اگر کوئی مجرم سپریم کورٹ تک سزا کا مستحق ہو بھی جاتا ہے تو صدر اسے معاف کر سکتا ہے۔ یہ وہ اختیار ہے جس کے بارے میں میرے آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جرم ثابت ہونے کے بعد معاف کرنے کا اختیار میرے پاس بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہزاروں ایسے مجرم ہیں جو پھانسی کی سزا پا چکے ہیں مگر صدر کو رحم کی اپیل کر کے مزے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ چار سو سے زیادہ تو پنجاب میں ہیں۔ ان میں لسانی اور فرقہ وارانہ دہشت گرد بھی ہیں۔ گزشتہ تین سالوں میں شاید ہی کسی کی پھانسی کی سزا پر عملدر آمد ہوا ہو۔

انگریز کے اس قانون کے مقابلے میں میرا اللہ اور اسلام کا نظام ایک جج کو عدالت کے کمرے تک محدود نہیں کرتا بلکہ وہ اسے خود تفتیش کرنے کا اختیار دیتا ہے تاکہ وہ انصاف کر سکے۔ اسلام کے اس سنہری اصول کے مطابق فرانس نے اپنا جوڈیشل سسٹم مرتب کیا ہے۔ مقدمہ سننے والے جج اور تفتیشی جج کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور کوئی تفتیشی جج کسی مقدمے کی تفتیش کے بعد فوراً مقدمہ سننے والے جج کی ذمہ داریاں سنبھال لیتا ہے۔ یوں اگر عدلیہ یہ سمجھے کہ پولیس مل گئی ہے' گواہ بٹھا دیئے گئے ہیں یا سیاسی گٹھ جوڑ کی وجہ سے مقدمے کی فائل ہی خالی کر دی گئی ہے تو خود تفتیش کرے اور انصاف کو یقینی بنائے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں فرانس وہ ملک ہے جس میں سب سے کم جرائم ہوتے ہیں۔ سو سال کی غلامی کے بہت سے تحفے اس قوم کو ملے ہیں لیکن شاید ان میں بدترین یہ اینگلو سیکسن قانون تھا جس میں طاقتور' صاحب اقتدار یا صاحب ثروت قتل اور بددیانتی کر کے ہار پہنے ہوئے عدالت سے برآمد ہوتا ہے اور بے گناہ لیکن کمزور اور مفلوک الحال جیل کی تنہائیوں میں آنسو بہاتا ہے۔

نوٹ: جس وقت آپ یہ کالم پڑھ رہے ہوں گے میں حج کی سعادت کے لئے انشاءاللہ حرم پاک جا چکا ہوں گا۔ دیارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کالم کے ذریعے رابطہ رکھنے کی کوشش کروں گا لیکن ہو سکتا ہے کوتاہی ہو جائے۔ میرے کسی لفظ' کسی فقرے یا کسی خیال سے اگر کسی کو دکھ پہنچا ہے' تکلیف ہوئی ہے تو مجھے اللہ کے نام پر معاف فرما دیجئے' اللہ آپ کو یقیناً قیامت کے دن اس کا اجر دے گا۔ اس دعا اور امید کے ساتھ کہ واپس لوٹوں تو میرے ملک کے دن بدلنے والے ہوں۔

مجھے مت ماریئے

بہت سے ایسے لوگ آج بھی اس ملک میں زندہ ہوں گے جنہوں نے میری طرح 1974 میں لاہور میں واقع فیروز پور روڈ کے دور دراز سٹیڈیم میں کرنل قذافی کی تقریر سنی ہو گی۔ اس وقت عربی کے استاد ظہور احمد اظہر صاحب عالم شباب میں تھے جو اسے بڑی روانی کے ساتھ ترجمہ کر رہے تھے۔ اس وقت پوری دنیا دو گروپوں میں تقسیم تھی' ایک کمیونسٹ یا روس نواز اور دوسرے امریکہ نواز سرمایہ دار۔ اسلام کا نام اجنبی نہیں تھا لیکن ہر کوئی اس کو اپنے نظریات کے لئے استعمال کرتا تھا' اپنی مرضی کی آیات کی تعبیر کرتا۔ کوئی ان میں اشتراکیت نکالتا اور کوئی نجی ملکیت کے تحفظ کے حوالے سے سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ کا اعلان کرتا۔ جتنے مذہب سے بیگانہ اور اکتائے ہوئے لوگ تھے' وہ سب کے سب روس نواز اشتراکیت کے قائل تھے۔ مذہب کا توڑ ہر کسی نے صرف اور صرف ایک راستے میں ڈھونڈا ہوا تھا اور وہ تھا قوم پرستی اسی لیے پورے پاکستان میں جتنی بھی قوم پرست تحریکیں تھیں خواہ وہ بلوچوں کی ہو' پختونوں کی یا سندھیوں سرائیکیوں کی' سب کی سب پرولتاریہ انقلاب کی علمبردار اور روس کی حاشیہ نواز تھیں۔ ایک خاص نظریہ دیا گیا تھا محکوم قوموں کا اور غاصب قوموں کا۔ اس نظریے کے تحت پنجاب کا رات کو بھوکا رہنے والا مزدور بھی ظالم تھا اور سندھ' بلوچستان اور خیبر پختونخواہ کا سردار' وڈیرہ اور خان جو عام آدمی کا خون چوستا تھا وہ مظلوم تھا۔ قذافی اس قوم پرست نظریے کا علمبردار تھا۔ ایک ایسے ملک سے تعلق رکھنے والا جہاں رسول ﷺ کے ساتھیوں نے جب عمر بن العاص کی قیادت میں ستمبر 642 میں روم کے محکوم لیبیا پر اپنے گھوڑے دوڑائے تو ان کے سامنے بڑے بڑے قلعوں کی دیواریں مٹی کا ڈھیر ثابت ہوئیں۔ یوں تو یہ علاقہ فتح ہو گیا لیکن روم کی افواج پھر بھی اس پر قبضہ برقرار رکھنے کی جدوجہد کرتی رہیں' آخر عبداللہ ابن سعدؓ کی سربراہی میں 647ء میں لیبیا خلافت اسلامیہ کا حصہ بن گیا۔ یہاں کے بربروں نے 663ء میں سر اٹھایا تو عقبہ بن نافع نے اس معمولی سی مزاحمت کو بھی سرد کر دیا۔ یہ لوگ اپنی اپنی زبانیں' اپنے اپنے رسم و رواج اور اپنی رنگ و نسل پر زندگی گزار رہے تھے لیکن میرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیار کردہ ساتھیوں نے اس طرح ان پر حکومت کی' اس طرح ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا کہ وہ اپنی مادری زبان تک بھول کر عرب دنیا کا حصہ ہو گئے۔ لیبیا یوں تو افریقہ کا ایک ملک ہے۔ صدیوں رومن بادشاہتوں کے زیر نگین رہا ہے لیکن آج اسے عرب دنیا کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔

جنگ عظیم اول کے وقت جب دنیا بھر کی قوتیں مسلمانوں کی اجتماعی حکومت خلافت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کے لئے چڑھ دوڑیں تو لیبیا نے عمر مختار جیسے رہنما کو جنم دیا جس نے اٹلی کے قبضے کے خلاف جدوجہد کی اور اس کی جہاد سے سرشار تحریک نے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اس خطے کو اٹلی کا افریقہ کہا جاتا تھا۔ یہاں کبھی اٹلی اور کبھی یونان کا قبضہ رہا اور پھر جنگ عظیم دوم میں برطانیہ نے یہاں اپنے جھنڈے گاڑ دیئے اور پھر 1943ء سے 1951ء تک یہ برطانیہ کا محکوم رہا۔ 1951ء میں لیبیا کے بادشاہ ادریس کے اعلان آزادی کے بعد یہ ایک خود مختار ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر سامنے آیا۔ یہ وہ ملک ہے جس کے خواص و عام میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک شیخ احمد سنوسی کی سربراہی میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ تحریک عرب کے دیگر علاقوں میں کام کرتی ہوئی اخوان المسلمون کے ہم پلہ تھی۔ تیل سے مالامال یہ خطہ اور اس پر اللہ کے نام لینے والوں کی حکومت قائم ہو جائے یہ کیسے برداشت ہو سکتا تھا۔ ایسے میں خانہ بدوش بدوؤں کے گھر میں پیدا ہونے والے ایک نوجوان معمر محمد ابو منیار القذافی نے 1961ء میں ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لیا۔ 1966ء میں وہ وہاں سے پاس ہو کر نکلا۔ وہاں سے وہ اچانک اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ چلا گیا۔ افواہیں پھیلیں کہ اس نے شاہی ملٹری اکیڈمی سینڈ ہرسٹ میں داخلہ لے لیا ہے۔ لیکن اس نے وہاں تعلیم بھی حاصل کی اور لندن میں اعلیٰ حکام سے رسم و راہ بھی بڑھائی۔ واپس آنے پر اس نے فوج میں نوکری شروع کی اور وہ ابھی لیفٹیننٹ کے عہدے پر تھا کہ اس نے یکم ستمبر 1969ء کو اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ وہ صرف ایک لیفٹیننٹ تھا لیکن لوگ اسے کرنل کرنل کہتے تھے۔

یوں تو اس اقتدار پر قبضے کے دوران ایک بھی گولی نہ چلی لیکن قذافی نے اقتدار میں آنے کے بعد اپنے ظلم و جور کا آغاز کیا۔ جو بھی کوئی سیاسی جماعت بناتا یا گروہ اکٹھا کرتا اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا۔ سیاسی گفتگو کرنے اور غیر ملکیوں سے بات چیت کرنے کی سزا تین سال قید تھی۔ اقتدار میں آنے کے ایک سال بعد کرنل قذافی نے حزب التحریر کے ممبران کو قتل کرنا شروع کیا۔ یہ تحریک جو اس وقت عالم اسلام کے چالیس سے زیادہ ممالک میں ہے اس زمانے میں عرب کے جن ممالک میں سرگرم تھی ان میں لیبیا بھی شامل تھا۔ یوں بنیادی طور پر ایک بدو گھرانے کا فرد جس نے ایک دینی مدرسے میں واجبی سی تعلیم حاصل کی' فوج میں بھرتی ہوا' پھر اپنی زندگی کے چند سال برطانیہ میں انتہائی مشکوک انداز میں گزارے اور واپس آ کر اقتدار پر قابض ہوا' اس کا بنیادی مقصد اقتدار کے علاوہ ایک یہ بھی تھا کہ اس سرزمین سے جو صحابہ کرام (علیہم رضوان) کے زمانے سے اسلام کے پیغام اور طرز حکمرانی سے آشنا تھی' اس کو سیکولر' لبرل اور قوم پرست بنیادوں پر استوار کرنا تھا۔ اس کی سبز کتاب میں بھی اس نے عوام کے لئے رہنمائی کے اصول متعین کئے ہیں۔ وہ عرب قومیت کے داعی ایک اور سیکولر اور لبرل حکمران جمال عبدالناصر کا شیدائی تھا لیکن اپنی تقریروں میں اسلام کا نام لیتا' شریعت کی گفتگو کرتا' پوری زندگی لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے اور خبروں میں رہنے کے لئے طرح طرح کے تماشے اور بہروپ بدلتا۔ کبھی کہتا یہ ایڈز ایک امن پسند وائرس ہے' کبھی دعویٰ کرتا کہ یورپ خود ہی اپنی خاندانی منصوبہ بندی کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جائے گا۔ جوش خطابت میں مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنا اور اپنی دنیا پر چھا جانے کی باتیں کرنا اس کا دستور تھا لیکن اپنے ملک میں اسلام کی بات کرنے والوں کا وہ جانی دشمن تھا۔ امریکہ کے خلاف گفتگو اور عربوں کو قومیت کے نام پر متحد کرنا اس کا مقصد کبھی ہوتا اور کبھی نہیں۔ کبھی وہ فرانس' انگلینڈ اور امریکہ کے سامنے اپنے ایٹمی پروگرام کھول کر امن کی فاختہ اڑاتا اور کبھی اقوام متحدہ کو امریکہ کا ذیلی ادارہ کہتا۔ اس نے 42 سال آمریت کا جھنڈا گاڑا۔ لوگ اسے مسلمان ڈکٹیٹروں کی صف میں کھڑا کرتے ہیں حالانکہ یہ سب کے سب خواہ ناصر ہو' حسنی مبارک' حافظ الاسد' زین العابدین سب سیکولر' لبرل' قوم پرست ڈکٹیٹر تھے لیکن جب میرے دین کو بدنام کرنا ہو تو انہیں مسلمان ڈکٹیٹر کہہ دیا جاتا ہے۔ مجھے قذافی کے دعوؤں اور اس کے آخری الفاظ مجھے مت مارو' مجھے مت مارو پر قرآن کی وہ آیات یاد آ رہی ہیں جن میں اللہ دعوے سے کہتا ہے انہیں کہو "اگر تم سچے ہو تو ایک دفعہ موت کی خواہش تو کرو۔" خوبصورت حسیناؤں کی فوج کے جھرمٹ میں قذافی کا لہجہ اور تھا اور موت کو سامنے دیکھ پھر وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا' مجھے مت مارو۔

گیادور سرمایہ داری گیا

وہ جو کل تک بڑے بڑے دعوے کرتے نہیں تھکتے تھے' جن کی گفتگو میں معاشیات کی لغت کے موٹے موٹے اور مشکل لفظ لوگوں کو مرعوب کرتے رہتے تھے' جو اس پوری دنیا کے معاشی نظام کو ایک ایسا گورکھ دھندا بنا کر پیش کرتے تھے کہ عام آدمی تو ایک طرف' اچھا خاصہ پڑھا لکھا شخص بھی اسے نہ سمجھ سکے۔ دنیا بھر کے معاشیات دان جب کتابیں لکھتے' کسی کانفرنس میں تقریر کرتے' کسی اہم ترین اجلاس میں پر مغز گفتگو کرتے تو دنیا کی معاشی سرگرمیوں کو اس طرح الجھا کر پیش کرتے اور اعداد و شمار سے ایسے کھیلتے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ جس معیشت کو چاہے اعداد و شمار کی مدد اور مستقبل کی امید کے ساتھ وابستہ کر کے مضبوط قرار دے دیتے اور جسے چاہے گرتی ہوئی اور زوال پذیر معیشت سے تعبیر کر دیتے۔ یہ لوگ بھی غضب کے تھے۔ انہوں نے انسان کو کاغذ کے نوٹوں میں الجھایا اور پھر کرنسی کے اتار چڑھاؤ سے کتنوں کو غرق کیا اور کتنے لوگوں کو بادشاہ بنا دیا۔ ایک پوری سائنس کرنسی کے علوم پر مرتب کی گئی اور اس کے مضبوط اور کمزور ہونے کے پیمانے بنائے گئے۔ عام آدمی جو کھیت میں غلہ اگاتا تھا' بھٹی میں برتن' یا دکان پر جوتیاں سیتا تھا اچانک حیرت میں گم ہو جاتا کہ آج میری فصل یا بنائی ہوئی چیز کی قیمت اتنے کاغذ کے بنے ہوئے نوٹ ہیں اور کل نہ وہ چیز بدلتی ہے' نہ اس کی ہیت میں کوئی فرق آتا ہے اور مارکیٹ میں اسے قیمت کم ملنے لگتی ہے۔ اسی کرنسی کے گورکھ دھندے اور معیشت کی مجرمانہ منصوبہ بندیوں نے پوری دنیا میں ذخیرہ اندوزی کی اس لعنت کو جنم دیا کہ ایک کسان کے کھیت کی فصل اٹھا کر اگر ایک گودام میں رکھ دی جائے اور لوگوں کو اس کی تلاش میں سرگرداں کر دیا جائے تو صرف چند ماہ بعد اسے جس قیمت پر چاہے فروخت کر دیا جائے۔ معیشت کی اس الجھی ہوئی راہداریوں میں ایک مقام سٹاک ایکسچینج کا بھی آتا ہے جہاں عام آدمی کو سہانے خواب دکھا کر اپنی جمع پونجی لگانے کی ترغیب دی جاتی ہے اور پھر ایک دن ہوتا یہ ہے کہ اچانک حصص کی قیمتیں گرنے لگتی ہیں اور لاکھوں کروڑوں لوگوں کا سرمایہ ڈوب جاتا ہے لیکن نہ تو ان کمپنیوں پر کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ ان کے مالکان پر۔ وہ ایک کمپنی کو بند کر کے' دیوالیہ قرار دے کر' دوسری کمپنی کا آغاز کرتے ہیں اور لوگ پھر اس لالچ کے دھندے میں آ کر اپنی بچت ان لٹیروں کے حوالے کرتے جاتے ہیں۔

اس سارے معاشی نظام کے پیچھے اور اس کی اساس جس لعنت پر قائم ہے وہ سود ہے۔ یہ سود کا دھندا کبھی ایسے شخص کے مقدر میں ہوتا تھا جو امیر ہو' جس کے پاس لوگوں کو دینے کے لئے وافر پیسہ موجود ہو اور پھر وہ عام آدمی کی ضروریات اور مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے سود پر رقم دے اور اس سے سود وصول کر کے خود ٹھاٹھ سے زندگی گزارے۔ لیکن لندن کے یہودیوں نے جب بنک آف انگلینڈ کا چارٹر حاصل کیا تو غریب اور امیر سب کو اس دھندے پر لگا دیا۔ دو لاکھ لوگوں سے چھوٹی چھوٹی رقمیں حاصل کر کے ایک جگہ جمع کیں اور انہیں ایک سرمایہ دار کے حوالے کر دیا۔ ان غریب لوگوں کو کہ جو کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کسی کو سود پر رقم دے کر پیسے کمائیں گے انہیں ایسی ترغیبات دی گئیں کہ اپنا تمام سرمایہ تک وہاں لگانے لگ گئے۔ یوں سود کے نظام کی ایک الٹی گنگا بہائی گئی۔ پہلے امیر آدمی غریبوں کو سود پر قرض دیتا تھا۔ اب دو لاکھ غریب آدمی مل کر ایک امیر آدمی کو قرض دیتے ہیں اور سود حاصل کرتے ہیں۔ کسی کو کہا گیا کہ بیوگی میں تمہارا سہارا ہے' کسی کو بچوں کی تعلیم کے لئے سرمایے کا لالچ دیا گیا' کسی کی پنشن کو ماہانہ سود کے نام پر اپنے قبضے میں لے لیا گیا۔ اس نظام کی چکا چوند ایسی تھی کہ ہر کوئی اس میں ایسا پھنسا کہ اس وقت ہی باہر آیا جب وہ برباد ہو چکا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں اگر کہا جاتا کہ تم فلاں دکان یا فلاں کاروبار میں شراکت کر لو تو انہیں ہزار ہا خوف گھیر لیتے' دکاندار پیسے لے کر بھاگ جائے گا' سرمایہ ڈوب جائے گا' پتہ نہیں منافع بھی ہونا ہے یا نہیں۔ چلو بنک ماہانہ لگے بندھے پیسے تو سود کے طور پر دیتا ہے۔ یہ سب اس چکا چوند میں ایسے الجھے کہ لاکھوں نہیں کروڑوں لوگوں نے اپنے پیسے ان لٹیروں کے حوالے کر دیئے۔ یہ سب اس حقیقت سے واقف نہ تھے کہ جب بنک ڈوبتا ہے تو لاکھوں لوگ ڈوب جاتے ہیں۔ گزشتہ صدی میں کئی سو بنک ڈوبے اور کروڑوں لوگ اجڑے لیکن معیشت کے قابض ان ظالم لوگوں نے کبھی لوگوں کو احساس تک ہونے نہ دیا کہ یہ کس قدر کریہہ نظام ہے۔ میڈیا ان کی گرفت میں تھا اور آج بھی ہے۔ کسی نے ان لٹے پٹے لوگوں کا حال بتانے کی کوشش نہ کی۔ پوری دنیا اور اپنے ملک پاکستان تک ٹیلی ویژن سے لے کر اخبارات کے "دانش ور کالم نگاروں" تک کسی ایک نے بھی اس سود کے نظام سے تباہ ہونے والے' عمر بھر کے لئے اجڑ جانے والوں کا نوحہ نہیں لکھا۔ کیوں لکھتے' اس طرح تو میرے اللہ کی حکمت سچ ثابت ہوئی تھی جس نے سود لینے اور دینے والے کو اپنے اور اپنے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ قرار دیا ہے۔

لیکن میرے اللہ کی حکمت اور دانائی سب پر غالب ہے۔ وہ جب کسی نظام کو ڈبونے پر آتا ہے تو پھر دنیا کے سامنے اس کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔ 2008ء اس کا آغاز تھا۔ دنیا کی معیشت کا دھڑکتا دل وال سٹریٹ ایسے گرا جیسے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت گرتی ہے۔ بڑے بڑے ادارے جو سود پر پلتے تھے دھڑام سے نیچے آ گئے۔ لی مین برادرز کہ جس کے بارے میں کوئی تصور نہ کر سکتا تھا زمین بوس ہو گیا۔ مدد اور پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ حکومت نے لوگوں کے ٹیکسوں سے سات سو ارب ڈالر کی امداد دی تا کہ یہ بوسیدہ نظام بچ جائے۔ پورے امریکہ اور یورپ کے اکثر بینکوں سے سود تقریباً ختم کر دیا گیا تا کہ لوگ قرض لے کر کاروبار کریں اور انہیں سود کا خوف نہ ہو۔ دبئی ڈوبا' یورپ کی مارکیٹیں ڈوبیں۔ اب دنیا کے اس ڈوبتے ہوئے معاشی نظام کو کہاں تک حکومت کی سرمایہ کاری سہارا دیتی۔ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ 27 فروری 2008ء کو یورپی پارلیمنٹ نے دنیا بھر کے ماہرین معاشیات کو اکٹھا کیا۔ اس کانفرنس میں موجود یہ بڑے بڑے لوگ جب گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالنے کی تجویزوں پر آئے تو حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ دنیا میں اگر کوئی بنک تباہ ہونے سے بچا تو وہ تھا جس نے تھوڑی بہت حد تک اسلامی بینکنگ کو اختیار کیا ہوا تھا۔ میرے اللہ کے بتائے ہوئے انداز کاروبار اور سود سے پاک معیشت کو دنیا کے اس عالمی بحران کا واحد حل قرار دیا گیا۔ امریکہ میں اس تجویز پر لوگ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ خوف یہ بھی تھا کہ کہیں لوگ اس نظام کی کامیابی کے بعد اسلام کی طرف رجوع نہ کر لیں۔ چند دن پہلے وائس آف امریکہ سے ایک ڈاکومنٹری نشر ہوئی جس میں دکھایا کہ کس طرح لوگ ایک ایسے بینکنگ کے نظام کا دھڑا دھڑ آغاز کر رہے ہیں جو اسلام کے اصولوں کے مطابق ہے۔ لیکن پھر بھی اسے اسلامی نظام نہیں کہتے بلکہ RiskSharing کا نام دیا جا رہا ہے۔ بہت سارے بنک اسے RF بینکنگ کہہ رہے ہیں یعنی ربا فری بینکنگ۔ درہیم یونیورسٹی کے ماہر معیشت دان پروفیسر روڈنی ولسن نے اس بدلتے ہوئے نظام کا احاطہ کرتے ہوئے ان سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک طویل مضمون لکھا ہے کہ پورے مغرب کی معیشت کو صرف اسلام کے اصول معاشیات ہی سہارا دے سکتے ہیں ورنہ یہ ڈوب جائے گی۔ یہ ہوتی ہیں میرے اللہ کی تدبیریں۔ لیکن یہ سب اگر میرے ملک کے دانشوروں اور روشن خیال معاشی عالموں کو بتاؤ تو وہ ہنسیں گے' تمسخر اڑائیں۔ میرا اللہ سورہ بقرہ میں فرماتا ہے۔ اور اللہ ان کی ہنسی اڑاتا ہے اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے"۔ اقبال نے کیا پیش گوئی کی تھی

گیادور سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

کیا وقت آن پہنچا ہے (1)

جو لوگ نشانیوں کو نہیں مانتے‘ علامات پر یقین نہیں کرتے‘ انہیں سے کیا بحث۔ یہ لوگ صرف انہی علامات اور نشانیوں سے نتائج اخذ کرتے ہیں جو ان کے سائنسی محققین اور فلسفہ و تاریخ کے عالم بتاتے ہیں۔ یہ اس بات پر تو یقین کر لیں گے کہ مستقل کھانسی‘ بخار‘ بدن کا ٹوٹنا یا سر کا بھاری ہونا کس بیماری کی علامات ہیں۔ انہیں شدید حبس کے عالم میں بارش کی آمد کی پیش گوئی بھی یاد رہتی ہے۔ یہ تاریخ کے مطالعے سے ایسی دلیلیں بھی دیتے ہیں کہ اگر معاشی بدحالی‘ آمریت‘ بے سکونی اور اضطراب ہو گا تو ملکوں میں کیسی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ ان تمام علامات اور پیش گوئیوں کو ثابت کرنے کے لئے یہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ یہ تمام کی تمام علامات اور نشانیاں عموماً ایک نظریے یا تھیوری کے طور پر پیش کی جاتی ہیں‘ پھر انہیں تاریخ کے دھارے میں پیش آنے والے واقعات کی مثالیں دے کر سچ ثابت کیا جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی میرا اللہ ان کی تمام منطق اور سائنس کو ناکام بناتے ہوئے نتیجہ ویسا نہیں نکالتا جیسا ان کی تھیوری میں درج ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی کسی انتہائی مفلوک الحال اور غریب قوم میں بھی بے چینی اور اضطراب پیدا نہیں ہوتا‘ لوگ ڈکٹیٹر یا آمر سے خوش رہتے ہیں‘ یا پھر تمام علامات ملیریا کی ہونے کے باوجود ٹیسٹ سے ملیریا نہیں نکلتا۔ تو ایسے میں یہ لوگ ایک خوبصورت لفظ بولتے ہیں جسے انگریزی میں Exception یعنی استثناء کہتے ہیں اور پھر ایک اور خوبصورت فقرہ ایجاد کیا گیا ہے کہ استثناء کو قانون پر برتری حاصل نہیں (exceptim does not supercede rule) لیکن کوئی اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ یہ قانون یا رول کو توڑنے والی کوئی ایک بالاتر ہستی بھی موجود ہے جو بار بار نشانیاں دکھا کر یہ ثابت کرتی ہے کہ بے شک یہ دنیا ایک قانون کے طابع چل رہی ہے لیکن میں واحد‘ جبار‘ قہار کسی قانون کا تابع نہیں۔ میں جب چاہے ایسے حالات پیدا کر دوں کہ تمہارا سارا سائنسی علم اس کی توجیہہ کرنے میں ناکام ہو جائے۔ میں کسی بھی علاقے میں ایسے نظام کار کو تلپٹ کر دوں کہ تم بیٹھے بٹھائے سوچتے رہ جاؤ کہ یہ ایسا کیسے ہو گیا۔ میرا اللہ اسباب کا محتاج نہیں۔ وہ خالق اسباب ہے۔ بیمار کو صحت دینے‘ قوموں کو ترقی پر پہنچانے‘ علاقوں کو غرق کرنے‘ نسلوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے وہ جب چاہے‘ جس طرح چاہے اسباب پیدا کر دیتا ہے اور ہم انسان صدیوں تک سوچتے رہتے ہیں کہ ایسے اسباب ہوں گے تو یہ نتیجہ نکلے گا‘ اور پھر اگلی دفعہ نئے اسباب کے ساتھ نئی بیماری‘ نئی تباہی اور نیا امن و سکون کا دور عطا کرتا ہے کہ لو اب میری نشانیوں پر دوبارہ غور کرو۔ ہم نشانیوں پر غور ضرور کرتے ہیں لیکن نشانیاں پیدا کرنے والے پر غور نہیں کرتے۔

ایسی ہی چند نشانیوں پر آج مجھے گفتگو کرنا ہے۔ آج پوری دنیا جس بے چینی و اضطراب میں ہے اور جنگ و جدل کے جس ماحول میں جی رہی ہے‘ جو معاشی طور پر خوش حال ہے وہ ذہنی طور پر سکون و اطمینان کی تلاش میں ہے۔ جو معاشی بدحالی کا شکار ہے اس پر جنگ مسلط ہے‘ بدترین اور ظالم حکمران اسے چین سے جینے نہیں دیتے۔ افراتفری اور بے چینی کا عالم پوری دنیا میں ہے۔ خاندانی نظام کے ٹوٹنے سے جو حال ترقی یافتہ ممالک کا ہوا ہے اس کی بھیانک شکل ان کے بوڑھوں کی کفالت کے اداروں میں ہجوم‘ بغیر خاندان کے بچوں کی نگہداشت کے اداروں میں بڑھتی ہوئی آبادی سے نظر آتی ہے۔ دنیا میں یوں تو نوے فیصد سے زیادہ افیون افغانستان میں کاشت ہوتی ہے لیکن اسی فیصد سے زیادہ اس کے نشئے کا شکار لوگ یورپ اور امریکہ میں ہیں۔ کبھی دنیا میں مرد غلاموں کی تجارت ہوتی تھی۔ اب نوجوان لڑکیوں کی کھیپ کی کھیپ مشرقی ممالک‘ مشرقی یورپ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں سے دنیا کے امیر ممالک میں تعیش کے لئے لائی جاتی ہے۔ جرمنی میں ہونے والے عالمی فٹ بال ٹورنامنٹ میں پچھتر ہزار بچیوں کو لوگوں کی تعیش کے لئے سمگل کیا گیا۔ آبادی کی کمی کے رجحان نے لوگوں کو مانع حمل ادویات کا ایسا چسکا ڈالا کہ دنیا کے 18 ممالک ایسے ہیں کہ جن میں نوجوان اتنے کم ہو گئے ہیں کہ وہاں ان کا سسٹم چلانے کے لئے لوگ میسر نہیں۔ دوسری جانب غربت و افلاس ہے‘ قحط ہے‘ افریقہ کے ممالک میں قحط کا یہ عالم ہے کہ نسلوں کی نسلیں یوں ریگستانوں میں موت کی آغوش میں جا رہی ہیں جیسے کسی متعدی بیماری سے جانور مرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ان ملکوں میں لوگ روٹی کے ایک نوالے کو ترستے ہیں اور دوسری جانب زائد غلے کو خراب ہونے کی وجہ سے سمندر کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ دنیا کے کتنے ممالک ایسے ہیں جہاں مسلسل انسان جنگ کی نذر ہو رہا ہے۔ ملکوں کے درمیان جنگ‘ گروہوں کے درمیان جنگ‘ فرقوں اور مذاہب کے درمیان قتل و غارت‘ سب ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ ان میں حیرت زدہ کرنے والی بات یہ ہے کہ سب کے سب اس بات کی دلیل دیتے ہوئے نہیں تھکتے کہ ہم حق پر ہیں اور ہم دوسرے کا خون درست بہا رہے ہیں۔ صرف گزشتہ دس سال میں عراق اور افغانستان میں انسانوں کا قتل عام گن لیا جائے تو 15 لاکھ سے زیادہ بن جاتا ہے۔ لیکن اب دنیا کے مہذب ترین ملکوں کے مہذب ترین حکمرانوں اور میڈیا کے بہترین دماغوں سے گفتگو کریں تو وہ اس قتل عام کو جائز اور حق پر بتائیں گے۔ یہ دلیل اور منطق آپ کو ہر گروہ اور ہر علاقے میں نظر آئے گی۔ اپنے مقتولین کو حق پر اور دوسروں کے قتل ہونے والوں کو مردود ثابت کیا جائے گا۔ دنیا کی گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ میں ایسا دور نہیں آیا کہ اس کرۂ ارض میں بسنے والے چھ ارب انسانوں کو اس طرح مستقل اور پیہم دھوکہ دیا جا رہا ہو اور قاتل کو جائز اور مقتول کو گناہگار کہا گیا ہو۔ ہمیشہ دنیا مختلف گروہوں میں تقسیم رہی ہے۔ کسی حصے میں حق کی آواز بلند کرنے والے اور اس کا ساتھ دینے والے غالب تھے اور کسی حصے میں جھوٹ اور بد دیانتی کی بنیاد پر ظلم کی انتہا کرنے والے غالب تھے۔ دونوں کی جنگ میں حق کا انتخاب کرنا اس لئے آسان تھا کہ دنیا میں اکیسویں صدی کا کامیاب اور مہلک ہتھیار میڈیا وجود میں نہیں آیا تھا۔ اب اس چھوٹی سکرین پر جس کو چاہے باطل ثابت کرو اور جس کو چاہے حق اور پھر ثابت کرنے کے بعد جس پر چڑھ دوڑو‘ قتل کرو‘ بستیاں تباہ برباد کرو۔ اس پورے دور کو غور سے دیکھئے اور سید الانبیاء کی اس حدیث پر چند لمحوں کے لئے سوچیئے کہ کیا ہم اس دور میں واقعی داخل ہو چکے ہیں۔ ”حضرت انس بن مالک سے روایت ہے‘ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا دجال کے خروج سے پہلے چند سال دھوکہ اور فریب کے ہونگے۔ سچے کو جھوٹا اور جھوٹے کو سچا بنایا جائے گا۔ خیانت کرنے والے کو امانتدار بنا دیا جائے گا اور امانت دار کو خیانت کرنے والا قرار دیا جائے گا اور ان میں رویبضہ بات کریں گے۔ پوچھا گیا رویبضہ کون ہیں۔ فرمایا گھٹیا لوگ (فاسق و فاجر)۔ وہ لوگوں کے اہم معاملات میں بولا کریں گے۔ (مسند احمد‘ مسند ابی لیلی‘ السنن الواردۃ فی ال فتن)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو ایک نظریہ یا تھیوری تصور کر کے غور کریں کہ کیا ہم اس دور میں داخل ہو چکے ہیں۔

(جاری ہے)

کیا وقت آن پہنچا ہے (2)

ہادی برحق کی یہ حدیث جس میں دجال کی آمد سے پہلے چند سالوں کی کیفیت کو واضح کیا گیا ہے اس کی جامعیت یا اگر موجودہ تراکیب کی زبان استعمال کی جائے تو عالمگیریت (Universality) اس قدر مسلم ہے کہ آج کی دنیا میں ہوائی کے جزیرے سے لے کر آسٹریلیا کے قرب وجوار میں آباد علاقوں تک گھوم جایئے' آپ کو رسول اللہ ﷺ کی بات واضح نظر آئے گی کہ یہ سال دھوکہ اور فریب کے ہوں گے۔ اس وقت دنیا میں جو چیز سب سے کمیاب اور نایاب ہے' وہ سچ ہے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے سچ انسان کا ذاتی فعل یا معاشرے کا رویہ ہوتا تھا۔ لیکن آج سچ پر صرف ایک چیز کا غاصبانہ قبضہ ہے اور وہ چیز ہے میڈیا۔ یہ میڈیا پہلے کبھی سو سے زیادہ اداروں کی ملکیت ہوتا تھا۔ ان میں سے کوئی اکا دکا ضمیر کی آواز بلند کر لیتا تھا۔ لیکن گزشتہ پانچ سالوں سے دنیا کا ستانوے فیصد میڈیا تین بڑی کمپنیوں کی ملکیت ہو چکا ہے۔ یہ عمل 1997ء میں شروع کیا گیا اور دس سالوں میں اس ہتھیار کو چند مخصوص ہاتھوں میں مرتکز کر دیا گیا۔ یہ میڈیا کمال کی چیز ہے' جس چیز کو چاہے سچ ثابت کر دے اور جس کو چاہے جھوٹ۔ اس دنیا کے رہن سہن' طرز معاشرت' اخلاقیات سب کی طنابیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ پچیس سال تک خوبصورتی کی علامت عورتوں کا دھان پان ہونا (Size Zero) بتائے' ساری دنیا اس کے پیچھے' پھر اپنے ہی سچ کو تحقیق کے نام پر جھوٹ بتائے اور کہے کہ نہیں مناسب گوشت اور وزن ضروری ہے تو دنیا کا لائف سٹائل بدل جائے۔ رات کے کھانے کی میز پر پانی کی جگہ سافٹ ڈرنک پلا دے' رومال کی جگہ ٹشو پیپرز تھما دے' پوری دنیا کو پولیتھین بیگ کی خوشنمائی سے دلدادہ کرے یا پھر اسے دنیا کے ماحول کے لئے خطرہ قرار دے کر تلف کرنے پر مائل کرے۔ ہم جنس پرستی کو پہلے انسانی حقوق کی بنیاد پر اجاگر کرے اور پھر سائنسی تحقیق کے نام پر کسی انسان میں موروثی اور جبلی طرز احساس کا نام دے کر جائز قرار دے۔ پوری دنیا کا طرز زندگی جس کو بری طرح میڈیا نے جھوٹ' منافقت اور دھوکہ دہی کی بنیاد پر یرغمال بنایا ہوا ہے اس کی مثال گزشتہ پانچ ہزار سال میں نہیں ملتی۔ ہم سوچ ہی نہیں سکتے کہ اس "سچ" کے علاوہ بھی کوئی اور چیز ہو سکتی ہے۔ کیا ہم سوچ سکتے ہیں کہ جمہوریت کے بغیر انسان سکھ کا سانس لے سکتا ہے' کیا ہم تصور کر سکتے ہیں اودھم اور بے ہنگم موسیقی' رقص' فلم اور وہ بھی یا تو سنسنی خیز ہو یا پھر جنسی تلذذ سے بھرپور اس کے بغیر ہماری زندگی میں رنگ آ سکتے ہیں۔ کیا ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات آ سکتی ہے کہ آج سے صرف 80 سال قبل اس دنیا میں پاسپورٹ اور ویزا نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی اور یہ دنیا اسقدر ٹکڑوں میں نہیں بٹی ہوئی تھی۔ آج دنیا کا سب سے بڑا جرم انسانی سمگلنگ ہے۔ خیر یہ تو اس معاشرے کو جھوٹ اور دھوکہ دہی پر قائم کرنے کی اتنی لمبی کہانی ہے کہ اس پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن ایک بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ میڈیا دوا کے نام پر اگر زہر بھی اپنی یرغمال دنیا کو بیچنا چاہے تو کوئی سوال نہیں کرے گا' سب اسے سچ مان لیں گے۔ پولینڈ میں زہریلی ٹوتھ پیسٹ کے ذریعے کیمیائی ہتھیار استعمال کرنے کی صرف ایک مثال نہیں ہے' ہزاروں ایسی خوفناک مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ آپ نے اسی حدیث میں ارشاد فرمایا کہ سچے کو جھوٹا بنایا جائیگا اور جھوٹے کو سچا' خیانت کرنے والے کو امانت دار اور امانت دار کو خائن بنا دیا جائیگا۔ اب اپنے اردگرد پھیلی ٹیلی ویژن سکرینوں اور پرنٹ میڈیا کے پلندوں کو اٹھائیں اور دیکھیں کہ کس طرح جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا جاتا ہے' دنیا میں عام آدمی سمجھ رہا ہوتا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں لیکن وہ اس چکا چوند میں گم ہو جاتا ہے' اسرائیل اپنے دفاع کے لئے فلسطینیوں کے شیر خوار بچے مارتا ہے۔ کشمیر میں ایک لاکھ دراندازتھے جو فوج نے قتل کر دیئے' عراق کے پاس کیمیائی ہتھیار ہیں اور حملہ جائز اور پھر گیارہ لاکھ لوگوں کا قتل۔ افغانستان جہاں نہ ٹیلیفون ہے اور نہ کمپیوٹر' ریلوے لائن تک نہیں' وہاں سے لوگ ورلڈ ٹریڈ سنٹر تباہ کرنے نکلتے ہیں اور اس تماشے کو دنیا کے چھ ارب لوگ میڈیا پر دیکھتے ہیں۔ اسے سچ مانتے ہیں اور کچے گھروں میں رہنے والے طالبان پر حملے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے جب ویت نام پر حملہ کیا گیا تھا تو دنیا بھر میں اسے ظلم کہنے والوں کی' سچ بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ دنیا کا کتنا بڑا ادب اس مزاحمت کی بنیاد پر تحریر ہوا۔ آدھی سے زیادہ دنیا اس سچ کو جھوٹ کہتی تھی کہ امریکہ نے وہاں کے لوگوں کی حفاظت کے لئے قدم اٹھایا۔ یہی حال روس کے افغانستان میں قبضے کے وقت تھا۔ دنیا کی کثیر تعداد اس بات کو تسلیم نہیں کرتی تھی کہ روس نے افغانستان میں امن قائم کرنے کے لئے فوج بھیجی ہے۔ لیکن آج آپ کو سچ بولنے والا یا سچ کا ساتھ دینے والا خال خال نظر آئے گا۔ جو ایسا کرے گا اسے یہ میڈیا دہشت گردوں کا ساتھی' دقیانوسی ملا' رجعت پسند اور جھوٹا ثابت کر دے گا اور سوائے ان لوگوں کے جو واقعی سچ کو سچ سمجھتے ہیں کوئی اس کی حمایت میں بولنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ تین کمپنیوں کے ہاتھ میں آیا ہوا ستانوے فیصد میڈیا دجال کی آمد سے پہلے حالت کو اس کی راہ میں ہموار کرتا چلا جا رہا ہے اور میرے ہادی برحق ﷺ کی وہ پیش گوئی یوں لگتا ہے حرف بہ حرف ثابت ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

تحقیق کے بنیادی اصول میں پہلا یہ ہے کہ کسی ایک تھیوری کو مفروضہ تصور کیا جاتا ہے۔ پھر اسے حالات و واقعات کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اگر یہ مفروضہ سچ ثابت ہو جائے تو وہ تھیوری ایک سچائی کا روپ دھار لیتی ہے جسے تحقیق کی زبان میں حقائق یا Fect کہا جاتا ہے۔ سید الانبیاء ﷺ کی اس حدیث کو آج کے دور کے کسی ملک' علاقے یا براعظم پر رکھ کر پرکھیں' آپ کو یہ روز روشن کی طرح عیاں نظر آئے گا کہ یہ دجال کی آمد سے پہلے کے وہ چند سال ہیں جن میں دھوکہ وفریب عام ہے۔

تحقیق کا کلیہ تو یہ ہے کہ اگر ایک بنیادی اصول درست ثابت ہو جائے تو پھر باقی تھیوری کو قابل اعتبار گردانا جاتا ہے۔ مجھے تو سید الانبیاء ﷺ کی ہر بات پر کامل یقین اور ایمان ہے کہ میرے نزدیک ان میں شک بھی عین کفر ہے۔ لیکن موجودہ میڈیا کے ڈسے ہوئے عقلیت پسند افراد خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں انہیں اسی زبان اور طریق کار میں بتانا پڑ رہا ہے جس میں میڈیا نے ان کی تربیت کی ہے۔ سروے ہے' ریسرچ ہے' "فیکٹ فائنڈنگ" ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کی اس حدیث کے بعد ان چند سالوں کی تفصیلات کا ذکر ضروری ہے جو آپ نے اپنے دوسرے ارشادات میں بتائی ہیں۔ کیا ہونے والا ہے' یہ دنیا کس موڑ پر جا نکلے گی' کون کس کے خلاف جنگ کر رہا ہوگا۔ ایمان کیسے سلامت رہے گا۔ کون ہادی اور رہنما بن کر اہل ایمان کی قیادت کرے گا۔ کس سرزمین سے لوگ فتح و نصرت کی نوید بن کر نکلیں گے اور میرا خطہ' میرا پاکستان اس کا کیا کردار ہوگا۔ وہ سرزمین جس سے میرے رسول ﷺ کو ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔ جس کے بارے میں آپ ﷺ نے کیا خوبصورت اور محبت بھرا جملہ ارشاد کیا کہ "میں عرب ہوں لیکن عرب مجھ میں نہیں' میں ہندی نہیں لیکن ہند مجھ میں ہے"۔ میرے رسول ﷺ کی اُمیدوں کے اس مرکز نے دجال کی آمد سے پہلے کیسے سنورنا ہے' تیار ہونا ہے اور سچ اور جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنا ہے۔ (جاری ہے)

کیا وقت آن پہنچا ہے (3)

رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق دجال کی آمد سے پہلے چند سال جو دھوکہ اور فریب کے ہوں گے' آج کی دنیا پر بہت حد تک منطبق ہوتے ہیں۔ اس دھوکہ اور فریب کی گاڑی میڈیا کے زور سے چلتی ہے جو دجالی قوتوں کو آنے والے وقت کے لئے اکٹھا اور ایک ایجنڈے پر متفق کر رہا ہے۔ اس ایجنڈے کی اجمالی صورتِ حال سید الانبیاء علیہ ﷺ کی اس حدیث سے اور آج کی قتل و غارت سے واضح ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا "علماء پر ضرور ایسا زمانہ آئے گا کہ ان کو ایسے قتل کیا جائے گا جیسے چوروں کو قتل کیا جاتا ہے (ال تقریب المیزان)۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا "علماء پر ایسا زمانہ ضرور آئے گا جب ان کی موت سرخ سونے سے بھی زیادہ محبوب ہو گی (مستدرک حاکم)۔ اس وقت چاروں جانب نظر دوڑائیں اور عالمی میڈیا سے لے کر اپنے وطن تک کسی بھی اخبار' رسالے یا ٹی وی کی سکرین پر نظر دوڑائیں تو آپ کو نفرت کی علامت صرف اور صرف ایسے لوگوں کو بنا کر دکھایا جائے گا جن کے چہرے اور حلیے کبھی دینداری اور نیک نامی کی علامت ہوا کرتے تھے۔ پولیس کی چیک پوسٹوں سے لے کر دنیا بھر کے ہوائی اڈوں' اہم عمارتوں اور سرحدوں پر بدمعاش' شرابی اور اوباش حلیے والے شخص کو نہیں روکا جاتا بلکہ جس شخص کی شکل و صورت کل تک اللہ سے تعلق کی وجہ سے پہچانی جاتی تھی' اسے چور' ڈاکو یا دہشت گرد کی طرح ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گزشتہ دس سال کے دوران مرنے والے 15 لاکھ کے قریب لوگوں کی فہرست بنائی جائے' جو عراق اور افغانستان کی جنگ میں شہید ہوئے تو ان میں آپ کو کوئی شراب کی دکان چلانے والا' جوئے کے اڈے کا مالک' عورتوں کا کاروبار کرنے والا' ظلم و زیادتی سے بھتہ وصول کرنے والا' زبردستی عورتوں اور بچوں کے ساتھ زیادتی کرنے والا' منشیات کا عالمی سمگلر نظر نہیں آئے گا بلکہ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کے دن اور راتیں اللہ کے خوف میں گزرتی تھیں اور جن کا اللہ کی ذات پر توکل قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں جیسا تھا کہ تمام دنیا اپنے مادی اسباب کے ساتھ بھی ان پر ٹوٹ پڑے تو وہ نہتے کلمۂ حق بلند کریں۔ یہ سارے پندرہ لاکھ لوگ نہ القاعدہ تھے' نہ طالبان اور نہ دہشت گرد لیکن یہ سب کے سب چوروں' ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کی طرح مار دیئے گئے اور آج پوری دنیا میں ان کے حق میں کوئی کلمۂ خیر بلند کرے تو آوازیں اٹھتی ہیں کہ یہ دہشت گردوں کا ساتھی ہے' طالبان ہے' القاعدہ ہے۔ یوں میرے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق ہم اس زمانے میں جی رہے ہیں جو دھوکہ اور فریب کا ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے اور اس کے دین کا علم رکھنے والے لوگ چوروں کی طرح قتل ہو رہے ہیں۔

لیکن اس زمانے میں اور دجال کی آمد سے قبل دونوں جانب تیاریوں کا عمل جاری رہے گا۔ دجال کی حامی قوتیں اس کے نظام کو مستحکم کرتی جائیں گی کہ جب اس کا خروج ہو تو وہ اسی بنے بنائے نظام کے ذریعے دنیا میں اپنے ایجنڈے کو نافذ کرے اور دوسری جانب میرا اللہ اس نظام کے مقابل مدافعتی اور مزاحمتی قوتوں کو مستحکم کرتا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں نظاموں کی تیاریوں کے بارے میں واضح کیا۔ آپؐ نے فرمایا "جب لوگ دو خیموں میں تقسیم ہو جائیں گے...... ایک اہل ایمان کا خیمہ جس میں نفاق بالکل نہیں ہو گا...... دوسرا منافقین کا خیمہ جس میں ایمان بالکل نہیں ہو گا۔ اور جب ایمان والے ایک طرف اور منافقین دوسری طرف اکٹھے ہو جائیں تو تم دجال کا انتظار کرو کہ آج آئے یا کل" (ابو داؤد' مستدرک' الفتن نعیم بن حماد) اب آئیں دیکھیں کہ ایمان والوں کا خیمہ کہاں ہے' وہ کون سی سرزمین ہے جس کے بارے میں کہا گیا کہ وہاں سے سرفروش نکلیں گے اور دجال کی قوت کا مقابلہ کریں گے۔ جو سیدنا امام مہدی کے لشکر کے سپاہی ہوں گے۔ اس علاقے کو میرے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ فرمایا "جب کالے جھنڈے مشرق سے نکلیں گے تو ان کو کوئی چیز نہیں روک سکے گی حتیٰ کہ وہ ایلیا (بیت المقدس) میں نصب کر دیئے جائیں گے (مسند احمد' ترمذی) پھر وضاحت کر کے فرمایا "جب تم دیکھو کالے جھنڈے خراسان کی طرف سے آئے ہیں تو ان میں شامل ہو جانا کہ ان میں اللہ کے خلیفہ مہدی ہوں گے (مسند احمد' مشکوۃ) حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ خوش قسمت ہے طالقان کہ اس میں اللہ کے خزانے ہیں لیکن یہ خزانے سونے چاندی کی صورت نہیں بلکہ ایسے مردانِ کار ہوں گے جو اللہ کو پہچانیں گے جیسے پہچاننے کا حق ہوتا ہے اور وہ مہدی آخرالزماں کے مددگار ہوں گے (کنزل العمال) حضرت علیؓ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک اور قریبی علاقے کی نشاندہی کی گئی۔ آپؐ نے فرمایا "ایک شخص ماوراء النہر سے چلے گا' اسے حارث (کسان) نام سے پکارا جاتا ہو گا۔ اس کے لشکر کے اگلے حصے پر مامور شخص کا نام منصور ہو گا جو آلِ محمد کے لئے راہ ہموار یا مضبوط کرے گا (ابو داؤد)

یہ تینوں علاقے خراسان' طالقان اور ماوراء النہر کہاں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خراسان کی حدود دریائے ایمو سے لے کر دریائے سندھ تک تھیں جن میں افغانستان' سرحد کا علاقہ اور پاکستان کا مغربی اور جنوبی حصہ شامل ہیں جبکہ ایران کا صوبہ سیستان بلوچستان بھی خراسان میں تھا۔ طالقان خالصتاً پشتون سرزمین ہے۔ ماوراء النہر وہ علاقہ ہے جس میں ازبکستان' تاجکستان' ترکمانستان' آذربائیجان اور چیچنیا شامل ہیں۔ اہل ایمان کے خیمے کی حدود سے اب خود اندازہ لگایئے کہ آزمائش کے دن کن کے حصے میں آئے ہیں۔ کون لوگ ہیں جنہیں میرا اللہ بھٹی میں ڈال کر کندن بنا رہا ہے۔ دنیا میں کسی بھی فوجی تربیت کی کتاب اٹھائیں یا کسی فوجی تربیت گاہ کا جائزہ لیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ کیسے کیسے سخت جان مرحلوں سے ان سپاہیوں کو گزارا جاتا ہے جنہوں نے دشمن کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ پھر وہ لوگ جنہوں نے اس دنیا کی پیدائش سے لے کر اختتام تک کے عرصے کی سب سے بڑی جنگ لڑنی ہو کیونکہ میرے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں جس نے لوگوں کو دجال کے فتنے سے نہ ڈرایا ہو۔ آپؐ خود ہر نماز کے بعد دجال سے پناہ کی دعا کیا کرتے تھے۔ ایسی جنگ میں لڑنے والوں کی ایسی ہی ٹریننگ کی جاتی ہے۔ ایسی ہی مشقت کی بھٹی سے گزارا جاتا ہے جس سے آج یہ سارے کے سارے علاقے کے افراد گزر رہے ہیں۔

کبھی کبھی میں اس بے آب و گیاہ اور وسائل سے محروم علاقے کے افراد کو دیکھتا ہوں۔ ان کی سادہ لوحی اور معصومیت کا جائزہ لیتا ہوں تو حیرت میں ڈوب جاتا ہوں کہ اللہ ایسے لوگوں کو اعلیٰ دنیا کی بہترین ٹیکنالوجی سے مالامال طاقتوں پر فتح نصیب کرتا ہے۔ سادگی کا یہ عالم ہے کہ طالبان کے ایک اہم وزیر نے ایک بہت اہم شخصیت کو امریکہ سے مذاکرات کی جو شرائط بتائیں ان سے ان کی سادگی جھلکتی ہے۔ یہ شرائط جب وہ اہم شخصیت مجھے سنا رہی تھی تو وہ خود بھی ان کی سادگی پر مسکراتی تھی۔ شرائط تھیں کہ ہماری امارت اسلامی افغانستان کو تسلیم کیا جائے' ہماری امارت اسلامی کو پوری مسلم امہ کی خلافت تسلیم کیا جائے' ہمیں سکیورٹی کونسل میں ویٹو کا حق دیا جائے اور ہمیں ایٹمی طاقت بھی تسلیم کیا جائے۔ یہ سادگی اور معصومیت اور امریکہ جیسی طاقت اور اس کے حواری 48 ملک خوف سے کانپ رہے ہیں۔ نیوز ویک کے تازہ شمارے میں اس نے طالبان کے کمانڈروں سے جو انٹرویو درج کئے ہیں حیران کن ہیں۔ اس نے سوال کیا کہ کب تک جنگ لڑو گے۔ جواب دیا کوئی وقت مقرر نہیں' میں نہیں تو میرا بیٹا' وہ نہ رہے تو اس کا بیٹا' ایسی جنگ کا مغرب میں کوئی تصور تک نہیں۔ ٹانگ کٹ جاتی ہے تو لنگڑاتے ہوئے مورچے میں چلے جاتے ہیں لیکن ایک فقرہ کمال کا ہے جو ان سرفروشوں نے امریکی میڈیا کے افراد کو کہا ہے کہ تمہارے پاس گھڑیاں ہیں لیکن ہمارے پاس وقت ہے۔

(جاری ہے)

نوٹ: گزشتہ کالم میں ایک حدیث مبارک درج کی تھی۔ میں عرب ہوں لیکن عرب مجھ میں نہیں۔ میں ہند نہیں لیکن ہند مجھ میں ہے۔ اس حدیث کو عبدالحمید صدیقی صاحب نے طبرانی اور اوسط کے حوالے سے درج کیا ہے۔

کیا وقت آن پہنچا ہے (آخری قسط)

اہل ایمان اور اہل نفاق کے خیموں کی ترتیب کا عمل کافی عرصے سے جاری ہے۔ جب کسی بڑے معرکے سے پہلے صف بندی کی جاتی ہے تو صفوں میں کسی ایسے فرد کی گنجائش نہیں رکھی جاتی کہ جس کا دل' دماغ یا خیالات دشمن کے قبضے میں ہوں۔ ایسے لوگوں کو بھی اپنی صفوں سے نکال دیا جاتا ہے جو دشمن کے نظام یا اس کے طرز زندگی سے مرعوب ہوں۔ مرعوبیت ایک ایسا عیب ہے جو قوموں کو ناکارہ بناتا ہے۔ اسی لیے کوئی بھی جنگ ہو' جدو جہد ہو' یا پھر کسی بھی میدان میں ترقی اور جستجو کی خواہش ہو' سب سے پہلا درس یہ دیا جاتا ہے کہ ہم اس راہ پر نکلنے والے ہیں اس لئے ہم میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو اسے فتح اور کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہیں۔ مسلم امہ میں گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے صرف اور صرف ایک مرض کا بیج بویا گیا ہے اور وہ یہ کہ تم مغرب کی تہذیب' علم اور ٹیکنالوجی سے کم تر ہو۔ جب یہ گفتگو اور بحث ڈیڑھ سو سال پہلے شروع کی گئی تھی تو اس وقت دونوں تہذیبوں میں زیادہ فرق نہ تھا۔ کسی میدان میں مسلمان بہتر تھے اور کسی میدان میں مغرب۔ ایسے میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس زوال پذیر معاشرے کو اعتماد دیا جاتا اور اسے اپنے شاندار ماضی کی طرف لوٹ جانے اور اسی مقام پر واپس آنے کیلئے تیار کیا جاتا لیکن اس وقت کے ذہنوں میں کمتری اور مرعوبیت کا ایسا زہر سرایت کیا گیا کہ یہ آج تک اعتماد کی حالت میں واپس نہ آ سکی۔ یہ زہر میری امت کے اپنے صاحبان علم نے سخت محنت اور تگ و دو سے بویا اور آج ہم سب سمجھتے ہیں کہ نہ ہم علم میں آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ ٹیکنالوجی میں۔ اور جنگ تو ہم ان سے کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ یہ کمتری اور مرعوبیت نفاق کو جنم دیتی ہے۔ دجال کی آمد سے پہلے امت مسلمہ کے خیمے سے نفاق کا خاتمہ ہونا ہے۔

نفاق کے خاتمے کی ترتیب میرے پیارے رسولؐ کی احادیث سے واضح ہوتی ہے اور جو واقعات اب ظہور پذیر ہو رہے ہیں وہ بھی اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ دجال کی آمد سے پہلے سیدنا مہدی کے ہراول دستے خراسان اور طالقان کے علاقے میں جس طرح ٹیکنالوجی' معاشیات اور جنگی برتری کو ذلت آمیز شکست ہو رہی ہے وہ اس ہراول دستے کے دل سے اس خوف' مرعوبیت اور احساس کمتری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ یہ وہ علاقہ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا۔ "جب تم دیکھو کہ کالے جھنڈے خراسان کی طرف سے آئے ہیں تو ان میں شامل ہو جانا کیونکہ ان میں اللہ کا خلیفہ مہدی ہے (مشکوۃ)۔ اور اس لشکر کے راستے میں ہر رکاوٹ تہہ و بالا ہو جائے گی اور وہ اپنا پرچم بیت المقدس میں نصب کر دیں گے۔ سیدنا مہدی کے مقابلے میں جو پہلا لشکر نکلے گا وہ کفار یا مغرب کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا ہوگا۔ یہ لشکر شام کے علاقے میں منظم ہوگا۔ میرے پیارے رسولؐ نے تمام شک و شبہ سے پاک کرنے کے لئے سیدنا مہدی کا حلیہ' نام و نسب سب واضح کر دیا ہے۔ بلکہ ان کے پہچاننے والوں کے خصائص اور مقام بھی بتا دیئے ہیں۔ اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ سیدنا مہدی از خود کوئی دعویٰ نہیں کریں گے۔ بلکہ لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہیں گے تو وہ چھپ جائیں گے' پھر وہ مسلمانوں کے ان صاحبان نظر کے ہاتھوں مجبور ہو کر خانہ کعبہ میں بیعت لیں گے۔ اور پوری امت میں سے صرف تین سو تیرہ افراد ان کی بیعت کریں گے۔ دوسری جانب مسلمانوں کا ہی ایک لشکر ان کے خلاف شام میں جمع ہوگا' عراق پر قبضہ کرے گا' یہاں تک کہ مدینہ پر بھی قابض ہو گا۔ ایسے میں سیدنا مہدی کے حق میں نصرت کے لیے لشکر روانہ ہوں گے۔ یہاں اللہ کی مدد ویسے ہی شامل حال ہو گی جیسے افغانستان میں امریکہ کی شکست سے آج نظر آ رہی ہے۔ جب مخالف مسلمانوں کا لشکر امام مہدی سے مقابلے کے لئے مکہ کی جانب روانہ ہو گا تو مقام بیضا بھی زمین میں دھنسا دیا جائے گا اور فتح و نصرت سے ہمکنار امام مہدی شام میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کریں گے۔ یہاں ایک حدیث بہت اہم ہے۔ رسول ﷺ نے فرمایا۔ مہدی میرے اہل بیت سے ہو گا اور اللہ تعالیٰ ایک ہی رات میں ان کو یہ صلاحیت عطا فرما دے گا (ابن ماجہ' مسند احمد)۔ یعنی جہانبانی اور حکومت کرنے کے وہ تمام امور اللہ ان کو خود عطا کر دے گا کیونکہ آگے مقابلہ منظم قوتوں سے ہونا ہو گا۔

ان تمام واقعات کے تناظر میں جب میں سوچتا ہوں کہ مسلمانوں کے ساٹھ سے زیادہ ممالک میں بہت سے ایسے ہیں جو بے پناہ دولت سے مالا مال ہیں' کتنے ایسے ہیں جو علم اور ٹیکنالوجی کے حساب سے بھی مغرب کے ہم پلہ ہو چکے ہیں جیسے ترکی' کتنے ایسے ہیں جو معاشیات میں مغرب کو شکست دینے کے لئے معاشیات کے میدان میں آگے ہیں جیسے ملائشیا' تیل کی دولت سے مالا مال لوگ' ان سب میں پاکستان کی حیثیت ایسی کبھی نہ تھی کہ وہ ساٹھ سے ستر ارب ڈالر کا ایٹمی پروگرام اختیار کر سکے۔ یہاں تو غربت و افلاس کے ڈیرے تھے' یونیورسٹیوں کا زوال تھا اور بددیانتی کا راج۔ پھر میرے اللہ نے یہ سعادت کیوں عطا کی۔ جنگ عظیم دوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے' اس کا پانسہ صرف اور صرف امریکہ کی ایٹمی قوت ہونے نے بدلا۔ جاپان اس وقت دنیا کی مضبوط ترین معاشی قوت ہے۔ اقوام متحدہ کا تیس فیصد کے قریب خرچہ اٹھاتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود جاپان نہ سکیورٹی کونسل کا مستقل رکن ہے اور نہ ہی اسے ویٹو کا حق حاصل ہے۔ اس کی حیثیت اس تاجر کی ہے جس سے محلے کا غنڈہ جب اور جس وقت چاہے وصول کرتا ہے اور جاپان یہ بھتہ ہر جنگ میں' ہر موقع پر امریکہ اور اس کے حواریوں کو دیتا آیا ہے۔ بھتہ پاکستان جیسے ایٹمی پروگرام کو تیل کی دولت سے مالا مال ممالک صرف اپنے ایک فیصد بجٹ سے بنا سکتے تھے لیکن ایسی صلاحیت تو ہراول دستے کے پاس ہونی چاہیے تھی تاکہ ان کے ساتھ جن سے اس ہراول دستے نے جنگ کرنا ہے مقابلہ کر سکے۔ سیدنا امام مہدی جب ایک جانب دنیا بھر کی طاقتوں کے خلاف برسرپیکار ہوں گے' دوسری جانب مسلمانوں کی ایک جماعت ہند یعنی ہندوستان سے جنگ میں مصروف ہو گی۔ ہادی برحق ﷺ نے فرمایا "میری امت میں دو جماعتیں ایسی ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ سے محفوظ کر دیا۔ ایک وہ جو ہندوستان سے جہاد کرے گی اور ایک وہ جو عیسیٰ ابن مریم کے ساتھ ہو گی (نسائی' مسند احمد)۔ ایک دوسری حدیث میں اس جہاد کا وقت بھی متعین کر دیا۔ "تمہارا ایک لشکر ہندوستان سے جہاد کرے گا' جس کو اللہ فتح نصیب کرے گا۔ اللہ اس لشکر کے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ پھر جب یہ لوگ واپس لوٹیں گے تو شام میں عیسیٰ ابن مریم کو پائیں گے۔ یہ بشارت اس جنگ کے لئے جب سیدنا امام مہدی مسلم امہ کو اکٹھا کر کے منظم کر چکے ہوں گے اور دنیا بھر کی طاقتیں ان کے خلاف جنگ میں مصروف ہوں گی۔ ایسے میں ہندوستان وہ مقام ہے جہاں سے عقب سے مسلمانوں کی اس اجتماعی طاقت پر وار ہو سکتا ہے۔ آج کے ہندوستان کی تمام تر منصوبہ بندی اور اس کی سرمایہ کاری اس ملک میں ہے جسے خراسان یعنی میرے پیارے رسول ﷺ کی بشارت کے مطابق سیدنا مہدی کے ہر اول دستے کا حصہ کہا گیا ہے۔

دونوں جانب تیاریوں کا زور شور ہے۔ دونوں قوتیں اپنے اپنے دستوں کی صف بندی کر رہی ہیں۔ جہاں میرا اللہ اپنے ساتھیوں جسے وہ حزب اللہ یعنی اللہ کا گروہ فرماتا ہے' ان کے لئے امکانی معرکے کے لئے ساز و سامان مہیا کر رہا ہے اور انہیں نفاق سے دور کر رہا ہے۔ اور ان کے خیموں میں خالص لوگوں کو جمع کر دیا ہے وہاں دوسرا گروہ جسے اللہ حزب الشیاطین' یعنی شیطان کا گروہ کہتے ہیں' وہ بھی اپنے طور پر منظم ہو رہے ہیں۔ دونوں گروہوں کے معرکوں میں جب مسلمانوں کے غلبے کا عالم آئے گا۔ جب یہ ایک امت واحد کی طرح مسلم ہو جائیں تو پھر دجال خروج کرے گا۔ یہاں سے اس معرکے کا آغاز ہو گا جس کی آمد کے بارے میں ہر نبی نے اپنی امت کو خبر دی۔ یہ سب کب ہے' کتنی دیر ہے' اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ لیکن میرے پیارے رسول ﷺ کے ارشادات کے مطابق اور علامتوں سے جانتے ہوئے یوں لگتا ہے ہم اس دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہم سیدنا مہدی کا ظہور دیکھ پاتے ہیں یا نہیں لیکن اس راستے پر چلنے والوں کو بھی اللہ یقیناً اسی راستے کا مسافر تصور کرے گا اور جنہیں وہ زمانہ نصیب ہو گیا اور وہ حق پر قائم رہے تو ان پر تو رشک ہی کیا جا سکتا ہے۔

(ختم شد)

دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں

ڈرے ڈرے سہمے سہمے' مفادات کی سولی پر لٹکے ہوئے لوگ اگر اکٹھے بھی ہو جائیں تو ان سے غیرت و حمیت اور عزت و وقار کی گفتگو کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ ایسے ہی مشترکہ اعلامیے سامنے آیا کرتے ہیں اور ایسی ہی زبان میں آقاؤں سے گفتگو کی جاتی ہے۔ آپ ہمارے مہربان ہیں۔ ہم امن سے رہنا چاہتے ہیں' ہم پر الزامات کیوں لگاتے ہو' ہم نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔ اگر آقا ناراض ہو جائے تو پھر ایک دوسرے پر الزامات لگائے جاتے ہیں۔ "کچھ تو تم نے کیا ہوگا جو مائی باپ اتنا سخت ناراض ہو گیا ہے" "میں جانتا ہوں تمہاری غلطیوں کی وجہ سے آج ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی۔ "عزت" کی دال روٹی چلتی تھی۔ بچوں کی تعلیم بھی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں ہو رہی تھی' نوکریاں بھی مل رہی تھیں' وہاں گھر اور کاروبار بھی تھے۔ کیا ضرورت تھی پنگے لینے کی"۔ سب برباد کر دیا۔ دس سال لگتے ہیں آقا کو راضی کرنے میں' لوگوں کی باتیں سنتے ہیں' گلی گلی محلے محلے بے غیرت کہلواتے ہیں' ان کی سو برداشت کرتے ہیں اور خود ایک بھی نہیں کہتے' پھر کہیں جا کر آقا تھوڑا سا خوش ہوتا ہے اور ایک تم لوگ ہو کہ ہماری ساری محنت پر پانی پھیر دیتے ہو۔ کیا ملتا ہے تمہیں۔ اس ملک کو تباہ کرنا چاہتے ہو۔ ستیاناس کر دیا ہے تم نے اس کا۔

یہ زبان اور یہ گفتگو میرے ملک میں وہ لوگ کرتے پھرتے ہیں جن کی ایک پائی' ایک انچ زمین' ایک اولاد یا کوئی ایک مفاد بھی اس ملک سے وابستہ نہیں۔ ان کی زمینیں اور کاروبار بنک کے قرضوں کے آگے رہن ہیں اور قرضے اس پیسے سے ہیں جو میرے ملک کے غریب لوگوں کے خون پسینے کی کمائی کی بچت ہے۔ ان کی اولادیں آقاؤں کے دیس میں محفوظ زندگی گزار رہی ہیں۔ دن حصول زر میں اور رات حصول عیش میں گزارتی ہیں۔ ان کے کاروبار اس ملک سے باہر ہیں اور جو یہاں ہیں ان میں سارا سرمایہ اس ملک کے عوام کی بچت کا ہے جو بینکوں میں پڑی تھی۔ ان کی جلد خراب ہو جائے' سانس میں تکلیف ہو' دل دغا دے جائے' گردے کام کرنے سے انکار کر دیں' یہ میرے ملک کے عام آدمی کے ساتھ ہسپتالوں میں لیٹنا پسند نہیں کرتے۔ انہیں ان بستروں' کمروں' ڈاکٹروں' نرسوں اور آوزاروں سے بو آتی ہے۔ ان کا معمولی سے معمولی چیک اپ بھی آقا کے دیس کے ہسپتالوں میں ہوتا ہے۔ صرف اس ملک کے محکمہ صحت کے ان بلوں کا ریکارڈ لوگوں کے سامنے ٹیلی ویژن سکرینوں پر چلا دیا جائے جو ان کے بیرون ملک صحت کی مد میں اس غریب قوم نے ادا کیے ہیں تو لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔ اب تو وہ اس سے بھی بے نیاز ہو گئے ہیں۔ اس قدر کماؤ کہ سرکار سے بل لینے کی حاجت ہی باقی نہ رہے۔ ان سب لوگوں کی حالت اس غلیظ لطیفے کی طرح ہے جسے میں شرافت کا لبادہ اوڑھا کر پیش کر رہا ہوں۔ ایک تھانیدار کی ایک مسکین مراثی کی بیوی پر بری نظر تھی۔ مراثی بیچارہ ڈرا ڈرا سہما سہما کوشش کرتا کہ بیوی کا کہیں تھانیدار سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ بیوی کو دیکھتا تو اس پر غصہ آتا کہ اگر یہ میرے گھر نہ ہوتی تو میں چین سے ہوتا۔ تھانیدار خوامخواہ مجھ پر برستا رہتا ہے' بے وجہ بلا کر ڈانٹتا ہے۔ ایک دن مراثی گھر آیا تو بیوی نے خوشی کے ساتھ اور فخر کے لہجے میں اسے بتایا کہ آج تھانیدار بری نیت کے ساتھ گھر آیا تھا۔ میں فوراً بھانپ گئی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھٹکھٹایا' میں نے تھوڑا سا کھولا' اس نے زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کی۔ میں جیسی بھی ایک کمزور عورت تھی لیکن میں نے اپنے حواس مجتمع کر کے پوری قوت کے ساتھ دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دی اور اس کو باہر دھکیل دیا۔ مراثی غور سے بیوی کی باتیں سنتا رہا اور اس کی آنکھوں میں تھانیدار کا غصیلا چہرہ گھومنے لگا۔ اس نے چشم تصور میں تھانیدار کے غیظ و غضب کا اندازہ کر لیا تھا۔ بیوی نے واقعہ سنا کر داد طلب نظروں سے خاوند کی طرف دیکھا۔ اس نے زور سے ایک تھپڑ بیوی کے منہ پر مارا اور کہا' بے شرم' مروا دیتی آج تم' اگر دروازہ بند کرتے ہوئے تھانیدار کا ہاتھ اس میں آکر زخمی ہو جاتا تو ہم دونوں پر پرچہ ہو جانا تھا۔

غیرت و حمیت اور عزت و وقار کا تعلق نہ دولت اور وسائل پر ہے اور نہ ہی غربت و افلاس سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔ یہ کبھی غریب سے غریب اور مفلوک الحال سے بھی کمتر شخص کی زینت بن جاتی ہے اور کبھی صاحب ثروت و دولت کے گھر سے بھی غائب ہو جاتی ہے لیکن تاریخ بہت ظالم ہے۔ اس نے آج تک کسی ایسے شخص' ایسی قوم یا ایسے رہنما کا نام اپنے اوراق میں عزت اور وقار سے محفوظ ہی نہیں رکھا جس نے عیش و آرام اور دولت و ثروت کو عزت و وقار پر ترجیح دی تھی۔ ایسا ہی ایک موقع اسرائیل پر بھی آیا تھا۔ اس وقت وہاں گولڈا میئر وزیر اعظم تھی۔ اسرائیل کی پارلیمنٹ نے اسرائیل کے دفاع کے لئے اسلحہ خریدنے کی ایک کوشش کی مذمت کر دی تھی۔ اور کہا تھا کہ ہمارے معاشی حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم اپنے دفاع کر اس قدر خرچ کریں۔ دوسری جانب گولڈا میئر اسلحہ کمپنیوں سے مذاکرات کر رہی تھی اور اس نے فیصلہ پارلیمنٹ کے خلاف کیا تھا جس کے بعد اسرائیل نے پوری عرب دنیا کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ گولڈا میئر سے ایک صحافی نے اس فیصلے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا' میں بہت دیر سوچتی رہی اور پھر اس نتیجے پر پہنچی کہ تاریخ کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ کسی قوم کے افراد صبح ناشتے میں انڈہ کھاتے یا توس پر جام لگاتے ہیں یا نہیں۔ تاریخ تو صرف غیرت مند اور بے غیرت یا پھر فاتح اور مفتوح میں تمیز کرتی ہے۔ گولڈا میئر نے کہا کہ میں نے یہ سبق مسلمانوں کے پیغمبر سید الانبیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے سیکھا۔ آپ کا جب وصال ہوا تو گھر میں چراغ میں ڈالنے کے لئے تیل نہیں تھا اور سیدہ عائشہ نے پڑوس سے تیل ادھار مانگ کر چراغ روشن کیا تھا' لیکن آپؐ کے ترکے میں آٹھ تلواریں تھیں۔

قوموں کی تاریخ میں جب عذاب کی رت آنے لگتی ہے اور ان کے اعمال کی سزا کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو میرا اللہ یہ فرماتا ہے "اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ پھر وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں۔ تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے' پھر اسی بستی کو تباہ اور غارت کر ڈالتے ہیں (بنی اسرائیل: 16)۔ جب فیصلے صادر ہو جائیں۔ جب تقدیر کی کہانی کچھ اور تصویر دکھا رہی ہو تو پھر سب کے سب اکٹھے بھی ہو جائیں تو غیرت کی ایک بوند بھی برآمد نہیں ہو سکتی۔ کیا ان کا لہجہ وہی تھا جو میرے ملک کے گلی کوچوں میں 18 کروڑ عوام کا لہجہ تھا۔ ہرگز نہیں۔ 18 کروڑ عوام کا لہجہ غیرت کا لہجہ ہے' عزت و وقار سے جینے اور غیرت و حمیت سے مرنے کا لہجہ ہے۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ 18 کروڑ کے پاس کھونے کے لئے اب کچھ باقی نہیں ہے اور ان رہنماؤں کے پاس کھونے کے لئے تو صرف سوئٹزر لینڈ میں 93 ارب ڈالر پڑے ہیں۔ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں' کیسے ایک طرح سوچ سکتے ہیں۔

میرا اللہ فرق واضح کر دیتا ہے

جن لوگوں کو افغانستان میں امریکہ کی حالت زار دیکھ کر بھی اس بات کا یقین نہ آرہا ہو کہ قوموں کو فتح اور سرفرازی مادی وسائل یا ٹیکنالوجی کے عروج سے نہیں بلکہ غیرت وحمیت سے حاصل ہوتی ہے تو ایسے لوگوں کو غیرت کا درس نہیں پڑھایا جاسکتا۔ ان لوگوں کی جبینیں بنی ہی مادی طور پر طاقتور کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے ہیں اور جن افراد کو افغانستان میں صرف سو سال کے عرصہ میں تیسری عالمی طاقت یعنی پہلے برطانیہ' پھر روس اور اب امریکہ کی شکست کے بعد بھی اس بات کا یقین نہ آئے کہ اس کائنات کا ایک مالک و مختار اور فرمانروا بھی ہے جس کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے کہ تم اس پر بھروسہ تو کر کے دیکھو' تم تھوڑے بھی ہو گے تو تمہیں زیادہ بڑے گروہوں پر غلبہ عطا کرے گا' تو پھر یہ لوگ وہ ہیں جن کے بارے میں میرا اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہریں لگادی ہیں۔ تاریخ کا یہ کتنا بڑا مذاق ہے کہ ایک عالمی طاقت جو خود کو واحد عالمی طاقت سمجھتی ہو' جس کے ہتھیاروں کی تکنیکی خوبی ایسی ہو کہ اس کی گرد کو بھی کوئی نہ پہنچ پاتا ہو' وہ چند ہزار طالبان کے ہاتھوں اس قدر بے بس ہو جائے کہ اپنی ناکامی اور خفت کا ملبہ ایک ایسے ملک میں "بسنے والے" تین یا چار ہزار حقانی نیٹ ورک کے لوگوں پر لگادے۔ یہ "بسنے والے" میں نے اس لئے لکھ دیا کہ یہ امریکہ کا کہنا ہے ورنہ جس نے افغانستان دیکھا ہے اس کو علم ہونا چاہئے کہ کابل کے ریڈ بلکہ الٹرا ریڈ زون تک شمالی وزیرستان سے جاکر پہنچنا اور اتنا لمبا راستہ اختیار کر کے راستہ میں موجود بھیڑیوں جیسی چیک پوسٹوں اور سیٹلائٹ کی دوربین کی نظروں میں آنا' کسی عقل مند کا کام نہیں' یہ تو ہونا تھا۔ اس لئے کہ آج سے دس سال قبل جب امریکہ افغانستان میں داخل ہوا تھا تو میرے ملک کے طاقت کے پجاری اور مادی وسائل کو خدا سمجھنے والے دانش ور' ادیب' سیاست دان حتیٰ کہ جرنیل بھی یہی کہتے تھے کہ یہ ٹیکنالوجی کی دنیا ہے۔ افغان نہتے اور بے وسائل لوگ ہیں۔ یہ درختوں پر بیٹھے پرندوں کی طرح مارے جائیں گے۔ ایسے میں پورے ملک میں میرے جیسے چند "بے وقوف" لوگ بھی تھے جو کہا کرتے تھے کہ دیکھو اس کائنات میں ایک اور طاقت بھی ہے جو اس کی فرمانروائے مطلق ہے اور جو کوئی صرف اور صرف اس پر بھروسہ کرلیتا ہے پھر یہ اس واحد وجبار کی غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ اسے ذلت ورسوائی سے بچائے۔ آج موجودہ دنیا کی تاریخ میں واحد افغان قوم ہے جو سرخرو ہے۔ کسی قوم کے سینے پر عالمی طاقتوں کو شکست دینے کے اتنے زیادہ میڈل نہیں سجے' جتنے اس قوم کے سینے پر آویزاں ہیں۔

اللہ میرے ملک کو ذلت کی پستی سے نکالنے اور غیرت کی زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرنے والا ہے۔ امریکہ اپنی شکست کا بوجھ اس پاکستان پر ڈال رہا ہے جس کے سیاست دان' دانشور' سول سوسائٹی حتیٰ کہ جرنیلوں کی اکثریت ان کے ٹکڑوں پر پلنے کو فخر سمجھتی رہی ہے۔ اس وقت میرے ملک میں دو گروہوں میں جنگ ہے۔ ایک وہ جو سرتاپا اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آنے دو' پاکستان ہی امریکہ کا اصل قبرستان ثابت ہوگا۔ ویسے تو ویت نام سے لے کر جنوبی امریکہ تک امریکہ کے بہت سے قبرستان ہیں۔ دوسرا وہ طبقہ ہے جو اس قوم کو ڈرا رہا ہے۔ خود اپنے ہی ملک پر الزامات دھر رہا ہے کہ اصل شرارتی ہم ہیں جس کی امریکہ ہمیں سزا دینا چاہتا ہے۔ یہ سول سوسائٹی کے فیشن زدہ لوگ اور طاقت کے مندر میں سجدہ ریز دانش ور کمال کی گفتگو کر رہے ہیں۔ دیکھو باز آجاؤ' اگر امریکہ نے حملہ کیا تو انتہا پسند چھا جائیں گے۔ واہ جو امریکہ سے لڑے گا وہی چھائے گا۔ کبھی بزدل بھی چھائے ہیں۔ ایک اور منطق اور ورف طنی چھوڑی جارہی ہے۔ امریکہ وہاں رہے گا' وہ جائے گا نہیں' کیا خوش فہمی ہے۔ اپنے اس "عظیم" مہربان کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں' ویت نام میں رہا' چلی میں رہا' ہنڈراس میں رہا' بولیویا میں رہا' سب جگہ جوتے کھا کر ذلت کے ساتھ دم دبا کر بھاگا۔ میرے یہ عظیم دانش اور سول سوسائٹی کے مہربان جو اس ملک میں سیلاب کی تباہ کاریوں میں کسی انسان کی مدد کرتے نظر نہیں آرہے' امریکہ کی جنگ لڑنے میڈیا میں موجود ہیں۔ یہ کمال کے لوگ ہیں۔ جب دسمبر 1979ء میں روس افغانستان میں داخل ہوا تھا تو یہ اس ملک کی سڑکوں پر بھنگڑے ڈال رہے تھے۔ وہ دیکھو سرخ پھریرا سرحد عبور کرنے والا ہے۔ تمہاری داڑھیاں نوچ لی جائیں گی اور سارا انقلاب ہوا کی طرح اڑا دیا جائے گا۔ کیسے کیسے مضمون لکھے گئے' کیسی کیسی نظمیں تحریر ہوئیں' سرحدوں پر انقلاب کے سویرے کی نوید سنائی گئی۔ لیکن ان سب کو کیا ادراک کہ اس مملکت خداداد پاکستان کے ساتھ ایک ایسی قوم بھی بستی ہے جو صرف اور صرف اللہ پر اعتماد کرتی ہے۔ میں سوویت یونین کی ذلتوں اور رسوائیوں کی داستان بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اس ملک ہی نہیں پوری دنیا کی سڑکوں نے اس عالمی طاقت کو یوں رسوا دیکھا کہ پورے یورپ میں صرف عظیم سوویت یونین کی لڑکیوں کا جنسی کاروبار سالوں تک ہوتا رہا اور آج بھی جاری ہے۔ جس امریکہ کو وہ کیمونسٹ پچھتر سال گالیاں دیتے رہے اسی کے دروازے پر امداد کی بھیک کے لئے کھڑے نظر آنے لگے۔

یہ لوگ بھی کمال کے ہیں۔ اگر چیہ گویرا بولیویا سے کیوبا جاکر لڑے تو ہیرو' اگر فرانس کے لوگ جنرل گیاپ کے ساتھ جاکر ویت نام میں کارروائیاں کریں تو عظیم' اگر سارتر الجزائر جاکر لڑے تو عظیم انقلابی ادیب' اگر ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بلوچستان میں آپریشن کے دوران بلوچ علیحدگی پسندوں کے ساتھ کوئی جاکر پہاڑوں میں لڑیں اور ان کے ہمراہ سندھ اور پنجاب سے بہت سے انقلابی سرخ جھنڈوں کے سائے اس ملک پر لہرانے کی جدوجہد کریں تو وہ انسانی حقوق کے علمبردار۔ لیکن اگر کوئی اللہ پر یقین رکھے' اور فلسطین' بوسنیا' چیچنیا یا افغانستان کے مظلوموں کی مدد اور عالمی طاقتوں کے خلاف لڑنے نکلے تو دہشت گرد' امن وامان تباہ کرنے والا۔ کیا عجیب منطق ہے۔ ان سب کو اب کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ کبھی کہتے ہیں فوج علیحدہ ہے' سیاسی رہنما علیحدہ ہیں' قوم پہلے ہی مری ہوئی ہے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ مری ہوئی قوم سے زیادہ خطرناک کوئی قوم نہیں ہوتی۔ اور سیاسی قیادت تو ہمیشہ وہ بھس بھرے بت ہیں جن پر کبھی بکری کی کھال چڑھا دو اور کبھی شیر کی۔

قوموں کی تاریخ میں یک جہتی' اتحاد اور یک جان ہونے کا مرحلہ اسی وقت آتا ہے جب ان کا دشمن مشترک اور خوفناک ہو۔ امریکہ دنیا بھر سے آئے ہوئے مہاجروں کی ایک قوم تھی۔ انہوں نے 1917ء میں روس کے بننے کے بعد سے اپنے لئے ایک مشترکہ دشمن یعنی کیمونسٹ کو تخلیق کیا۔ اسے نسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا۔ جب 1992ء میں روس ٹوٹا' لوگوں نے تاریخ کا انجام نامی فلسفے بگھارنے شروع کئے' لیکن امریکہ نے اپنی قوم کو متحد کرنے کے لئے ایک اور دشمن تخلیق کر لیا۔ مسلم امہ۔ یہ لوگ چھا جائیں گے۔ یہ ہم سے لائف سٹائل چھین لیں گے۔ اس امہ کا خوف اسقدر پوری امریکی قوم پر سوار کیا گیا کہ وہ کچھ اور سننے کو تیار نہ ہوئی۔ قوموں کو متحد کرنے' ایک جان کرنے کا یہ اصول میرے اللہ کا تخلیق آدم کے وقت سے بنیادی اصول ہے۔ اللہ نے آدم کو تخلیق کیا تو ساتھ ہی ایک مشترکہ دشمن بھی وجود میں لایا گیا۔ اللہ نے فرمایا۔ "بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے"۔ اسے صرف مسلمانوں' عیسائیوں' ہندوؤں یا یہودیوں کا کھلا دشمن نہیں قرار دیا گیا بلکہ انسان کا کھلا دشمن کہا گیا۔ لیکن کمال ہے انسان نے اسے دوست بنایا اور پھر اس کرہ ارض کو جنگ اور قتل سے بھر دیا۔ خوش نصیب ہوتی ہیں وہ قومیں جنہیں کوئی مشترکہ دشمن نصیب ہو جائے۔ جو ان میں غیرت جگا دے' ان کو حمیت سے جینا سکھا دے' ان کو متحد کر دے' ایسے ہی کھرا اور کھوٹا الگ ہو جاتا ہے۔ بزدل اور باغیرت کی پہچان ہو جاتی ہے۔ میرا اللہ فرق واضح کر دیتا ہے۔

مشترکہ دشمن ہی متحد کرے گا

برصغیر پاک وہند کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو آپ کو ایک حقیقت ایسی نظر آئے گی کہ آپ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ یہ سرزمین جس پر مسلمانوں نے تقریباً سات سو سال تک بلاشرکت غیرے حکومت کی' اس کا سرکاری قانونِ تعزیرات قطب الدین ایبک سے لے کر انگریزوں کی حکومت تک اسلام کے شرعی قوانین پر مبنی تھا۔ تمام علاقوں میں مسلمان قاضی تھے جو شریعت کے مطابق فیصلے کرتے۔ کسی ہندو' بدھ' سکھ یا جین قاضی کا کوئی نام ونشان تک نہیں ملتا۔ اکبر، جسے لوگ سیکولر سوچ کا امام کہتے ہیں' اس کے دور میں بھی فیصلے شریعت کے مطابق ہی ہوتے رہے۔ عمومی فقہ حنفیہ رائج تھی لیکن شیعہ ریاستوں میں فقہ جعفریہ کے مطابق فیصلے ہوتے تھے اور چونکہ دونوں فقہوں کی تعزیرات میں معمولی سا بھی فرق نہیں ملتا اس لئے انگریز کی آمد سے پہلے پورے برصغیر میں کبھی شیعہ سنی اختلاف پیدا نہ ہوا' نہ کوئی فتویٰ جاری ہوا نہ کسی کو کافر کہہ کر پکارا گیا۔ نہ فرقہ بندی تھی اور نہ گروہی اختلافات۔ حیرت کی بات ہے کہ اس پورے دور میں کسی کذاب یعنی جھوٹے نبی کا بھی کوئی دعویٰ نہیں ملتا۔ اسی اتحاد اور نظام شریعت کی برکات تھیں کہ لارڈ میکالے ہندوستان کے قصبے قصبے گھوم کر جب 1835ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ: "مجھے وہاں نہ کوئی فقیر نظر آیا نہ چور۔"

فرقہ بندی' قتل وغارت اور کفر کے فتوؤں کی روایت کے ماخذ تلاش کرنے نکلیں تو آپ کو ایک اور حیرت ہو گی کہ ان سب کا آغاز 1857ء کے بعد ہوا اور وہ بھی ان علاقوں سے جو آج ہندوستان میں ہیں۔ پاکستان میں پائے جانے والے تمام فرقوں کے بنیادی مراکز آج بھی بھارت کے شہروں میں موجود ہیں۔ انگریزوں کی آمد کے بعد سب سے پہلا مدرسہ جہاد آزادی میں بھرپور حصہ لینے والے صوفی بزرگ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ساتھیوں مولانا قاسم نانوتوی' مولانا رشید احمد گنگوہی اور حاجی سید عابد حسین نے مغلیہ حکومت کے زوال کے ٹھیک نو سال بعد 1866ء میں قائم کیا۔ یہیں سے جمعیت العلمائے ہند کی بنیاد رکھی گئی جس کی شاخیں یا اس کے متاثرین جمعیت العلمائے اسلام کے مختلف گروہوں اور دیوبندی مکتبہ فکر کے مدرسوں کی صورت آج بھی پاکستان میں موجود ہیں۔ دوسرا اہم فرقہ بریلوی ایک تحریک کی صورت میں بھارت کے شہر بریلی میں 1880ء میں شروع ہوا ۔اس کے بانی حضرت احمد رضا بریلوی مغلیہ دور کے خاتمے سے ایک سال قبل 1856ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور درس نظامی اپنے والد نقی علی خان کی نگرانی میں مکمل کی اور 1878ء میں ان کے ساتھ حج پر روانہ ہوئے ۔واپسی پر انہوں نے بریلوی مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی جس کی اساس اسلامی تصوف اور تزکیہ پر مبنی تھی اور عشق رسولؐ ایک متاعِ عزیز تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دیوبند کے علماء اور مولانا احمد رضا بریلوی کی تصانیف میں معاملات شریعت میں معمولی سا فرق ہے۔ آپ کو پڑھ کر حیرت ہو گی کہ بریلوی فکر کے یہ امام قوالی' مزاروں کا طواف' ان پر سجدہ' عورتوں کا مزاروں پر جانا سب کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ اختلافات کی وجہ فروعی اور معمولی نوعیت کی تھی۔ تیسرا اہم فرقہ اہل حدیث 1916ء میں کلکتہ میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس میں مولانا سید میاں نادر حسین کی سربراہی میں ایک مرکزی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ ان کے بنگال اور آسام میں علیحدہ علیحدہ حصے تھے ۔ایک اہم جماعت کی حیثیت سے جماعت اہل حدیث 1946ء میں مولانا عبداللہ کافی کی سربراہی میں کلکتہ میں قائم ہوئی۔ بریلوی مکتبہ فکر کی نمائندہ پاکستان میں جمعیت العلمائے پاکستان سے لے کر سنی تحریک اور سنی کونسل تک بہت تنظیمیں مل جائیں گی اور اہل حدیث کے بھی کئی گروہ علامہ ساجد میر' ابتسام الٰہی ظہیر اور حافظ سعید کی صورت سرگرم ہیں۔ شیعہ مسلک کا مرکز ومنبع بھی ان ریاستوں سے شروع ہوا جو آج بھارت میں ہیں۔ اسے فروغ اور اجتماعی شکل لکھنو کے نوابانِ اودھ نے دی۔ انیس ودبیر کے مرثیے' عزاداری' تعزیے اور دیگر مراسم نے وہیں سے برصغیر میں آغاز کیا۔ یوں تو شیعہ مسلک کے عالمی اجتماعی مراکز نجف اور قم میں ہیں لیکن لکھنو کو برصغیر میں آج بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

اب ایک اور حیرت کے جہاں میں آپ کو لئے چلتا ہوں۔ برصغیر میں پائے جانے والے یہ تمام فرقے آج بھی بھارت میں موجود ہیں اور ان کی جنم بھومیاں بھی وہیں ہیں۔ انگریز کے آنے کے بعد سے لے کر 1947ء تک کبھی شیعہ سنی' وہابی بریلوی فساد نہ ہوا اور 1947ء سے لے کر آج تک بھارت میں بھی کوئی بڑا فساد کیا بلکہ چھوٹی جھڑپ بھی شاید ہی ہوئی ہو۔ یہ سب وہاں کیوں شیر وشکر ہو کر رہتے ہیں اور یہاں ایک دوسرے کا گلہ کاٹتے ہیں۔ اس لئے کہ 1857ء سے لے کر آج تک ان سب فرقوں کے ماننے والوں کا دشمن مشترک ہے اور وہ ان پر عرصہ حیات تنگ کئے ہوئے ہے۔ جب بھارت میں ہندو مسلم فساد پھوٹتے ہیں تو کوئی نہیں دیکھتا یہ شیعہ ہے' یہ سنی ہے یا اہل حدیث' محلوں کے محلے جلا دیئے جاتے ہیں۔ مردوں کی شلواریں اتار کر دیکھی جاتی ہیں اور اگر ختنے ہوئے ہیں تو گردن مار دی جاتی ہے۔ ان تمام فرقوں کے اسلاف کی قبریں وہیں ہیں اور علم کے خزانے بھی انہی لائبریریوں میں موجود ہیں۔

لیکن میرے ملک میں یہ سب علماء دست وگریبان ہیں۔ اس مملکت کے آغاز میں یہ سب متحد تھے۔ قرارداد مقاصد کی جدوجہد کے وقت ان تمام فرقوں کے علماء نے شریعت کے نفاذ کے لئے بائیس نکاتی ایجنڈا دیا تھا، جس پر سب متفق تھے۔ کیا آج کوئی یقین کرے گا۔ لیکن پھر میرے ملک کے یہ علماء جس طرح سیاسی قیادتوں اور مفادات کے ہاتھ میں کھلونا بنے اس کی کہانی بہت اذیت ناک ہے۔ ان کے چہرے ٹیلی ویژن سکرینوں اور عمومی محفلوں میں اور طرح کے ہیں اور نجی گفتگو میں ان کا زورِ بیان دوسرے فرقے کی رد اور تردید میں صرف ہوتا ہے ۔یوٹیوب پر ان کی گفتگو پر مبنی حصے دیکھ لیے جائیں تو ابکائی آنے لگتی ہے۔ مجھے دکھ سے لکھنا پڑ رہا ہے کہ جب جامعہ حفصہ کی معصوم بچیوں کا قتل عام ہو رہا تھا تو میرا امیل باکس اور خطوط دوسرے فرقوں کی خوش کن اور طنزیہ نعروں کی کہانیاں سناتے رہے۔ اسی طرح جب کسی امام بارگاہ میں دھماکے ہوتے تو مرنے والوں پر طنز کرنے والوں کے خطوط اور ای میلز بھی آج تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ یہ نفرت کا بیج اتنا گہرا بویا گیا ہے کہ عام آدمی جو ان علماء کی تقریروں سے متاثر ہوتا ہے وہ اسے ایمان کا جزو سمجھ لیتا ہے۔ مدتوں سرکار کی نوکری سے مجھے یہ بھی علم ہے کہ کس طرح ہر فرقے سے علماء کو خریدا جاتا ہے اور پھر ان کو باہم دست وگریبان کیا جاتا ہے۔ یہ سب میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اس مملکت خداداد پاکستان میں سب سے بڑی ذمہ داری ان علمائے کرام کی تھی کیونکہ یہ ملک نسل' رنگ یا زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ عقیدے کی بنیاد پر بنا تھا۔ اس کے وارث اور امین تو علماء نے ہونا تھا اس لئے اگر اس ملک پر آفت اور عذاب ٹوٹتا ہے' تباہی آتی ہے تو کل کو روزِ حشر سب سے زیادہ جواب دہ بھی آپ لوگ ہوں گے۔ تمام علماء سے اختلاف پر بات کر لو بتائیں گے کہ بنیادی عقائد میں کوئی فرق نہیں' معمولی فروعی اختلافات ہیں لیکن ان کے منبر ومحراب انہی فروعی اختلافات سے گونجتے ہیں۔ یہ کب متحد ہوں گے' شاید حالات انہیں مجبور کرنے والے ہیں کہ یہ متحد ہو جائیں۔ ان تمام علمائے کرام کو ایک مشترکہ دشمن نصیب ہونے والا ہے۔ جب انہیں معلوم ہو گا کہ محرم کی عزاداری' میلاد کا جلوس اور توحید کانفرنس امریکی فوج کے طیاروں کے لئے برابر ہے۔ ان کے نزدیک عبداللہ' کلب علی یا غلام مصطفیٰ میں کوئی فرق نہیں۔ سب قابل گردن زدنی ہیں۔ وقت کی گونج سن لیں۔ سب تیاریاں مکمل ہو چکیں۔ وہی حال جو ویت نام کی جنگ ہارتے ہوئے کمبوڈیا پر دہشت گردوں کی اعانت میں جرم حملہ کر کے کیا گیا تھا' وہی پالیسی پاکستان کے حقانی نیٹ ورک کے خلاف ایکشن کے لئے اپنائی جا رہی ہے۔ وقت دور نہیں' میں پیش گوئی نہیں کر رہا' سیاسی اور جنگی کھیل ہی اس طرف چل پڑا ہے لیکن اس میں میرے اللہ کی ایک حکمت پوشیدہ ہے ایک مشترکہ دشمن اس بکھری اور لٹی پٹی قوم کو متحد کر دے گا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ میں چیمبرلین وزیراعظم تھا' لوگوں نے اسے کرسی سے اتار پھینکا کہ ایسے میں بزدل نہیں بہادر کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سرحد جو افغانستان اور پاکستان کے درمیان موجود ہے امریکی حملے کے بعد بے معنی ہو جائے گی کیونکہ دشمن ایک ہو گا اور جو کوئی اس مشترک دشمن کے خلاف لڑنے سے روکے گا خواہ وہ فوج کا سپاہی ہی کیوں نہ ہو' عوام کے غیظ وغضب کا نشانہ بنے گا۔ وقت اس قوم کو کٹھالی میں ڈال کر کندن بنانے کے لئے تیار ہے۔

خوش رہو اہل وطن

دنیا کے چھ ارب انسانوں میں اگر ایسے لوگوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے جو انسانوں کی مدد کے لئے اپنے مال سے خرچ کرتے ہیں' اپنا وقت لگاتے ہیں یا اپنی توانائیوں سے حصہ ڈالتے ہیں تو عظیم ترین اکثریت ایسے لوگوں کی آپ کو ملے گی جو کسی نہ کسی ایسی ہستی پر یقین کامل رکھتے ہوں گے جو اس کائنات کی مالک و مختار ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان کا اس بات پر بھی یقین محکم ہوتا ہے کہ یہ ہستی جو اس کائنات کی مالک ہے اس نے جزا اور سزا کا ایک نظام مرتب کیا ہے اور وہ انسانوں کی فلاح پر خرچ کرنے' ان کی تکلیفیں دور کرنے یا ان کو آسائش فراہم کرنے کے عمل پر آئندہ زندگی میں ضرور اجر دے گی۔ یہ اجر مسلمانوں کے ہاں جنت' ہندوؤں کے ہاں سورگ' عیسائیوں کے ہاں Heaven یا جنت' یہودی یہاں تک کہ بدھ مت' تاؤ اور کنفیوشس بھی نظام ہستی کے خالق اور جزا اور سزا کے نظام پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ یہ سن کر حیران رہ جائیں گے کہ یونان' جسے مغربی جمہوریت اور سیکولرزم کا بانی قرار دیا جاتا ہے' کے سب سے بلند قامت ہیرو اور سچ کی خاطر زہر کا پیالہ پینے والے سقراط کی تقریر اس مالک کائنات کی عظمت کا قصیدہ ہے جو اس نے جیوری کے سامنے کی تھی جس نے اسے موت کی سزا سنائی تھی۔ سقراط نے بیان کے آخر میں کہا تھا "مجھے خدا پر اس طرح یقین ہے جس طرح میرے خلاف مقدمہ دائر کرنے والوں کو نہیں۔ میں اس مقدمہ کے فیصلے کو تمہارے اور خدا کے سپرد کرتا ہوں"۔ یہ شخص خدا پر اتنا کامل یقین رکھتا تھا اسی لیے بے خوف اور سچا تھا۔ اس نے جیوری کے سامنے کہا" آواز ربانی تاحال میرے ساتھ رہی ہے' اور جب کبھی میں کسی ذرا سے بھی ناواجب فعل کا مرتکب ہوتا تو وہ مجھے ہمیشہ روکتی رہی ہے"۔ حیرت کی بات ہے یہ سقراط جسے بڑا ماڈرن اور سیکولر نما مغربی ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے وہ آواز ربانی کے سہارے پیش گوئی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے "تم یہ خیال کرتے ہو کہ مجھے سزائے موت دینے کے بعد تم اپنی اپنی زندگی کا حساب دینے سے بچ جاؤ گے۔ بہت سے ایسے ہوں گے جو تم سے حساب طلب کریں گے جنہیں میں نے دیکھ لیا ہے لیکن تم نہیں دیکھ سکتے"۔ دنیا کی ابتدا سے لے کر آج تک خیر کی ساری سرگرمیاں اور فلاح کے سارے راستے خدا کے وجود اور آخرت میں جزا و سزا کے تصور سے کھلتے ہیں۔ یہ خوف خدا ہوتا ہے جو انسانوں کو انسانوں پر ظلم سے روکتا ہے' سچ بولنے پر مجبور کرتا ہے' ساری دولت بے کسوں اور لاچاروں پر خرچ کرنے پر مائل کرتا ہے۔ گنگا رام سے کسی نے سوال کیا تم اتنا کیوں لوگوں پر خرچ کرتے ہو۔ جواب دیا جب کمانے نکلا تو بھگوان سے وعدہ کیا' جو کماؤں گا آدھا تمہارا اور آدھا میرا۔ جب ایک روپیہ کما کر لایا تو آٹھ آنے دینا بہت مشکل تھے۔ آج ایک لاکھ میں سے پچاس ہزار دینا کتنا آسان ہے۔ یہ میرے مالک کا نظام ہے جس سے اس کائنات میں حسن و خوبی ہے۔ دنیا میں دو ملک ایسے تھے جنہوں نے اللہ' خدا یا کسی ایسی ہستی کو اپنے ملک سے خارج کر دیا۔ 1917 میں روس نے اور 1948 میں چین نے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اس عالمی طاقت روس کا نام ہر کامیابی کی فہرست میں ملے گا لیکن دنیا کے مخیر حضرات میں کسی ایک روسی شخص کا نام ڈھونڈنا بھی مشکل ہوگا۔ یہ عادت ایسی پڑی کہ آج کمیونزم کو رخصت ہوئے بیس سال ہو رہے ہیں لینن گراڈ سینٹ پیٹرزبرگ ہو گیا' سرمایہ دار پیدا ہو گئے لیکن عالمی سطح پر انسانی فلاح کرنے والی کوئی شخصیت یا تنظیم نہ پیدا ہو سکی۔ یہی حال چین کا ہے' ماؤزے تنگ کے نعرے کی موت واقع ہوئے عرصہ ہو گیا لیکن خدا کو دیس سے نکالا تو پھر دنیا بھر میں غریبوں کی مدد کرنے والا جنم نہ لے سکا۔

میرے مالک کائنات نے جو اپنے آپ کو عالمین کا رب کہتا ہے' اس نے انسان یہ کو ایسے محکم نظریے دیئے جن سے انسانوں میں انسانوں کی محبت پیدا ہو۔ ایک اس کا مالک ہوتا اور دوسرا اس کے سامنے پیش ہو کر اعمال کا حساب دینا' اور دنیا کے ہر مذہب میں سب سے نیک عمل انسانوں کی فلاح اور مصیبت میں ان کے کام آنا ہے۔ اسی طرح دنیا کے ہر مذہب میں اللہ کی ناراضگی اور عذاب کی وجوہات بھی ایک جیسی ہیں' سارے مذہب ایک جیسے اعمال پر زمین پر آفتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اللہ کا عذاب بے انصافی' تکبر' خیانت' ظلم اور زمین پر خدا بن بیٹھنے پر آتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر آپ خوف خدا سے لرزتے ہوئے انسانوں کی مدد خوشدلی سے کرتے ہیں۔ مجھے ان لوگوں پر ہنسی آتی ہے' ان کالم نگاروں پر' دانشوروں' اینکر پرسنز پر جو اللہ کی طرف رجوع کرنے اور توبہ کرنے کا تمسخر بھی اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ دقیانوسی جاہل لوگ لوگوں کو ناکارہ بناتے ہیں اور دوسری جانب ماتم کرتے پھرتے ہیں کہ کوئی سیلاب زدگان کی مدد کو نہیں نکلتا۔ یہ قوم بے حس ہو گئی ہے۔ عقل کے اندھوں کو دنیا کی تاریخ سے ایک بات آج تک سمجھ نہیں آ سکی جو اللہ کے خوف میں مبتلا ہو گا' جزا اور سزا پر ایمان لائے گا وہی اس کار خیر میں نکلے گا۔ لوگوں کو کہو یہ انتظامی مسئلہ ہے' یہ حکومتی نااہلی ہے' اس کا اللہ کے ساتھ کیا تعلق تو پھر لوگ اپنا انتظام ہی ٹھیک کرتے ہیں' خود کو ہی بچاتے ہیں۔

میرے یہ دانشور اس قدر اللہ کے نام کے ذکر سے خائف ہیں کہ ان کے علم میں ہوتا ہے کہ زلزلے میں سیلاب میں' آفات میں سب سے پہلے وہی لوگ لپک لپک کر میدان میں آتے ہیں جو اللہ کی حاکمیت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کے ٹی وی چینل ان کی داڑھیاں اور ماتھے کے محراب دکھانے سے کتراتے ہیں۔ آج سیلاب کو ایک ماہ ہو چلا ہے۔ یہ بلائیں اپنی سول سوسائٹی کی منہ پھاڑتی سیکولر ایلیٹ کو اور پوچھیں تم کہاں مر گئے ہو۔ ایک عورت کو شادی سے روکا جائے تو زمین آسمان ایک کر دیتے ہو اور آج لاکھوں عورتیں بے یار و مددگار ہیں' کوئی انسانی حقوق' حقوق' نسواں' سول سوسائٹی کی ہزاروں این جی اوز اپنے ائرکنڈیشنڈ دفاتر میں کہاں خاموش ہیں۔ لیکن کوئی ان کا گریبان نہیں پکڑے گا۔ لیکن جب آفت ٹل جائے گی تو یہ لوگ دو قومی نظریے پر بحث کرنے واپس نظر آئیں گے۔

یہ وہ ہماری منافقتیں ہیں جس کی وجہ سے ہم پر عذاب مسلط ہے۔ آپ لوگوں کو اللہ کی طرف رجوع اور استغفار سے روکو' اس کا تمسخر اڑاؤ' یہی وجہ ہے کہ اس نے اردگرد بسنے والوں کے دل اس قدر سخت کر دیئے ہیں کہ تمہارے امدادی کیمپ خالی ہو چکے۔ لیکن مجھے بھی روک دیا گیا ہے۔ حکم دے دیا گیا کہ اب بہت ہو چکی۔ دو سال سے کہتے چلے آ رہے ہیں اللہ کی ناراضگی سے ڈرو' اس کی طرف رجوع کرو۔ اللہ نے نشانیاں بھی ظاہر کیں پھر بھی سب اپنی دھن میں مگن ہیں۔ اہل نظر کا حکم ہے اب اس موضوع پر نہیں لکھنا۔ لوگوں کی حالت قرآن کی ان آیات کے مطابق ہے جن میں کہا گیا ہے کہ کافر سوال کرتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ کب آئے گی وہ گھڑی۔ اے رسول انہیں بتاؤ' اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے' میں تو ایک کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں۔ یہی فرض ادا کر دیا۔ اے اللہ تو اس پر گواہ رہنا۔ رہی بات اس مملکت خداداد پاکستان کی تو یہ ملک اس پوری دنیا میں واحد ملک ہے جس کے ماتھے پر اللہ کے نام کا ستارہ جگمگاتا ہے۔ ہمارا تو بس وہی طریقہ ہے جو عبدالمطلب نے ابرہہ کے سامنے اختیار کیا تھا۔ اس کا لشکر کعبے کو ڈھانے آیا اور قریش کے چند اونٹ پکڑ کر لے گیا۔ عبدالمطلب گئے اور اونٹ واپس طلب کیے۔ ابرہہ نے کہا میں تمہارے کعبے کو ڈھانے آیا ہوں تم اونٹوں کی بات کرتے ہو۔ عبدالمطلب نے کہا میں اونٹوں کا مالک ہوں انہی کی بات کروں گا۔ وہ جس کا گھر ہے' وہی اس کا مالک ہے' وہی حفاظت کرے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس مملکت خداداد پاکستان جو میرے اللہ کی غیرت کی علامت اور میرے رسول کی بشارتوں کی امین ہے اس میں کھائے ہو بھس کی مانند کون ہو جائے گا۔ ہزاروں لوگ روز خواب میں میرے رب کے اشارے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اب اشاروں کی' نشانیوں کی خبر دینے کا موسم گزر گیا۔ بس صرف توبہ کا دروازہ کھلا ہے' جو قیامت تک کھلا رہے گا۔ یہی ایک راستہ ہے جو امر الٰہی کو ٹال سکتا ہے۔ امر بھی اللہ کا' جانتا بھی اسے صرف وہی ہے' وقت بھی اسی کو معلوم۔ ہمارے ذمے تو ڈرانے کا فرض تھا ادا کر دیا۔ اس دعا کے ساتھ کہ اے اللہ تمہارے غضب سے پناہ مانگتے ہیں۔ لیکن اگر یہ برحق ہے تو ہمارا انجام ظالموں کے ساتھ نہ کرنا اور نہ ہی ہمیں ظالموں کے ساتھ اٹھانا۔

عذاب یا آزمائش

ہم کس قدر منافق اور دوغلے ہیں۔ ہماری علمی گفتگو‘ بحث مباحثے اور میڈیا کا شور شرابہ عقلی دلائل‘ انتظامی صلاحیت اور سائنسی استعداد کی ناکامی کے گرد گھومتا ہے۔ ہم پر جب بھی کوئی آفت ٹوٹتی ہے ہم اس کے ماخذ تلاش کرتے‘ وجوہات کی کھوج میں لگ جاتے ہیں۔ ہماری ساری سائنسی تحقیق انہیں آفتوں اور بیماریوں کو فتح کرنے میں صرف ہوتی ہے اور یقیناً یہ ہماری مادی ترقی کی معراج بھی ہے۔ انسان نے ہر دور میں آنے والی نئے امراض کا علاج دریافت کیا۔ نئی آفتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ڈیم بنائے‘ بند اور پشتے مضبوط کئے‘ زلزلے کے لئے لچکتی اور لرزتی ہوئی عمارتیں تعمیر کیں جو زلزلے کے دوران جھول جائیں‘ وارننگ سنٹر قائم کئے۔ یوں انسان نے اپنی طاقت‘ قوت اور عظمت کے جھنڈے گاڑنے کی کوشش کی۔ ''انسان عظیم ہے خدایا'' کا نعرہ بلند ہوا۔ ہر وہ شخص جس نے انسان کی عظمت اور بادشاہی پر یقین رکھا اس نے دنیا کے ہر معاملے میں اللہ کو دیس نکالا دے دیا۔ جو کرتا ہے انسان کرتا ہے‘ تدبیر سے بچتا ہے اور طاقت سے کنٹرول کرتا ہے۔ انہیں شاید اس بات کا علم نہ تھا کہ میرا اللہ فرماتا ہے تدبیر بھی میں بجھاتا ہوں اور امراض کا علاج بھی میں نے اس کائنات کے خزانوں میں چھپا رکھا ہے۔ عرب کے لوگ ان اسباب و علل کو طرح طرح کے نام دیتے تھے جیسے عدویٰ‘ طیرہ‘ ہامہ اور صفر۔ ایک بدو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے سوال کیا ان اونٹوں کی کیا حقیقت ہے جو ریگستان میں رہتے ہیں ''گویا کہ وہ ہرن کی طرح تندرست ہیں، پھر ان میں ایک خارشی اونٹ آملتا ہے اور وہ دوسروں کو بھی خارشی بنا دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا کہ پہلے اونٹ کو کس نے بیماری لگائی (بخاری بحوالہ مشکوٰۃ) سائنسی تحقیق بھی کبھی کبھی ایسے ہی بے بس ہو جاتی ہے۔ نوے کی دہائی میں جب ایڈز کے مرض نے پوری دنیا پر ایک خوف مسلط کیا ہوا تھا تو سائنسی تحقیق ایڈز کے وائرس کا پیچھا کرتے کرتے افریقی بندر تک جا پہنچی جس کو سب سے پہلے یہ وائرس لاحق ہوا تھا‘ لیکن کوئی اس بندر پر اس مرض کے حملے اور پھر انسان کے ساتھ اس کے تعلق کو ثابت نہ کر سکا۔ بس سائنس حیرت میں گم رہ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم جب کسی مریض کو دوا لینے کے لئے کہتے تو کوئی سوال کرتا کہ ایسا کیوں تو آپ فرماتے دوا بھی تو اللہ نے پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے مختلف چیزوں، جن میں کلونجی بھی شامل ہے، اس کے بارے میں فرمایا کہ اس میں موت کے سوا ہر مرض کا علاج ہے اور موت وہ چیز ہے جس پر باوجود انتہائی خواہش اور تگ و دو کے آج تک قابو نہیں پایا جا سکا۔

قدرتِ الٰہی ہمیشہ انسانی تدبیر پر غالب رہی ہے اور انسان کو عظیم بننے اور خدا کہلانے کا لاتناہی شوق ہے لیکن یہ سب کے سب عقل و منطق کے قائل اور بڑی بڑی بحثوں میں تقدیر الٰہی کو شکست دینے والے جب خود کسی پریشانی‘ بیماری یا آفت میں مبتلا ہوتے ہیں یا پھر ان کی اولاد کسی ناگہانی آفت کا شکار ہوتی ہے تو جہاں وہ بڑے بڑے ڈاکٹر یا مسیحا سے رجوع کرتے ہیں‘ بار بار لوگوں سے دعاؤں کی درخواست کرتے پھرتے ہیں ''کوئی صدقے خیرات کا کہہ دے تو بکرے ذبح ہونے لگتے ہیں‘ گھروں میں آیت کریمہ کا ورد شروع ہو جاتا ہے اور اگر کبھی ڈاکٹر مایوس قرار دے دیں تو پھر معجزوں کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں۔ میں نے ایسے کتنے زوردار دلیل بازوں کو مایوسی کے عالم میں ٹوٹکے کرنے والوں‘ ماورائی طاقت سے مسئلہ حل کرنے والوں کے پیچھے بھاگتے دیکھا ہے۔ یہ ہے ہماری منافقت اور دوغلہ پن۔ خود آفت کا شکار ہوں تو مایوس نہیں ہونا چاہتے۔ کسی نہ کسی ماورائی طاقت کی مداخلت‘ معجزہ یا اللہ کی مدد کا انتظار کرتے ہیں لیکن جب لاکھوں لوگ بے گھر ہوں‘ بے بس ہوں‘ آپ کا بس نہ چلتا ہو تو زبان پر اللہ کا نام لاتے ہوئے ہمارا تکبر اور ہماری انا آڑے آ جاتی ہے۔ یہی عظمت و بڑائی اور تکبر و انا اس وقت خاک میں مل جاتی ہے جب اچانک زلزلوں سے زمین ہلنا شروع ہو جاتی ہے‘ مکان کانپتے ہیں تو خواہ کسی بدترین گناہ میں بھی مشغول ہوں کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے گھروں سے باہر بھاگتے ہیں۔

میرا اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ زمین کی جنبش کو چند لمحوں کے لئے طویل کر کے ساری کی ساری مخلوق کو اپنے سامنے سربسجود کروا دے لیکن اس کا یہ منشا ہرگز نہیں۔ اس نے انسان کو عقل دی‘ علم دیا‘ نعمتیں دیں‘ اپنی نشانیاں بتائیں تاکہ آپ اسے اس کائنات کا فرمانروا مانیں۔ اسے ماننے یا نہ ماننے کا عذاب اور ثواب وہ روزِ آخر میں کرے گا لیکن اللہ کے عذاب اور بستیوں کو تباہ کرنے کی تاریخ اٹھائیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ عذاب کی ایک وجہ سب میں مشترک تھی۔ تکبر‘ گھمنڈ‘ عظمت کا بھوت جو انسان کے سروں میں سماتا ہے تو پھر وہ خدا بن کر بیٹھ جاتے ہیں کیونکہ اس کا فرمان ہے کہ تکبر میری چادر ہے۔ ہم اسے روز اوڑھتے ہیں اور روز اسے تار تار کر دیا جاتا ہے لیکن ہمیں سمجھ نہیں آتی۔ ہم سے تو مصر کے فرعون بہتر تھے جن پر اللہ نے نو طرح کے عذاب نازل کئے۔ نیل چڑھ دوڑا‘ ٹڈیاں فصل کھا گئیں‘ کپڑوں میں جوئیں پڑ گئیں‘ مینڈکوں اور پھر خون کی بارش ہوئی لیکن اپنی تمام تر طاقت اور جاہ و جلال کے باوجود وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے بس سے باہر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتے کہ اپنے رب سے التجا کر کے ہمارا یہ عذاب دور کروا دو۔ لیکن ہم سائنسی دور کی پیداوار ہیں۔ ہم پہلے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم قابو پا لیں گے‘ پھر ناکام ہونے کے بعد یہ امید لگا لیتے ہیں کہ کوششیں جاری ہیں‘ ایک دن اس پر قابو پا لیا جائے گا۔ اللہ نے انسان کو ٹھیک ظالم اور جاہل کہا۔ طاعون‘ ہیضہ اور چیچک پر قابو پاتا ہے تو ایڈز‘ شوگر‘ بلڈ پریشر اور کینسر اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر توجیہات کرنے لگتا ہے‘ یہ سب ماڈرن طرز زندگی کی بے چینی اور اضطراب کا نتیجہ ہے۔ کوئی اللہ کے اس فرمان کی طرف نہیں دیکھتا کہ دلوں کا چین تو اللہ کے ذکر سے ملتا ہے۔ یہ نکتہ آج کے نفسیات دانوں نے سمجھ لیا اور وہ جب اپنی تمام تر جدوجہد میں ناکام ہوتے ہیں تو پھر مریض میں اعتماد پیدا کرنے اور پریشانی سے نجات کے لئے ایک ایسی طاقت کا سہارا پیش کرتے ہیں جو تمام انسانوں سے بالاتر اور عظیم ہو۔

سائنس کے تمام اصولوں کی ٹامک ٹوئیاں اس کائنات کے رازوں کی تلاش میں ہیں اور یہی میرے اللہ کا مقصود ہے لیکن اللہ کو ماننے اور سائنس کو آخری حقیقت سمجھنے والے میں ایک فرق ہے۔ اللہ کو ماننے والا یہ بات مان کر چلتا ہے کہ جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ اللہ کا ہے اور وہ اسباب کا محتاج نہیں۔ وہ خود اسباب پیدا کر سکتا ہے اور انہیں ختم بھی کر سکتا ہے جبکہ سائنس کو ماننے والا جب نارسائی کی آخری منزل پر پہنچتا ہے تو پھر اللہ کے وجود یا کسی مافوق الفطرت طاقت کا قائل ہوتا ہے۔ ریسرچ یا تحقیق کا ایک بنیادی طریق کار ہے کہ ہم ایک مفروضہ بناتے ہیں اور پھر تحقیق سے اسے غلط یا صحیح ثابت کرتے ہیں۔ میرے یہ دوست بغیر مفروضے کے سائنس پر ایمان لاتے ہیں اور پھر بے بسی میں اللہ کا نام لینے لگتے ہیں۔ وہ بھی ایسے کہ بخار تو ڈاکٹر ٹھیک کرتا ہے لیکن مریض اگر اچانک قومے سے باہر آ جائے تو معجزہ ہے۔ میرا اللہ اس دوئی اور شرک کو پسند نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ ''کوئی مصیبت آ ہی نہیں سکتی جب تک میرا اذن نہ ہو جائے (سورۃ تغابن) اسی لئے اسے ماننے والے ہر حال میں اسے ہی پکارتے ہیں‘ اسی سے مدد طلب کرتے ہیں اور وہ حکمرانوں کو‘ مسئلہ حل کرنے والوں کو طاقت عطا کرتا ہے‘ ان کی تدبیروں میں برکت ڈالتا ہے‘ ان کی نیتیں درست کرتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو وہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ جو اہل ایمان ہیں ان کے لئے یہ آزمائش ہے اور جو نہیں مانتے ان کے لئے عذاب۔ جو آفت لوگوں کو اللہ کی طرف رجوع پر مائل کر دے وہ آزمائش میں بدل جاتی ہے اور اللہ اس میں انعام کا راستہ نکالتا ہے اور جس سے لوگ مزید اکڑ جائیں‘ گردنیں تن جائیں وہ عذاب ہوتا ہے اور دنیا ایسی بستیوں سے بھری پڑی ہے جہاں متکبر لوگوں کے اجڑے دیار عبرت کا نشان ہیں۔

اہل نظر کا پیغام۔ اہل اقتدار اور اہل انصاف سے

ہو سکتا ہے میری یہ صدا بھی رائیگاں جائے۔ لوگ اسے ایک دیوانے کی بڑ ایک فرسودہ دقیانوسی شخص کی خام خیالی سمجھ کر مسترد کر دیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں یہ پیغام ان لوگوں کے حکم پر سب تک پہنچا رہا ہوں جنہیں میرے اللہ نے بصیرت عطا کی ہے۔ جن کی ریاضت نیم شب اور خلق خدا کی خدمت نے انہیں اللہ کی ان رحمتوں اور برکتوں سے نوازا ہے کہ جن کے بارے میں ہادی برحق' رسول رحمت نے فرمایا "مومن کی فراست سے ڈرو' اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ان صاحبان بصیرت نے گزشتہ تین سال سے لوگوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنے اور اپنے گناہوں سے معافی طلب کرنے کے لئے کہا تھا۔ اللہ کے غضب کی نشانیاں بھی بتائیں۔ نشانیاں لوگوں پر ظاہر بھی ہوئیں لیکن ہماری اکڑی اور تنی ہوئی گردنیں اللہ کے حضور نہ جھک سکیں۔ اللہ نے سورہ السجدہ کی اکیسویں آیت میں فرمایا ہے "اور بڑے عذاب سے پہلے ہم انہیں کم درجے کا عذاب ضرور چکھائیں گے' شاید وہ باز آجائیں" ان چھوٹے چھوٹے عذابوں کے نظارے اس قوم نے گزشتہ سال سے دیکھنا شروع کیے۔ سیلاب آیا' اللہ نے انہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کی گردنیں کٹوا کر عذاب کا مزا چکھایا۔ عین اسی طرح جیسے اس نے سورہ الانعام کی 65ویں آیت میں بتایا۔ اس آیت کے مصداق ایک اور عذاب زلزلے کا تھا جس کا مزا 2005ء میں یہ قوم چکھ چکی تھی لیکن عوام نے لوگوں کی والہانہ خدمت کر کے میرے اللہ کو راضی کر لیا تھا۔ لیکن گزشتہ ایک سال سے اس قوم کے حکمرانوں سے لے کر تمام ارباب ثروت و اختیار تک سب کا لہجہ اور رویہ ہی عجیب تھا۔ دعوے تھے 'ہم مقابلہ کریں گے' ہم قابو پالیں گے' ہم کمر توڑ دیں گے۔ اللہ سے رجوع کرنے کی بجائے انہوں نے عالمی برادری کے سامنے دست سوال دراز کئے اور پھر بددیانت' بے ایمان' چور اور خائن کی لعنتیں سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اللہ کے دروازے کو چھوڑ کر کسی اور سمت دیکھنے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یوں ہماری حالت سورۃ بنی اسرائیل کی سولہویں آیت کے مصداق ہو گئی "اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ پھر وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں' تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے۔ پھر اس بستی کو تباہ اور غارت کر ڈالتے ہیں"۔ کیا ہمارے خوشحال لوگوں کا یہ حال نہیں کہ وہ عین سیلاب کی آفت میں اس ڈرامے میں مصروف ہیں کہ یہ ملک اللہ کے نام پر بنا تھا یا نہیں۔ کون بھتہ خور ہے اور کون غدار۔ اللہ کے دوسرے عذاب گروہوں میں تقسیم کر کے گردنیں کٹوانے کے چکر سے یہ نکل ہی نہیں سکتے۔ اور یہ نہیں نکل سکتے اس لیے کہ انہیں میرے اللہ نے اس عذاب میں جکڑا ہوا ہے اور اللہ کی تعلیمات کے برعکس نسل' رنگ' زبان اور علاقے کو اپنا ایمان تصور کرتے ہیں۔ ان کو عقل اور صبر اسی وقت آتا ہے جب یہ نسل اور علاقے کے نام پر جنگ عظیم اول اور دوم میں آٹھ کروڑ لوگوں کا خون بہا لیتے ہیں۔ یہ میرے اللہ کی سنت ہے کہ وہ ظالموں کو ظالموں کے ہاتھوں ختم کر کے زمین پر امن قائم کرتا ہے۔

لوگ سوال کرتے ہیں کہ ظالموں پر تو عذاب نازل ہوتا ہے لیکن پھر ہمارا کیا قصور۔ عام آدمی تو پہلے ہی اس ظلم کی چکی میں پس رہا ہے۔ میرے اللہ نے اپنے اس عذاب کا بھی طریق واضح کر دیا۔ وہ سورہ الانفال کی پچیسویں آیت میں فرماتا ہے "اور ڈرو اس وبال سے جو تم میں سے صرف ان لوگوں پر نہیں پڑے گا جنہوں نے ظلم کیا ہو گا اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے" ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول' اپنے ارشادات میں اس کو واضح کرتے ہیں۔ مسند احمد کی حدیث ہے۔ "اللہ خاص لوگوں کے عمل کی وجہ سے عام لوگوں پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک ان میں یہ عیب پیدا نہ ہو جائے کہ اپنے سامنے برے اعمال ہوتے دیکھیں اور انہیں روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں۔ جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو اللہ عام اور خاص سب پر عذاب نازل کرتا ہے"۔ روکنا تو ایک طرف ہم ظالموں کا ساتھ دیتے ہیں' ان کا دفاع کرتے ہیں۔ ان کے جھوٹ' ان کی کرپشن' ان کی بے انصافی پر اچھل اچھل کر انہیں شاباش دیتے ہیں' انہیں منتخب کرتے ہیں۔ ہم شاید دنیا کا وہ واحد ملک ہیں جہاں بے شرمی اور ڈھٹائی کیساتھ کرپشن اور بددیانتی کی وکالت کرنے والے شخص کو مظفر گڑھ سے جتاتے ہیں اور بغلیں بجا کر کہتے ہیں ہم نے اس کے خلاف ٹی وی پر بولنے اور کالم لکھنے والوں کا منہ کالا کر دیا۔ میرے اللہ نے صرف تین ماہ میں اس شہر کو سیلاب میں ڈبو دیا۔ یہ وارننگ تھی' لیکن ہم نے اللہ کے اس اشارے کو نہ سمجھنا تھا' نہ سمجھے۔ ہم تو اس غرور میں مبتلا تھے کہ ہم نے میڈیا کو شکست دے دی جو بددیانتی اور جعلی ڈگری کے خلاف مہم چلائے ہوئے تھا۔ تنی ہوئی گردنیں اور اکڑ گئیں۔ جو قدرت رکھتے اس بددیانتی کے خلاف اپنی رائے سے فیصلہ دینے کی' انہوں نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

میں دو دن قبل کراچی میں تھا۔ پورا شہر تین یا چار ظالم گروہوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ چھ ہزار لوگ مر چکے ہیں۔ لیکن یہ چھ ہزار سینے پر گولی کھا کر ان ظالموں کے خلاف آواز بلند کرنے کے لئے نہیں اٹھے۔ موت تو مقدر تھی۔ سینے پر گولی لگنے سے آتی یا ٹارگٹ کلر کی گولی سے۔ مجھے حکم دیا گیا کہ انہیں بتا دو کہ دیکھنے والی آنکھیں اللہ کے اشارے دیکھ رہی ہیں کہ اگر یہ اسی عصبیت میں تقسیم رہا تو کسی دن سمندر اچھل سکتا ہے۔ ایسے کہ بلند و بالا عمارتوں پر بھی پناہ میسر نہ ہو سکے۔ ادھر پنجاب میں حالات کو ٹھیک کرنے کے غرور میں مبتلا لوگوں کو اللہ نے نمرود کی طرح مچھر کے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ سورہ بقرہ کی چھبیسویں آیت میں اللہ فرماتا ہے۔ "بیشک اللہ نہیں شرماتا کہ وہ کوئی بھی مثال دے' چاہے کہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی زیادہ معمولی"۔ صاف پانی کا مچھر' امراء' شرفاء اور رؤساء کے گردونواح میں پلنے والا۔ جس شہر میں ایئرپورٹ کے ماحول اور آرائش و زیبائش اور ریلوے سٹیشن اور بسوں کے اڈے کی گندگی حکمرانوں کے رویے واضح کر دے وہاں اسی طرح کے عذاب ہی نازل ہوا کرتے ہیں۔ ہم بھی کس مٹی کے بنے ہیں' اپنا بیٹا بیمار ہو تو ہسپتال داخل کر کے ہاتھ میں تسبیح پکڑ لیتے ہیں' کوئی سیپارہ تھام لیتا ہے' کسی کو صدقہ و خیرات یاد آجاتی ہے۔ لیکن قوم جس کے ہم ذمہ دار ہیں اسے ڈینگی سے بچاؤ کی تدابیر بتائی جاتی ہیں اور تسلیاں دی جاتی ہیں کہ ہم قابو پالیں گے۔ لاکھوں روپوں کے اشتہارات میں سے ایک اشتہار بھی میرے اللہ سے رجوع کرنے کے لئے' اس سے اجتماعی استغفار کیلئے' اسے معافی طلب کرنے کے لئے نہیں دیا جاتا۔ ہم کیوں دیں۔ ہم خود اس پر قابو پائیں گے۔ ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک اللہ کے اس عذاب پر فتح حاصل نہیں کر لیتے۔ انہیں اندازہ نہیں کہ یہ تو ایک وارننگ ہے۔

صفائی کا موسم ہے' تطہیر کا عمل شروع ہے۔ میرے اللہ کا امر اور ارادہ کیا ہے یہ تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن بصیرت کی آنکھ جانتی ہے کہ اب اس خطے پر جس کے دروازے پر اللہ کے نام کی تختی سجی ہے کھلواڑ کرنے والوں کے انجام کا زمانہ ہے اہل نظر اب بھی اشکوں سے تر دعاؤں میں یہ التجا کر رہے ہیں کہ لوگ اللہ کی جانب رجوع کر لیں۔ اس آپریشن کی ضرورت نہ پڑے۔ کہا گیا پیغام پہنچا دو صاحبان اقتدار کو کہ لوگوں کو قتل و خون میں الجھا کر سیاست نہ کریں ورنہ پانی میں بہت طغیانی ہوتی ہے۔ مچھر کا حملہ تو ایک اشارہ ہے' تنی ہوئی گردنوں کو اللہ کے حضور اجتماعی طور پر جھکا لیں ورنہ زلزلے ان کے تعاقب میں ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جنہیں میرے اللہ نے خوابوں میں اشاروں سے بتایا کہ لاہور کی سرکاری رہائش گاہوں سے متکبر افسران ایسے بھاگ رہے ہیں جیسے چوہے بلوں سے سیلاب میں نکل بھاگتے ہیں۔ صاحبان انصاف کیلئے کہا گیا ہے کہ فیصلے جلد کر دو۔ سسٹم اللہ قائم رکھتا ہے' کسی عدالت کے فیصلے سے سسٹم مستحکم یا ناپائیدار نہیں ہوتا۔ انصاف کرو' جلد کرو۔ اس لیے کہ وقت بہت کم ہے۔ تطہیر کا عمل ہے' صفائی کا موسم ہے جھاڑ جھنکار نے صاف ہونا ہے اور میرے ملک نے ایسا سرسبز ہونا ہے کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو گی۔

کیتلی کی بھاپ

یہ تماشا ہی اور ہے۔ اس کے کرداروں کو بھی اس کا علم نہیں کہ وہ تماشا گا نے نہیں بلکہ خود تماشا بننے کے لیے چن لیے گئے ہیں۔ یہ نہ تو کوئی حیرت انگیز انکشاف ہے اور نہ ہی کوئی الہام یا کشف۔ یہ تو انسانی معاشروں کا بغور مطالعہ رکھنے والا شخص با آسانی بتا سکتا ہے کہ تبدیلی سے پہلے معاشروں میں ویسی ہی گھٹن اور حبس کی فضا ہوتی ہے جیسے گھرے بادل یا تیز موسلا دھار بارش کے آنے سے قبل ہوتی ہے۔ کہیں پرندے فضا میں پرواز کرنے لگتے ہیں تو کہیں جانوروں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ خاموش' پرسکون زمین کے سینے کے نیچے جب کھولتے لاوے ابلنے کو ہوتے ہیں یا چٹانیں سرکنے والی ہوتی ہیں زمین کے سینے پر رینگنے والے کیڑوں سے لے کر درختوں میں رہتے پرندوں تک سب بے چین ہو جاتے ہیں۔ یہ عام تحقیقی سچ ہے۔ آپ صدیوں پر محیط زلزلوں' طوفانوں یا آفتوں کے آنے سے قبل زمین پر بستے جانداروں کی حرکات و سکنات کا ریکارڈ اکٹھا کر لیں آپ کو ایک جیسی بے چینی اور اضطراب نظر آئے گا۔ مجھے اس بات پر بحث نہیں کرنا کہ ان کو کون باخبر کرتا ہے' کوئی کشف ہوتا یا الہام۔ اس لیے کہ شاید میرے بہت سے دوست اس کائنات کے حقیقی فرمانروا اللہ تعالیٰ کی ذات کو سائنس کی دنیا میں دخل در معقولات کی اجازت نہیں دیتے۔ بس اتنی بات کہہ کر ختم کر دیتے ہیں کہ ان جانوروں یا پرندوں کی کوئی ایسی جبلی صلاحیتیں ہوتی ہیں جو انہیں وقت سے پہلے آفتوں سے باخبر کر دیتی ہیں۔ حیوانی نفسیات پر کام کرنے والے سائنس دانوں نے انہی پیمانوں پر مختلف جانداروں کی مختلف حسوں کے معیار مقرر کیے ہیں۔ کسی کی دیکھنے کی صلاحیت زیادہ ہے تو کسی کی سونگھنے کی۔ لیکن یہ سب اس بات پر متفق ہیں ان کی انجان خطرہ محسوس کرنے کی صلاحیت انسان سے مختلف ہے۔

بالکل ایسے ہی انسان کی اجتماعی نفسیات کا مطالعہ کرنے والوں نے معاشروں' گروہوں اور قوموں کے مزاج' محل وقوع' موروثی رجحانات' اور معاشی و سیاسی حالات کو دیکھ کر کچھ پیمانے بنائے ہیں کہ کون سی قوم کب' کس وقت اور کس طرح اچانک آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے گی۔ اسے قوموں کی قوت برداشت کا پیمانہ کہا جاتا ہے۔ عموماً اس کی مثال گدھے اور لکڑیوں کے بوجھ سے دی جاتی ہے۔ جس پر آہستہ آہستہ لکڑیاں لادی جا رہی ہوتی ہیں۔ گدھے کا مالک زیادہ بوجھ لے جانے کے چکر میں لکڑیاں لادے جا رہا ہوتا ہے۔ اس کے پاس چند لکڑیاں رہ جاتی ہیں اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ جہاں گدھے نے اتنے من بوجھ اٹھالیا ہے یہ چند لکڑیاں اور بھی اٹھا لے گا۔ لیکن وہ جیسے ہی ایک اور لکڑی گدھے کی پیٹھ پر لادتا ہے' گدھا یا تو ایک دم بوجھ کے زور سے زمین پر گر جاتا ہے یا پھر یوں اچھلتا ہے کہ ساری لکڑیاں زمین پر گر جاتی ہیں۔ یوں تو فرق اس ایک لکڑی کا ہوتا ہے کہ اگر وہ نہ رکھی جاتی گدھا پرسکون رہتا لیکن اس کے پیچھے وہ منوں بوجھ بھی ہوتا ہے جو مستقل گدھے کی پیٹھ پر لادا جا رہا ہوتا ہے۔ مالک کا زیادہ بوجھ ڈالنے کا لالچ اور گدھے کی قوت برداشت کی آخری حد' قوموں کی تاریخ میں جبر' ظلم' زیادتی' ناانصافی اور بھوک کے بوجھ تلے دبے ہوئے عوام اور ان کے اچانک غیظ و غضب میں باہر نکلنے سے تعبیر کی جاتی ہے۔ تاریخ کا سائنسی مطالعہ کرنے والے اور قوموں کی اجتماعی نفسیات کے علوم کے ماہر قوموں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بتا سکتے ہیں کہ یہ قوم کب اور کس وقت ٹوٹے گی' اچانک بھڑک اٹھے گی اور اس کا مزاج جاننے والے بتا سکتے ہیں کہ یہ قوم بوجھ کی آخری لکڑی کے بعد بالکل بیٹھ جائے گی یا رسہ تڑوا کر یوں اچھلے گی کہ بوجھ لادنے والے کو روندتی ہوئی آزاد ہو جائے گی۔

66 سال' ایک قوم' ایک حیران کن اجتماعی مزاج۔ مجھے 1980ء میں رائل کالج آف سائیکٹری لندن کے سربراہ' لنفورڈ ریز کی وہ تحقیق یاد آ رہی ہے جو انہوں نے پاکستانی معاشرے کے اندر اضطراب' بے چینی اور Aggression پر کی تھی۔ انہوں نے اس ملک کی گالیوں کا تجزیہ کیا وہ شدید قسم کے گھٹے ہوئے غصے اور کچلی ہوئی بے چینی کا اظہار کرتی ہیں' دنیا کی کسی قوم میں اسقدر مفصل گالیوں کا ذخیرہ نہیں۔ ان کے اندر دبا ہوا اضطراب ایک ایسی طاقت کی طرح ہے جیسے کیتلی میں بھاپ ہوتی ہے اور اس پر ڈھکن رکھ دیا جائے' وزن رکھ دیئے جائیں لیکن وہ ان کو اچھال کر پھینک دیتی ہے۔ پاکستانی قوم میں وہ دبا ہوا اضطراب' بے چینی اور غصہ اسقدر ہے کہ راہ چلتے ٹھڈے مارتے ہوئے گزریں گے' پوری بس خالی ہے لیکن چھت پر سفر کریں گے' سوئے ہوئے کتے کو پتھروں اور ٹھڈوں سے جگائیں گے۔ پروفیسر ریز کے مطابق اس قوم کی یہ طاقت بالکل سٹیفن سن کے سٹیم ریلوے انجن کی طرح ہے جو ایک لمبی ٹرین کھینچ سکتا ہے۔

اس قوم کا اضطراب' غصہ' بے چینی سب مل کر کیتلی کی وہ بھاپ ہیں جو ڈھکن اچھال دینے کے لئے بے تاب ہے۔ پہلے اس قوم کی اس طاقت کو جو بھاپ کی طرح ریل گاڑی کھینچ سکتی ہے طرح طرح سے تقسیم کر دیا گیا۔ جیسے کیتلی کا ڈھکن اٹھا کر بھاپ نکال دی جاتی ہے۔ دو پارٹیوں کے لیڈر ایسے نفرتوں سے لڑے کہ طوفان آ گیا' مذہبی' علاقائی' نسلی' اور گروہی بنیاد پر بھاپ نکال دی گئی۔ لوگ اپنا اشتعال تقسیم کرتے رہے۔

لیکن اب نہیں شاید۔ پہلے اس جبر' غربت' بھوک اور بیماری کے دباؤ' موت کا کھیل اور زندگی سے مایوسی کا عالم چند لوگوں' علاقوں یا خطوں تک محدود تھا۔ باقی لوگ چین سے نیند سوتے تھے۔ کہتے تھے یہ سیاستدانوں کا' مولویوں کا' یا فلاں گروپ کا مسئلہ ہے لیکن اس دفعہ تماشا ہی اور ہے۔ تاریخ کا علم رکھنے اور اجتماعی نفسیات کے طالب علم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ہر پیمانے سے یہ قوم اس مقام پر آ پہنچی ہے جہاں اب گدھے پر ایک اور لکڑی بھی رکھی گئی تو یا تو یہ بالکل مر بیٹھ جائے گا یا پھر سب رسیاں تڑوا کر آزاد ہو جائے گا۔ اب اسے تھپکیوں' پیار یا تھوڑی سی گھاس منہ میں دینے سے مزید بوجھ اٹھانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا پیمانہ یہ ہے کہ جب لوگوں کو اپنے لیڈروں کی زبانوں پر اعتبار نہ رہے۔ وہ ان کی آپس کی لڑائیوں کو محض ایک ڈرامہ تصور کرنے لگیں۔ انہیں یہ سارا کھیل تماشہ ایسے محسوس ہو کہ ان کو لوٹنے کے لئے لگایا گیا ہے۔ موت' بیماری' بے چینی' بے روزگاری اور غربت کیتلی کی بھاپ کو آگ دے رہی ہوں تو پھر اس کیتلی پر کتنا بڑا پتھر ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے اس نے ڈھکن اچھال کر پھینکنا ہے۔ جتنا زیادہ بھاپ روکو گے کیتلی اتنی ہی زور سے پھٹے گی۔ کیتلی پھٹتی ہے ارد گرد بھی طوفان برپا کرتی ہے' تیونس سے مصر' یمن' شام' بحرین اور لیبیا۔ یہ سب ایک لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہاں بھی ایک لمحے کا انتظار ہے۔ ایک لکڑی اور ڈالو اور پھر دیکھو۔ بس ایک غلطی' ایک حالات کنٹرول کرنے کے لئے اقدام اور پھر دیکھو سٹیج کیسے الٹتا ہے' بھاپ کا شور اور تراخ پڑاخ کیسے ہوتی ہے۔ بساط کیسے الٹتی ہے۔

نوٹ: مردان کے ایک شریف النفس انسان کو اپنے مسائل کے حل کے لئے مدد نہیں قرض حسنہ درکار ہے۔ کوئی صاحب خیر اگر ایسا کرنا چاہیں تو ان سے خود اس نمبر پر تسلی کر کے یہ نیکی کما لیں۔ 03065737903۔

حقوق کی جنگ' باعزت جرائم پیشہ' مافیاز

دنیا کی تاریخ میں ڈاکوؤں اور مجرموں کے گروہ ہمیشہ سے رہے ہیں لیکن یہ سب کے سب حکومتوں سے خوفزدہ' ڈرے اور سہمے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کی پناہ گاہیں ایسی جگہوں پر ہوتیں' جہاں حکومتی عملداری کمزور ہو یا پھر سرکاری فوج یا قانون نافذ کرنے والی سپاہ کو پہنچنے میں کچھ دیر لگتی ہو۔ یوں ان کا اپنا مخصوص جاسوسی نظام انہیں اطلاع دے دیتا اور وہ مخصوص علاقہ چھوڑ کر ادھر ادھر روپوش ہو جاتے۔ اسی لئے ڈاکوؤں اور مجرموں کی کمین گاہیں عارضی نوعیت کی ہوتی تھیں۔ ان کی وارداتیں بھی مختصر دورانیے کی حامل ہوتیں۔ کسی قافلے کو لوٹا' رات کے وقت کسی گاؤں کا گھیراؤ کر کے اس کے امراء کے گھروں میں لوٹ مار کرنی یا یہ ڈاکو یا مجرم پورے معاشرے سے علیحدہ اور الگ تھلگ تصور ہوتے۔ شہروں میں گھومتے بھی تو بھیس بدل کر۔ اسی لئے جب کبھی کسی حکمران تک عوام کی شکایات کا سلسلہ طول پکڑتا تو وہ تھوڑی سی طاقت استعمال کر کے ان کا قلع قمع کر دیتا۔ قدیم ترین ادوار میں ان گروہوں کے خلاف کارروائیوں کی مثالیں تاریخ میں عام ملتی ہیں۔ قدیم ترین تہذیب یوم پیائی میں جب بحری قزاقوں نے زور پکڑا تو حکومت نے چند ہفتوں کے اندر ان کا قلع قمع کر دیا۔ موجودہ دور میں بھی ڈاکوؤں کے اڈے یا مجرموں کے ٹھکانے حکومتی اہلکاروں کی ملی بھگت سے قائم رہتے ہیں اور لوٹ مار میں سے ایک حصہ ان سرکاری سرپرستوں کو بھی ملتا رہتا ہے۔ پنجاب میں دریاؤں کے بیلے اور سندھ میں کچے کا علاقہ اسی طرح کے جرائم پیشہ گروہوں کی آماجگاہ ہے۔ بحری قزاق بھی سمندری حدود میں موجود جزیروں پر رہتے اور وہیں سے اپنی کارروائیاں کرتے۔ ان تمام منظم مجرموں کے بارے میں ایک بات مشترک ہوتی ہے کہ انہیں عوام ناپسند کرتے ہیں۔ ان سے لاتعلق ہوتے ہیں اور ان کے خلاف حکومت کی ہر کارروائی کی حمایت اور مدد کرتے ہیں۔ ایک اور بات بہت اہم ہے کہ جن معاشروں میں لوگ اپنے گھروں میں اسلحہ رکھتے ہیں' یا اپنی حفاظت خود کرتے ہیں' وہاں ڈاکوؤں اور مجرموں کے گروہ بہت کم ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بلوچستان اور سرحد کی مثال واضح ہے۔ ان علاقوں میں سالہاسال گزر جاتے ہیں لیکن ڈکیتی کی کوئی واردات نہیں ہوتی۔

ڈاکوؤں اور مجرموں کے ان گروہوں سے ریاستیں شروع ہی سے برسرپیکار رہی ہیں۔ لیکن مافیا ان سب سے مختلف ہے' نہ ان کے ٹھکانے شہروں سے باہر ہوتے ہیں' نہ یہ کوئی الگ تھلگ مخلوق نظر آتے ہیں' بلکہ ان کے اہم ترین لوگ اعلیٰ مناصب پر فائز اور شہروں کی' بلکہ ملکوں کی سیاسی زندگی کے اہم ستون ہوا کرتے ہیں' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مافیاز جنم کیسے لیتے ہیں؟ اور پھر یہ ان شہروں پر قابض کیسے ہو جاتے ہیں؟ دنیا بھر میں مافیاز کی تاریخ اور اس کے آغاز کو دیکھیں تو ایک حیرت کا جہان سامنے آتا ہے۔ دنیا کے تمام مافیاز سب سے پہلے حقوق کی جنگ اور دوسری قوموں کی بالادستی کے خلاف جدوجہد سے شروع ہوئے۔ اٹلی مافیاز کی جنم بھومی ہے' جہاں بیرونی تسلط اور سیاسی بے چینی نے ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ افراد کے گروہوں کو معزز بنا دیا۔ قرون وسطیٰ کے سسلی میں مافیا کا مقصد غیر ملکی علامتوں اور قابض گروہوں سے نفرت کا نام تھا۔ تاوان' بھتہ' لوٹ مار یہ سب پہلے ان قابض گروہوں کے ارکان سے لیا جاتا۔ شہر میں کئی گروہ بن گئے' جن کے اپنے اپنے خیر خواہ وہاں موجود ہوتے جو ان کو آبادیوں میں عزت بھی دیتے اور جرم کے بعد چھپنے کی جگہ بھی۔ ان مافیاز نے کرائے کے غنڈوں کی ایک فوج بنا رکھی تھی' جو بظاہر حقوق اور آزادی کی جنگ لڑ رہی ہوتی لیکن ساتھ ساتھ اہم حکومتی شخصیات سے تاوان' بھتہ یا لوٹ مار سے پیسہ بھی وصول کرتی۔ ان کا شکار اہم سرمایہ دار اور کسان بھی ہوتے' جن سے وہ حقوق اور آزادی کی جنگ کے لئے بزور سرمایہ وصول کرتے۔ لیکن 1860ء میں جب اٹلی اٹلی والوں کا ہو گیا تو بظاہر ایسے گروہوں کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی تھی' لیکن اب یہ سب کے سب معزز لوگ تھے۔ آزادی کے ہیرو' سیاسی رہنما' اب انہیں احساس ہو گیا کہ جرم کے ذریعے روزی کمانا کوئی قابل عزت بات نہیں ہے' لیکن یہ سب کے سب ایک معاشرہ بن چکے تھے۔ یہ سارے کے سارے اشرافیہ میں داخل تھے۔ نیا اشرافیہ جسے مورخین سسلی کا جرائم پیشہ اشرافیہ کہتے ہیں۔ اس نئے اشرافیہ کے اپنے قواعد وضوابط تھے' اپنے اصول اور اپنا بھائی چارہ۔ یہ دراصل حکومت کے اندر ایک خفیہ حکومت تھی۔ یہ عام کسانوں اور دکانداروں سے غنڈہ ٹیکس وصول کرتے اور پھر انہوں نے اس کا نام محافظ ٹیکس رکھ دیا۔ اس ٹیکس کی آمدنی سے انہوں نے پولیس اور ججوں کو بھی ساتھ ملا لیا اور یوں نہ ان کے خلاف کوئی کیس ہوتا اور اگر ہوتا تو وہ باعزت بری ہو جاتے۔ 1890ء تک یہ مافیا اس قدر مضبوط تھا کہ کوئی سیاسی حکومت ان کی مدد کے بغیر مستحکم نہیں رہ سکتی تھی۔ اس مافیا نے اپنے منظم جرائم یعنی تاوان اور بھتہ خوری کو ایک خوبصورت چہرہ دینے کی کوشش کی اور وہ چہرہ تھا خدمت خلق یا غریب ونادار لوگوں کی مدد۔ اسی لئے 1890ء میں سسلی کے مافیا کا سربراہ فیرو رحم دل "FerotheKindHeart" تھا۔

مافیا جب کسی ملک میں اس قدر منظم ہو جائے کہ اس کے عوام اس کے ہاتھوں محبوس ہو جائیں' سیاسی اور انتظامی طور پر اس پر کوئی گرفت کرنے والا نہ ہو تو پھر یہ ملکوں کی حدود پھلانگ کر عالمی مافیا کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہی کام فیرو رحم دل نے کیا۔ وہ اپنے اطالوی مافیا کو امریکہ لے گیا۔ شکاگو' نیویارک' لاس اینجلس حتیٰ کہ امریکہ کا ہر بڑا شہر اس مافیا کا مرکز بنتا گیا۔ یہیں سے مافیا کا بڑا کردار ال کپون منظر عام پر آیا۔ اپنے ظلم اور بربریت میں مکمل' لیکن اس کا زمانہ 1930ء کی معاشی بدحالی کا دور تھا۔ اس نے اپنی لوٹی ہوئی دولت سے غریبوں اور ناداروں کے مفت کھانے کا انتظام کیا۔ اس کے اداروں پر ہزاروں لوگوں کی لائنیں لگی رہتیں' لیکن اس کے خوف سے لوگ تھر تھرا بھی رہے ہوتے۔ اس کا قتل اور بھتے کا دھندہ بھی چلتا رہتا۔ اس کی دیکھا دیکھی پورے امریکہ میں مافیاز کے متعدد گروہ وجود میں آگئے جو ہر قسم کے دھندے میں ملوث تھے اور ایک دوسرے سے بھی لڑتے رہتے تھے۔ انہوں نے شراب پر پابندی لگوائی اور پھر اس آڑ میں شراب کا خفیہ کاروبار کر کے اربوں ڈالر کمائے۔ کارلو' کلوسیو' شلز' لوسیانو' کیسے بڑے بڑے معززین سامنے آئے جو معاشرے کا حصہ بھی تھے اور جرائم پیشہ گروہوں کے سربراہ بھی۔

دنیا کے ہر معاشرے میں مافیاز کے جنم لینے کی تاریخ ایسے ہی ہے۔ پہلے حقوق کی جنگ کے نام پر جرائم پیشہ لوگ معزز ہو جاتے ہیں۔ انہیں ریاستی دہشت گردی کے خلاف نفرت کی علامت سمجھا جانے لگتا ہے۔ یوں وہ ایک خاص طبقے میں مقبول ہو جاتے ہیں' لیکن لوٹ مار کا نشانہ نسبتاً متمول لوگ ہوتے ہیں۔ پھر ان منظم جرائم پیشہ گروہوں کو معاشرتی سیاسی مقام حاصل ہو جاتا ہے لیکن یہ جرم سے کمائے جانے والے آسان پیسے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ اپنے ہی مداحوں کے گھر پر ڈاکہ ڈالنے لگتے ہیں۔ پورے کے پورے شہر کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ ایسے میں مافیاز کے خلاف دنیا بھر میں نجات کے دو ہی راستے ہمیشہ سے رہے ہیں' ایک یہ کہ لوگ ان سے ویسے ہی نفرت کرنے لگیں جیسے ڈاکوؤں اور مجرموں سے کرتے ہیں اور ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں یا پھر یہ گروہ جس شہر میں گھس آئیں اور قابض ہو جائیں' اس شہر کو سیاست سے پاک انتظامیہ کے حوالے کر دیا جائے جو ان سے لوگوں کو نجات دلا دے۔

باغ کو ہرا بھرا تو ہونا ہے

کتنے سوال لوگوں کے ذہنوں میں جنم لے رہے ہیں۔ یہ جو تبدیلی کی نوید سنائی جارہی ہے کیا یہ ممکن ہے۔ آثار تو ایسے دکھائی نہیں دے رہے۔ کون ہے جو ہمیں اس منجدھار سے نکالے گا۔ سب کے سب تو بددیانت اور چور ہیں ۔ہر کوئی ذاتی مفاد اور مصلحت سے کام لے رہا ہے۔ فوج کو بھی تین دہائیوں سے زیادہ آزما کر دیکھ لیا۔ یہ جو پورے ملک میں نفرت اور تعصب کی وبا ہے' لوگ گلے کاٹ رہے ہیں' دھماکے ہو رہے ہیں' اغوا برائے تاوان ہے' بوری بند لاشیں ہیں۔ یہ سب کیسے ختم ہو جائے گا۔ وہ صاحبان بصیرت جو اس مملکت خداداد پاکستان کے روشن مستقبل کی خبریں لوگوں کو گزشتہ پچاس سال سے سناتے آرہے ہیں' ان کے پورا ہونے کی کوئی صورت تو نظر نہیں آتی۔ پھر کیا یہ محض ایک تسلی ہے' دلاسہ ہے یا سہانا خواب۔ گزشتہ کالم میں جب میں نے لیلۃ القدر یعنی اس خاصہء خاصان رات کو امرِ الٰہی کے فیصلوں میں چھپی تبدیلی کا تذکرہ کیا' جو مجھے محسوس کرنے والے ذہنوں اور دیدہ بینا رکھنے والے انسانوں نے بتائی تھی تو جہاں لوگوں کو اس خوشخبری پر ایک گونہ اطمینان تھا وہاں سوال کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ عجیب و غریب سوال تھے۔ آپ کی بات ماننے کو جی تو چاہتا ہے لیکن حالات اور آثار ایسے نظر نہیں آتے۔ کیسے ہو سکتا ہے' کون کرے گا' پوری قوم بددیانت اور بزدل ہے' کون بدلے گا یہ سب کچھ۔

ظاہری اسباب پر یقین رکھنے اور سائنس کے بنیادی کلئے علت و معلول (CauseandEffect) کی بنیاد پر ہر چیز کو پرکھنے والوں کے ساتھ ایک بہت عجیب و غریب معاملہ ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ اسے اس کائنات کا مالک حقیقی بھی مانتے ہیں' لیکن کسی واقعے' تبدیلی یا ترقی و تخریب پر یقین کرنے کے لئے اسباب کا ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ یوں ان کا سارا ایمان اسباب کے گرد گھومنے لگتا ہے اور اللہ کی اس طاقت سے وہ ناآشنا ہو جاتے ہیں وہ جاتے ہیں کہ وہ خالق اسباب بھی ہے۔ توکل کی جو تعریف ہے وہ یہی ہے کہ پہلے خالق اسباب پر مکمل بھروسہ اور یقین پیدا کرو اور پھر اسباب کی تلاش میں نکلو۔ وہ خود اسباب پیدا کردے گا۔

آئیں اس بحث کو خالص سائنسی' تاریخی اور جدلیاتی پس منظر میں دیکھیں۔ وہ جو اللہ پر یقین نہیں رکھتے لیکن ان کو دنیا بھر کے علوم میں موجود بڑے بڑے فلسفیوں' مورخوں اور کائنات کے نظام کا سائنسی بنیادوں پر تجزیہ کرنے والوں کی تھیوریاں ضرور دل کو بھاتی ہیں۔ وہ ان پر یقین کرتے ہیں اور پھر ان کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان سب عالمانِ تاریخ و جدلیات نے قوموں کی تبدیلی' تباہی اور برتری کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ سب کے سب جب کسی ایسی صورت حال کا جائزہ لے رہے ہوں جہاں بظاہر اسباب ساتھ نہ دے رہے ہوں تو فطرت یا مافوق الفطرت طاقت کی کارفرمائی کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں۔ ان سب کا پیشوا ہیگل اس کائنات یا معاشروں کے نظام کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلا دور تھیسس (Thesis) ہے یعنی ایک معاشرہ جس میں تمام اقدار' روایات' اخلاقیات' دیانت اور انصاف قائم ہے اور وہ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ لیکن پھر یہ معاشرہ یا قوم شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتی ہے۔ دیانت کی جگہ بددیانتی' اخلاق کی جگہ بداخلاقی اور انصاف کی جگہ بے انصافی کا راج ہو جاتا ہے۔ وہ اس دور کو اینٹی تھیسس (Anti-Thesis) کا دور کہتا ہے۔ لیکن معاشروں اور قوموں کا جائزہ لینے کے بعد اور تاریخ کا طویل تجزیہ کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ اینٹی تھیسس کا دور جب تکمیل کے آخری مراحل میں ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے اب یہ قوم مکمل طور پر تباہ ہو جائے گی اور اس کے اٹھنے کی کوئی امید باقی نہیں رہتی تو وہ لکھتا ہے کہ کہیں نہ کہیں سے "عقل کل" (DivineWisdon) ان دونوں ادوار میں اچھی چیزوں کی بقا کے لیے دخل اندازی کرتی ہے جسے وہ قوموں کی تاریخ کا تیسرا دور سن تھیسس (Synthesis) کہتا ہے۔ یہاں اس کے سامنے اسباب کے سارے سہارے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی عقل بے بس اور دلیل ہار جاتی ہے اور وہ سب کچھ "عقل کل" پر چھوڑ دیتا ہے۔ ایسی ہی منطق بار بار ٹائن بی نے بھی دی اور بہت سے محققین بھی دلیل کی موت پر کسی اچانک ظہور پذیر ہونے والی تبدیلی کو فطرت کی کارفرمائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہمارا عالم بھی یہ ہے' فطرت یا عقل کل پر یقین کر لیتے ہیں کہ ایسا فلسفیوں اور محققوں کی زبان سے نکلا ہے لیکن اللہ کی اس قدرت پر ایمان نہیں لاتے کہ اسے کسی قوم کو بدلنے' دلوں کو پھیرنے یا ترقی پر گامزن کرنے کے لئے کسی وجہ' سبب یا علت کی ضرورت نہیں' وہ یہ سب جس وقت اور جب چاہے پیدا کر سکتا ہے۔

ہماری حالت بھی طویل عرصے سے ایک ایسی قوم کی صورت ڈھل چکی ہے کہ جس میں تخریب اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔ بددیانتی کی جڑیں عام آدمی سے لے کر اعلیٰ ترین عہدوں تک سرایت کر گئی۔ انصاف نام کی چڑیا کو تعصب کے تیر مار مار کر زخمی کر دیا گیا ہے۔ یہ تعصب علاقے' زبان' نسل' گروہ اور پارٹی کا تعصب ہے جس میں اپنے ساتھی کی حمایت اور دوسرے کی نفرت بنیاد ہے۔ ہم شاید دنیا کے چند ممالک میں سے ہیں جہاں اپنے رہنماؤں اور ساتھیوں کے جھوٹ' کرپشن' بددیانتی اور بداخلاقی کی سرعام وکالت کی جاتی ہے۔ اپنوں کی موت پر غم اور دوسرے کی موت پر لڈیاں ڈالی جاتی ہیں۔ جھوٹی قسموں کا رواج ہے اور وعدوں سے پھرنے کو سیاست کہا جاتا ہے۔ مایوسی کا وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے کہ کسی رہنما' لیڈر یا قائد کی صورت کوئی امید کی کرن نظر نہیں آتی۔

ایسے حالات ہوں تو اللہ کے فرامین' پیغمبروں کی ہدایت اور صاحبان باصفا ایک ہی تلقین کرتے ہیں کہ اللہ کی طرف معافی اور استغفار سے رجوع کرو کیونکہ برا حاکم اور برے حالات اعمال کی سزا ہوتے ہیں۔ گزشتہ دو سال سے بار بار استغفار کا کہا جاتا رہا۔ اجتماعی استغفار کا۔ لیکن اکڑے ہوئے سروں اور تنی ہوئی گردنوں کو یہ منظور نہ تھا۔ ایسے میں بے بس' مظلوم اور مجبور انسانوں کی آہ و بکا اور چیخ و پکار سے لبریز صدائیں عرشِ معلی کے دروازے کھٹکھٹاتی رہیں۔ اللہ اپنی سنت کے مطابق جس کا اعلان وہ قرآن حکیم میں کرتا ہے' مصیبتیں اور آزمائشیں نازل کرتا رہا تاکہ ہم اس کی جانب لوٹ جائیں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اب اسے فطرت کہیں' عقل کل کہیں یا اللہ کی حکمت' ان حالات نے بدلنا ہے۔ لیکن جب تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے تو پہلے زمین ہموار کی جاتی ہے' اس میں سے جھاڑ جھنکار کو صاف کیا جاتا ہے' تکبر اور نخوت کے سخت پتھر اٹھا کر باہر پھینکے جاتے ہیں' پھر نئی رت کی فصل بوئی جاتی ہے۔ کسے خبر کہ یہ تطہیر اور صفائی کا عمل کیسے ہوتا ہے۔ لیکن اللہ اپنی حکمت عملی چھپاتا نہیں وہ بتاتا ہے کہ میں ظالموں کو ظالموں سے لڑا کر دنیا میں امن قائم کرتا ہوں۔ سروں پر سے بارش کی صورت عذاب نازل کر کے' پاؤں کے نیچے سے زمین کو تھرتھرا کر مکینوں کو ختم کرتا ہوں یا لوگوں کو گروہوں میں تقسیم کر کے گردنیں کٹوا کر عذاب کا مزا چکھاتا ہوں۔ ایسی آفتیں' ایسے المیے کہ تنی گردنیں اور اکڑے سر پکار اٹھیں کہ اللہ ہم پر رحم فرما اور پھر اس کا رحم امڈ آئے اور وہ حالات بھی بدلے' نیک قیادت بھی عطا کر دے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ باغ کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرنا ہے' اس میں خوبصورت گھاس بھی تلف ہو جاتی ہے لیکن باغ ہرا بھرا ہو جاتا ہے۔ جو قومیں اپنے حالات بدلنے کے لئے خود نہیں اٹھتیں' انہیں فطرت' عقل کل یا اللہ کی ذات کریم اپنی حکمت و دانائی سے درست کرتی ہے کیونکہ دنیا اس کا باغ ہے اور اسے ہرا بھرا تو ہونا ہے۔

اللہ کے ارادے سے پہلے

لگتا ہے ہم اس تعصب اور ناانصافی کے دور میں داخل ہو چکے ہیں کہ جب ہمیں اپنی نسل، رنگ اور زبان بولنے والا مظلوم، بے گناہ اور معصوم نظر آتا ہے خواہ وہ بددیانت، چور اور قاتل ہی کیوں نہ ہو اور دوسری نسل، رنگ اور زبان بولنے والا ظالم، بددیانت، لٹیرا اور قاتل دکھائی دیتا ہے خواہ اس کی نیکی اور پارسائی کی لوگ قسمیں کیوں نہ اٹھائیں۔ دنیا کی تاریخ میں یہ قوموں کا بدترین دور ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں زوال اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس رویے کے جنم لینے اور اس کی نشوونما میں ہر کسی نے اپنا حصہ ڈالا۔ ہر گروہ نسل، فرقے اور سیاسی پارٹی نے اپنا کردار بڑھ چڑھ کر ادا کیا۔ وہ جنہیں اس ملک کا اقتدار سونپا گیا ان کا کردار تو اس معاملے میں انتہائی گھناؤنا تھا۔ یہ اقتدار خواہ کسی سیاسی پارٹی کے پاس تھا یا براہ راست فوج کے پاس۔ اس کی تازہ ترین مثال میں نے کل صبح پنجاب کے ایک محکمے کے سیکرٹری کے کمرے میں دیکھی۔ ایک سرکاری افسر کے خلاف انکوائری کے بعد سزا کا تعین ہونا تھا۔ انکوائری افسر نے معلوم نہیں کن مجبوریوں سے کم سے کم سزا کی سفارش کی تھی۔ دو ایم پی اے حضرات سیکرٹری کا گھیراؤ کیے ہوئے تھے۔ سیکرٹری کہہ رہا تھا، میں وارننگ کر دیتا ہوں اور دوسری جانب اصرار یہ تھا کہ ہمارے بندے کو وارننگ ہو یہ ہم کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ ایسا رویہ اس ملک پر گزشتہ کئی دہائیوں سے چھایا ہوا ہے۔ اگر فوج برسر اقتدار ہے تو کسی کی کیا مجال کہ ایک سپاہی سے لے کر جرنیل تک پر انگلی بھی اٹھا سکے۔ ساری بددیانتی، چور بازاری اور لوٹ مار تو سویلین کرتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کی ہر بڑی اور چھوٹی سیاسی جماعت نے افسروں، تاجروں، کسانوں، غنڈوں اور بدمعاشوں سب میں اپنے گروہ بنا لئے ہیں۔ ان میں سے ایک پارٹی دوسرے کو جینے کا حق نہیں دینا چاہتی اور دوسری پارٹی اپنی مخالف پارٹی کے گروہ کے افراد کی زندگی اجیرن بنا دیتی ہے۔ کبھی کسی نے اپنے مخالف گروہ کے ایماندار آدمی کے لئے کلمہ خیر نہیں کہا۔ ایک دور کے کھڈے لائن دوسرے دور کے اعلیٰ عہدوں پر براجمان افسران ہوتے ہیں۔ ایک وقت کے غنڈے اور بدمعاش پس پردہ چلے جاتے ہیں اور اپنے آقاؤں کی آمد پر زمین پر دندنانے لگتے ہیں۔ وکیلوں، ڈاکٹروں، مزدوروں اور تاجروں کے کسی گروہ پر کوئی انگلی اٹھا کر دکھائے۔ بھیڑیوں کے غول کی طرح اس کے دفاع کے لئے جھپٹ پڑتے ہیں۔ اپنے قاتلوں، چوروں اور بدمعاشوں کا اس طرح تحفظ کرتے ہیں جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے سمیٹ لیتی ہے۔ نسل کی بنیاد پر تعصب تو انتہائی خونخوار ہے۔ اس تعصب کی بھینٹ جتنی جانیں چڑھ چکی ہیں دنیا میں کسی دہشت گردی یا جنگ میں بھی اتنی جانوں کا ضیاع نہیں ہوا۔ بلکہ دنیا میں ہونے والی دو عالمی جنگیں جن میں آٹھ کروڑ کے قریب لوگ لقمہ اجل بنے خالصتاً نسل اور زبان کی بنیاد پر لڑی گئیں۔ ہٹلر کا یہ دعویٰ کہ جرمن قوم سب سے بالاتر ہے، اس دنیا میں تباہی کے لئے زہر قاتل ثابت ہوا۔ ہمارے ہاں بھی اس رنگ نسل اور علاقے کے تعصب نے جتنی قتل و غارت کی اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ ہم اسقدر بددیانت ہیں کہ ہم نے موت پر بھی اپنے اپنے القابات تخلیق کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے والا شہید ہے اور دوسرے والا ہلاک۔ اس شہید اور ہلاک کی جنگ میں ایک اور لفظ جاں بحق تخلیق کیا گیا۔ یعنی ایسا بے یار و مددگار شخص جو کسی سیاسی پارٹی، کسی لسانی گروہ یا کسی نسل پرست تنظیم سے متعلقہ نہ تھا، جس کا کوئی فرقہ واضح نہ تھا وہ جان سے گیا تو نہ شہید اور نہ ہلاک، بس جاں بحق ہو گیا۔ ہمارا یہی رویہ ہے کہ اگر ہمارا کوئی شخص مرے تو اس کی لاش مسخ شدہ ہے، تشدد سے مارا گیا ہے اور دوسروں کو قتل کر دو، ان کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو تو سر فخر سے بلند کر کے ذمہ داری بھی قبول کر لو۔ ہمارے رہنماؤں کی گروہ بندیوں نے لوگوں کے درمیان وہ نفرتیں پیدا کی ہیں کہ اب آگ کے شعلے ایسے بھڑک رہے ہیں کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے۔ ابھی کراچی میں آپریشن شروع نہیں ہوا کہ مختلف قسم کی وڈیوز پورے ملک میں پھیلائی جا رہی ہیں کہ ایک مخصوص گروہ کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ ان میں ایک وڈیو ہے جو ایک بچے کے ساتھ زبردستی جنسی فعل پر مبنی ہے۔ ویسی ہی وڈیو جیسی سوات آپریشن سے پہلے منظر عام پر لائی گئی تھی جس میں ایک عورت کو کوڑے مارے جا رہے تھے اور وہ سین ختم ہونے یا ڈائریکٹر کے کٹ کہنے پر اٹھ کر چلنے لگتی۔ اس وڈیو میں بھی ایک عجیب کمال ہے۔ وڈیو خفیہ بنائی گئی ہے لیکن جنسی زبردستی کرنے والوں نے اپنے چہرے ڈھانپے ہوئے ہیں۔ ایک خاص زبان کے الفاظ بولے جاتے ہیں لیکن بولنے والا نظر نہیں آتا۔ تھپڑ بعد میں پڑتا ہے اور آواز پہلے سنائی دیتی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود نفرت کا لاوا کھولانے کے لئے یہ کافی ہے۔ ایسی ایک دو وڈیوز اگر دوسری جانب سے میدان میں آ گئیں تو پھر نفرت کا جو بیج میرے ملک کے رہنماؤں نے اس دھرتی پر بو دیا ہے، آپ کسی آپریشن کرنے والے سپاہی کو بھی اس سے محفوظ نہیں رکھ سکیں گے۔

کیا ایسا صرف رہنماؤں کی بیان بازیوں سے ہوا۔ کیا صرف لیڈران اور فوج ذمہ دار ہے یا نسلی تعصب کے نمائندے۔ ہرگز نہیں، وہ سولہ کروڑ عوام جنہوں نے ان لوگوں کو یا تو اپنا رہنما تسلیم کیا یا پھر ان کے ظلم پر خاموش رہے۔ جنہوں نے کبھی انصاف کے ساتھ، عدل کے ساتھ فیصلہ نہیں کیا۔ میری پارٹی، میرے فرقے اور میری نسل کا رہنما ہے تو اس کے سب قصور معاف ہیں۔ ہم وہ بدنصیب لوگ ہیں جنہوں نے سرعام اپنے قاتلوں، چوروں اور بددیانت حکمرانوں اور رہنماؤں کا دفاع کیا اور ہمیں شرم تک نہ آئی۔ اب ہم زوال کے اس دور میں داخل ہو گئے ہیں جب آگ گھر کو جلانے کے درپے ہے۔ ایسے میں قومیں دو فیصلے کرتی ہیں یا تو خود کو حالات پر چھوڑ دیتی ہیں اور صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہیں یا پھر ان سب کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ یہی فیصلے کا وقت ہوتا ہے۔

اللہ نے جہاں سورہ الرعد میں کہا ہے کہ وہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ چاہے وہاں اس آیت کے اندر قوموں کی تین حالتیں بتائی ہیں۔ اللہ فرماتا ہے "اللہ کے حکم سے انسان کے لیے یکے بعد دیگر آنے والے فرشتے اس کے آگے اور پیچھے سے نگہبانی کرتے ہیں۔ بے شک اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ اپنے آپ کو خود نہ بدلنا چاہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی ٹال نہیں سکتا اور نہ ہی ان کے لئے اللہ کے مقابلے میں کوئی مدد کرنے والا ہوتا ہے۔ (الرعد۔11)۔ فرشتوں کی نگہبانی والی کیفیت تو ہم میں نہیں۔ ہم دوسری حالت میں ہیں کہ اللہ ہو سکتا ہے ہمارے بدلنے کا انتظار کر رہا ہو۔ ورنہ اللہ نہ کرے اگر اس نے ارادہ کر لیا ہمیں تکلیف پہنچانے کا تو پھر ہمارے لئے کوئی جائے پناہ باقی نہ رہے گی۔ ایسے میں نہ کسی کے سکیورٹی گارڈ کام آئیں گے اور نہ تحفظ کے آلات۔ وہ قومیں جو سینوں پر گولی کھا کر حق کی آواز بلند کرنے کے لئے تیار نہ ہوں ان کے مقدر میں بوری بند لاشیں ہی ہوا کرتی ہیں۔

نیکی کے لالچ میں

گجرات کی جرنیلی سڑک پر واقع شہر کھاریاں سے ایک راستہ رسول کی سمت جاتا ہے۔یوں تو اب سارے راستے پر بیرون ملک آباد گجراتیوں کے پیسے سے عالیشان گھر تعمیر ہو چکے ہیں۔ایسے گھر کہ جن کی چمک دمک پاکستان کے کسی بڑے شہر کے امیر ترین علاقوں میں بنے ہوئے گھروں سے کم نہیں لیکن یہ گھر ایک المیے کی نشاندہی کرتے ہیں۔نوجوان نسل ملک چھوڑ کر تلاش رزق میں دور دیس جاکر آباد ہوئی اور ان عظیم الشان عمارتوں میں ایک بوڑھا باپ یا ماں تنہائی کے دن کاٹ رہے ہیں اور ان کی تنہائی کا ساتھ گھروں میں بندھی گائے بھینسوں کے سوا اور کوئی دینے والا نہیں لیکن ایک زمانہ تھا کہ جب یہ سڑک دو رویہ درختوں کے سائے سے ڈھکی ہوتی اور دور دور تک لہلہاتے کھیت نظر آتے تھے۔اس علاقہ میں جہلم کے دریا پر رسول ہیڈ ورکس تو بنایا گیا' فوجی بھرتی اور دفاعی ضروریات کے لئے خوبصورت چھاؤنی بھی تعمیر کی گئی۔انگریزوں نے سکھوں کے خلاف اپنی آخری فتح کی یادگار بھی چیلیانوالہ میں بنائی لیکن اس پوری سڑک پر علم و عرفان اور آگہی کی شمع اگر کسی نے روشن کی تو وہ ایک مرد درویش کنور سعید اللہ تھے۔ایسا مرد کامل میں نے شاید ہی کوئی اور اپنی زندگی میں دیکھا۔یہ میرے عنفوان شباب کا زمانہ تھا جب میں نے سرسبز و شاداب کھیتوں کے درمیان سرخ اینٹوں سے تعمیر اور گنبدوں سے مزین چنن ہائی سکول میں اس درویش صفت انسان سے نیاز حاصل کرنا شروع کیا۔علی گڑھ سے جغرافیہ میں امتیازی حیثیت سے ڈگری حاصل کرنے والا یہ شخص مشہور بیوروکریٹ مختار مسعود کا ہم جماعت تھا۔سول سروس میں داخلے کا خمار علی گڑھ کے ہر نوجوان کے دماغ پر چھایا ہوا تھا کہ یہ ادارہ کار سرکار میں اعلیٰ عہدوں پر پہنچنا ہی مسلمانوں کی کامیابی کی معراج سمجھتا تھا لیکن اس مرد درویش نے ایک حیران کن فیصلہ کیا۔ایک ایسے دور افتادہ علاقے میں علم کی شمع روشن کرنے کا فیصلہ جہاں دور دور تک عزت و توقیر کا معیار یا تو ذات برادری تھی یا پھر فوج میں بھرتی۔ذرا حالات بدلے تو بیرون ملک ملازمت۔انہوں نے وہاں اس پائے کا سکول قائم کیا کہ اس کے فارغ التحصیل افراد کے نام گنوانا شروع کروں تو یہ کالم چھوٹا پڑ جائے۔ڈاکٹر صفدر محمود سے حافظ ادریس تک اور پروفیسر عثمان غنی سے مورخ عزیز احمد تک کتنے جگمگاتے ستارے اس چھوٹے سے گاؤں کے سکول سے اس ملک کے آسمان پر طلوع ہوئے۔لالٹین کی ملگجی روشنی میں کئی راتیں میں نے اس شخص کے علمی سحر میں گزاریں۔جب کبھی ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تاریخ' فلسفہ' دینیات اور علم کی کتنی گتھیوں کو وہ شخص گھنٹوں سلجھاتا چلا جاتا کہ رات بھیگ جاتی۔شریعت رسول پر عمل پیرا اور زہد کا نمونہ' مغرب کی تعلیم کا پلا ہوا لیکن آنکھیں مغرب کی تہذیب کی روشنی سے خیرہ نہ ہو سکیں۔

ایسے مرد حق آشنا کا ایک کمال ضرور ہوتا ہے کہ یہ اپنے لہو سے ایسے چراغ ضرور روشن کر جاتے ہیں جو ان کے بعد بھی روشنی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔سکول تو ذوالفقار علی بھٹو کی قومیائی پالیسی کی نذر ہو گیا لیکن اس سکول نے ایک ایسا فرزند تخلیق کر دیا جس نے اس شمع کو آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھا لیا۔عبدالشکور۔میں اسے ستر کی دہائی کے آغاز سے جانتا ہوں۔پنجاب یونیورسٹی کی سیاست میں گم' سٹوڈنٹس یونین کا صدر' سیاست' الیکشن پھر ملک سے باہر قسمت آزمائی لیکن شاید کنور سعید اللہ کی روح اس کے وجود میں کہیں بھٹک رہی تھی۔اس لئے واپس اپنے گاؤں چنن آ گیا اور ایک ایسا عظیم الشان ادارہ تخلیق کر دیا جس نے اس پورے علاقے کے لوگوں کی علم کی پیاس بجھانے کی ذمہ داری اٹھا لی۔اس پوری سڑک پر یہ وہ واحد عمارت ہے جو نہ صرف آباد ہے بلکہ اس میں تعلیم کا وہ معیار ملتا ہے جو اس ملک کے کسی بھی ماڈرن کاروباری تعلیمی ادارے میں ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے فیس دے کر لوگ حاصل کرتے ہیں۔

لیکن آج اس رمضان کے مہینے میں مجھے اس شخص کی ایک اور نیکی کی بابت گفتگو کرنا ہے۔ایسی نیکی جس کی ضرورت میں نے اپنے زمانہ طالب علمی کی کسمپرسی میں بار بار محسوس کی۔ایک انتہائی عسرت سے بھرے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے یوں تو میں سرکاری سکولوں اور کالجوں میں معمولی فیس سے تعلیم حاصل کرتا رہا لیکن داخلے اور امتحانی فیس کے لئے مجھے کسی نہ کسی صاحب حیثیت کی جانب دیکھنا پڑتا۔ایم اے میں داخلے کے وقت جب میں لاہور آیا تو میری جیب میں ذاتی کمائی کے صرف دو روپے تھے۔کتنے لوگوں کا قرض حسنہ اور میری صحافتی فری لانس مضمون نگاری نے مجھے تعلیم مکمل کرنے میں مدد اور پھر پہلی نوکری جو یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے تھی اس کے کئی مہینے قرض حسنہ واپس کرنے میں صرف ہوئے۔ایسے میں اکثر میں سوچتا تھا کہ کیا دنیا کے ہر مہذب ملک کی طرح ہمارے ہاں کوئی ایسی تنظیم یا فاؤنڈیشن نہیں بن سکتی جو میرے جیسے مفلوک الحال طالب علموں کو پڑھائی کے ساتھ نوکری یا کمائی کی اذیت سے پاک کر دے۔عبدالشکور نے الفلاح بنا کر وہ کام کر دکھایا۔الفلاح سکالرشپ سکیم 1998ء سے ایسے ذہین طلباء اور طالبات کو اس طرح وظائف دے رہی ہے کہ ان کی تعلیم کی آخری منزل تک ان کا ساتھ دیا جاتا ہے۔ڈاکٹر بننا ہے' انجینئر بننا ہے یا کسی بھی شعبے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے۔آپ استطاعت نہیں رکھتے' الفلاح کے دروازے آپ کے لئے وا ہیں۔1998ء میں 46 طلباء سے وظائف کا آغاز کرنے والی اس تنظیم نے 2010ء میں 1063 طلبہ کو ان کی تعلیم مکمل کرنے کے پورے اخراجات کا ذمہ اٹھایا۔اب تک ان وظائف سے 29 ڈاکٹر' 24 انجینئر' 41 پوسٹ گریجویٹ اور دیگر ملا کر 691 طلبہ فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور اس وقت 1063 طلبہ ان وظائف کے ساتھ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھ رہے ہیں جن میں 77 انجینئرنگ اور 64 میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ان میں 139 یتیم ہیں' 5 معذور اور 40 طلبہ اقلیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔موجودہ وظائف حاصل کرنے والوں میں 776 پنجاب سے' 144 خیبر پختونخواہ سے' 32 بلوچستان سے اور 83 آزاد کشمیر سے طلبہ شامل ہیں۔یہ ایک ایسا پودا ہے جس کی چھاؤں گھنی اور سایہ دار ہے اور پھل میٹھا ہے۔

میں اپنے بچپن کی طرف لوٹ کر دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میرے ساتھ کتنے ایسے ذہین ساتھی تھے جو شاید میری طرح سخت جان نہ تھے کہ غربت سے لڑتے علم حاصل کرتے چلے جاتے۔اگر ایسی کوئی تنظیم اس وقت موجود ہوتی تو وہ آج میرے ساتھ ہوتے' میرے پرانے شہر میں رزق کمانے کے لئے معمولی نوکری نہ کر رہے ہوتے۔پھر اس درویش خدامست کی یاد آتی ہے کہ وہ جس سرزمین میں آسودۂ خاک ہے اسی جگہ الفلاح کا مرکز چنتا ہے۔چنن ڈنگہ روڈ گجرات۔رمضان کے اس آخری عشرہ میں جہاں نیکیاں سمیٹنے کا لالچ غالب ہوتا ہے سو ہوں اس کار خیر کی گفتگو کر کے اپنے لئے کچھ آخرت کا زاد راہ اکٹھا کر لوں کہ ویسے تو دامن بہت خالی ہے۔ترغیب کے طور پر اس تنظیم کے نمبر لکھ رہا ہوں کہ شاید کسی اور شخص کی نیکی میں بھی مجھے بھی حصہ مل جائے۔

0092-537-454154,454253۔

دیر ہونے سے پہلے

وہ صاحبان نظر جنہوں نے ایک سال پہلے اس آفت اور قتل وغارت کی خبر دی تھی اور صاحبان اقتدار سے کہا تھا کہ یہ سب اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے' دعویٰ کرنا چھوڑ دو۔ مت کہو کہ ہم کمر توڑ دیں گے' قابو پالیں گے۔ تمہارے دلوں میں کھوٹ ہے' تمہاری نیتوں میں فتور ہے' تم نیت صاف کر کے کوشش کرو اور اللہ سے نصرت مانگو۔ انہی صاحبانِ بصیرت کی ایک بات جو اس وقت تحریر کی تھی اور آج پھر لکھ رہا ہوں' یہ لوگ خائن ہیں' دوسروں کی موت پر سکور گنتے ہیں اور اپنوں کی موت پر چیختے چلاتے ہیں' یہ باز نہ آئے تو ان کے شہر رہنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ یہ جان بچاکر شہروں سے بھاگ رہے ہوں گے۔ انہی دنوں ایک ایسے صاحب حال شخص کا فقرہ میں نے تحریر کیا تھا کہ جس کی بصیرت اور بصارت کے سامنے بڑے بڑوں کی حیثیت اور نظر کے چراغ ماند پڑ جاتے ہیں۔ جو نہ کبھی کوئی دعویٰ کرتے ہیں اور نہ خود کو سیدالانبیاء کی شریعت کی اتباع سے باہر جانے دیتے ہیں۔ فقر اور سادگی کا عالم یہ ہے کہ سرراہ چلتے' محفل میں بیٹھے یا کام کاج میں مصروف دیکھ کر آپ انہیں ایک سادہ سا کسان سمجھیں گے۔ لیکن وہ بھی اس آفت کی علامتوں سے اسقدر آزردہ خاطر ہوئے تھے کہ زندگی بھر زبان نہ کھولنے والے شخص نے اچانک کہہ دیا۔ لکھو اور صاف صاف لکھو کہ ستون نکال لیا گیا ہے اور چھت گرنے والی ہے۔ لوگوں سے کہو ظالموں کا ساتھ دینے اور ظلم پر خاموش رہنے سے باز آجائیں۔ ایک سال' بارہ مہینے اور تین سو پینسٹھ دن گزر گئے۔ سیلاب کی آمد کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ سیلاب آیا' کروڑوں لوگوں کو بے گھر کر گیا۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ جو چند اہل خیر معاشرے میں موجود تھے وہی مدد کے لئے آگے بڑھے۔ حاکموں نے کشکول تھاما اور دنیا سے بھیک مانگنے نکل پڑے۔ کشکول میں نفرت کے پتھر اور الزامات کی ریت کے سوا کچھ نہ مل سکا۔ دنیا بھر نے کہا ہم بددیانت لوگوں کو امداد نہیں دے سکتے۔ سیلاب ختم ہوا۔ جن کے گھر اجڑنے تھے اجڑ گئے۔ بہت سے آج بھی کھلے آسمان تلے پڑے ہیں۔ ہم سب نے تصور کر لیا کہ یہ سب معمول کی بات ہے۔ وہ جن کو دنیا کے ہر واقعے کی سائنسی توجیح کرنے کی عادت ہے انہوں نے کہا کہ اللہ کی ناراضگی کس چڑیا کا نام ہے۔ گلوبل وارمنگ ہو رہی ہے' موسم بدل رہے ہیں' سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہ تھا کہ اس کائنات کی مالک ایک ایسی ہستی بھی ہے جو موسموں کو بدلتی ہے۔ ویسا ہی تمسخر تھا جیسا نوح علیہ السلام کی قوم نے انہیں کشتی بناتے دیکھ کر کیا تھا۔ ویسا ہی جواب تھا جو ان کے بیٹے نے دیا تھا کہ مجھے تمہاری کشتی کی ضرورت نہیں' سیلاب آیا تو میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ لیکن پہاڑ بھی ڈوب گیا تھا۔ "کوئی کہتا تھا کالاباغ ڈیم بن گیا تو نوشہرہ ڈوب جائے گا" لیکن اللہ نے اپنی قوت کی دلیل کے طور اسے اتنی بڑی بڑی لہروں کے سپرد کر دیا جو ان کی چھتوں سے بھی بلند تھیں۔ یہ لوگ تو کسی دریا کے راستے میں بھی نہ تھے۔ بس وہی ہوا کہ زمین نے اپنا پانی اگل دیا یا آسمان نے برسات کی انتہا کر دی۔ اس گزشتہ ایک سال میں جب سیلاب کی تباہ کاری نے اس مملکت کو بہت حد تک مفلوج کر کے رکھ دیا' اگر صورت حال میں کوئی گفتگو میڈیا پر ہوئی بھی تو بس یہی کہ اس سیلاب کے ہماری سیاست پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ بہت سوں کی خواہش تھی کہ یہ بھوکے ننگے اور خانماں برباد لوگ ایک دن اٹھیں گے اور حکومت کے پرخچے اڑادیں گے۔ کوئی حکومت کی نااہلی پر چیختا تھا تو کہیں حکومت سب ٹھیک ہو جائے گا کا راگ الاپتی تھی۔ لیکن ان تمام اعلیٰ دماغ جمہوریت کے علمبرداروں نے ایک دن بھی ان آفت زدہ لوگوں کو اس نیت سے جاکر ملنے کی کوشش نہیں کی کہ اس سے ہمارا حقیقی حکمران' اللہ راضی ہو جائے۔ ہیلی کاپٹروں کی پروازوں میں میڈیا کے کیمروں کے ساتھ گھومتے رہے اور دلوں میں آئندہ الیکشن میں کارکردگی کا بھوت رقص کرتا رہا۔

وہ جو اس عذاب میں چھپی آزمائش کو جانتے تھے وہ لوگوں کی مدد کو نکلے تاکہ ان کا رب ان سے راضی ہو جائے اور اس کے صلے میں آنے والی آفتوں اور بلاؤں کو ٹال دے۔ لیکن شاید اس قوم کا مجموعی مزاج اور عمومی رویہ ہی ایسا ہو گیا تھا کہ معمولی آفتیں بھی انہیں راہ راست پر نہیں لاسکیں۔ صاحبان حال نے سر سجدوں میں ڈال دیئے اور خوف سے ان کی آنکھوں کے آنسو زمین کو بھگونے لگے۔ لیکن شاید ہمارے اعمال ہی ایسے تھے' ہماری ظلم پر خاموشی' انصاف کی تضحیک' بے ایمانی اور بددیانتی کی حمایت اور سچ کا تمسخر اس قدر بڑھ گیا تھا کہ دعائیں بارہ گاہ الٰہی میں باریابی حاصل نہ کر پائیں۔ ادھر متکبر لہجوں اور صلاحیتوں پر ناز کے پر غرور دعوؤں نے معاملہ اور بگاڑ دیا۔ عذاب کی وہ آگ جو گزشتہ ایک سال سے سلگ رہی تھی اور اس کا نشانہ روزانہ چند لوگ ہو رہے تھے اچانک الاؤ بننے لگی۔ لاشوں پر لاشیں گرنا شروع ہوئیں۔ لیکن جب آنکھوں' کانوں' اور دلوں پر مہریں لگ جائیں تو کچھ نہیں سوجھتا۔ کسی نے کہا یہ سیاسی مسئلہ ہے اسے سب سیاسی پارٹیاں مل کر حل کریں' کوئی کہتا یہ انتظامی مسئلہ ہے سب کو یہاں سے نکالو اور امن قائم کرو۔ کیسے کیسے دعوے ہوئے' کیسی کیسی بلیک میلنگ کی گئی اور برداشت بھی کر لی گئی۔ کوئی کہتا امن کی کنجی اس کے پاس ہے' کوئی کہتا امن کا راستہ براہ راست آپریشن ہے لیکن ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں کے اس ملک میں ہم نے ایسا رویہ نہ اپنایا جو اپنے گھروں میں چھوٹی سی آفت یا بیماری آنے پر کرتے ہیں۔ کسی زرداری' الطاف حسین' اسفندیار یا نواز شریف کے خاندان میں کوئی شخص موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہو' تو ایسا کبھی نہ ہوا ہو گا کہ علاج کے ساتھ ساتھ گھر والے اللہ کی جانب رجوع نہ کرتے ہوں' تسبیح کے دانے نہ رولے جاتے ہوں یا قرآن کے ورق آنسوؤں سے تر ہوتے ہوں۔ ہر کسی سے درخواست کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر تو بہت کوشش کر رہے ہیں' بس دعا کرنا' اللہ کارساز ہے' اس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے' وہ کوئی معجزہ کر دے اور میرے پیارے کی جان بچ جائے۔

لعنت ہے ہم پر کہ ہم نے ایسی راتیں گزاریں کہ پچاس پچاس لاشیں گرتی رہیں اور ہماری زبان سے ایک دفعہ بھی دعا کے لفظ منہ سے نہ نکل سکا۔ ہم وہ بدنصیب لوگ ہیں جو اللہ کے سامنے جھکنے پر شرمندہ ہوتے ہیں' ہمارا سائنسی مزاج اور تجرباتی رویہ ہمیں جھکنے نہیں دیتا۔ کیا کسی نے اپنے بیٹے کی بیماری اور پریشانی کے عالم میں یہ کہا کہ "یار کیا اللہ اللہ لگائی ہوئی ہے جو کرنا ہے ڈاکٹروں نے کرنا ہے۔ بس کرو یہ دقیانوسی باتیں"۔ ڈرو اس وقت سے کہ جب یہ آزمائش آپ گھروں پر دستک دے اور آپ کو کوئی راستہ سجھائی نہ دے' کوئی تسلی سکون نہ بخشے' ایسے میں آسمان کی جانب سر اٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر پکارا بھی تو شاید بہت دیر ہو چکی ہو گی' بہت کچھ جل کر خاکستر ہو گیا ہو گا۔ غرور سے تنی گردنیں اور تکبر سے پکے ہوئے سر جھکالو ورنہ یہ اکڑی ہوئی فصل میرے اللہ زمین پر زیادہ دن لہلاتی نہیں رہنے دیتا۔

اکیسویں صدی کا ہتھیار

کیا کبھی کسی نے غور کیا ہے کہ غریب اور مفلوک الحال ملکوں میں بھی جہاں لوگ ایک وقت کی روٹی کو ترستے ہوں وہاں میڈیا کی چکا چوند ماند نہیں پڑتی۔ ان کے خوش رنگ پروگرام نہیں رکتے' ان کے اینکر پرسن ایک چینل سے دوسرے چینل بہتر سے بہترین معاوضے کی دوڑ میں بھاگے پھرتے ہیں۔ پاکستان جیسے غریب ملک میں بھی اتنا زیادہ معاوضہ لیتے ہیں کہ صدر' وزیراعظم' گورنر یا وزیراعلیٰ نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔ 24ارب روپے کے کل سالانہ اشتہارات پر یہ سارے اللے تللے سمجھ سے بالاتر نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر دنیا پوری کے تناظر میں اپنے ملک یا کسی بھی ملک کو دیکھیں تو میڈیا کی اس نہ دکھائی دینے والی حکومت کے بکھرے ہوئے تار پود اور وسائل کی کہانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ میڈیا اکیسویں صدی کا وہ واحد کار آمد ہتھیار ہے جس سے تہذیبیں تباہ کی جاسکتی ہیں' اخلاق برباد ہو سکتے ہیں' سیاست دان خریدے یا پھر ان کے منہ میں اپنی زبان ڈالی جاسکتی ہے جس کو چاہو ملزم' بددیانت اور فرسودہ ثابت کرو اور جسے چاہو بالغ نظر اور باصلاحیت۔

آج سے 80 سال قبل اس کارپوریٹ میڈیا کی بنیاد رکھی گئی تھی جسے پیشہ وارانہ صحافت کے خوبصورت نام سے آزادیٔ اظہار کے نعرے کے ساتھ نتھی کر کے پیش کیا گیا تھا۔ اسے اشتہارات کے خون سے پالا گیا اور پھر جب یہ لوگوں کے ذہنوں سے کھیلنے کے قابل ہوا تو اسے اپنے کنٹرول میں لے کر ایسے ایٹمی ہتھیاروں کی طرح استعمال کیا گیا جو لوگوں کے گھروں میں بلا روک ٹوک گھس سکتے تھے۔ کنٹرول کی یہ کہانی اس تیز رفتاری سے آگے بڑھتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ 1983ء میں دنیا بھر کا میڈیا پچاس کارپوریشنوں کی ملکیت تھا۔ صرف 19 سال کی خرید و فروخت کے بعد 2002ء میں یہ نو کارپوریشنوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اگلے پانچ سال بعد یعنی 2007ء میں صرف پانچ کمپنیاں دنیا بھر کے میڈیا کی مالک ہو گئیں اور آج دنیا کا یہ سب سے خطرناک ہتھیار تین بڑی کمپنیوں کی ملکیت ہو چکا ہے۔ یہ کمپنیاں جس قسم کی سیاسی قیادت چاہتی ہیں' جیسی اخلاقی اور معاشرتی اقدار مانگتی ہیں' جس کو چاہے ذلت کے گڑھے میں پھینکتی ہیں اور جسے چاہے عزت کا تاج عطا کرتی ہیں۔ سب ان کی دسترس میں ہے۔ ان تینوں کمپنیوں میں ایک روپرٹ مرڈوک کی نیوز کارپوریشن ہے۔

یہ شخص گیارہ مارچ 1931ء میں آسٹریلیا کے شہر میلبرن میں ایک صحافی سر کیتھ مرڈوک کے گھر پیدا ہوا۔ صحافی والد کی اولاد ہونے کی وجہ سے وہی جراثیم لئے ہوا تھا اسی لئے اپنے سکول کے میگزین کا ایڈیٹر بنا اور میلبرن ہیرلڈ میں پارٹ ٹائم صحافت بھی کرتا رہا۔ فلسفہ' سیاست اور معاشیات میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈیلی ایکسپریس میں سب ایڈیٹر کے طور پر کام کرنے لگا۔ صرف بائیس سال کی عمر میں اپنے باپ کے مرنے کے بعد اس کی میڈیا کمپنی نیوز لمیٹڈ کا مالک بن گیا۔ یہ 1953ء تھا۔ کارپوریٹ میڈیا کی بنیاد رکھی جاچکی تھی۔ مرڈوک نے سب سے پہلے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے اخبارات کو خریدنا شروع کیا اور پھر 1969ء میں برطانیہ کے اخبار Newsof theWord اور Sun کو خرید لیا اور انہیں وہاں کا مقبول ترین اخبار بنا دیا۔ 1974ء میں وہ امریکہ چلا گیا اور اپنی اس سلطنت کی توسیع میں لگ گیا۔ 1981ء میں وہ Time رسالے کا مالک بنا اور 1985ء میں امریکی شہری' اسی سال اس نے TwentiethCenturyFox خریدا' 1989ء میں ہارپر کولنز' اور 2007ء میں وال سٹریٹ جنرل۔ مرڈوک نے اس کے ساتھ اپنا دائرہ جنوبی امریکہ میں پھیلایا اور پھر ایشیا کی جانب آیا اور 1993ء میں سٹار ٹی وی نیٹ ورک خرید لیا۔ یہ وہی ٹی وی نیٹ ورک جو سب سے پہلے پاکستان میں ڈش انٹینا کے ذریعے پہنچا اور انڈین ڈراموں کی بھرمار سے پاکستان کے تہذیب آشنا میڈیا کو یوں تباہ و برباد کیا کہ واپسی کا راستہ تک بھول گیا۔ مرڈوک کے بارے میں گورڈن ڈف نے اپنے تازہ ترین انٹرویو میں کہا ہے کہ یہ آسٹریلیا میں پیدا ہوا ہے لیکن اسے اسرائیلی شہریت بھی حاصل ہے اور یہ ایک کٹر یہودی ہے۔ یہ شخص گزشتہ بیس سال سے برطانوی اور امریکی سیاست پر مکمل کنٹرول رکھتا ہے اور اس بات کا اعتراف اس نے خود بھی کیا ہے۔ اس کے بارے میں امریکہ کی ایف بی آئی اور برطانوی ایجنسیاں اس الزام کی تحقیق کر رہی ہیں کہ یہ عام لوگوں سے لے کر بڑے بڑے سیاستدانوں تک کے ٹیلی فون ٹیپ کرتا ہے۔ اہم لوگوں کو رشوت دینا اور انہیں بلیک میل کرنا اس کا ہنر ہے۔ مرڈوک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اسرائیل میں نیتن یاہو سے بھی زیادہ اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ فوکس نیوز کے مالک کی حیثیت سے اس نے اسرائیل کو اپنے جاسوسی نیٹ ورک پھیلانے میں مدد دی۔ اپنی میڈیا سلطنت کے ذریعے اس نے یہودی لابی کو امریکی کانگریس اور برطانوی پارلیمنٹ کو کنٹرول کرنے کا موقع فراہم کیا۔

میڈیا کے تین بڑے ستونوں کا یہ اہم ستون جس پالیسی پر میڈیا چلاتا ہے اس کے مطابق اسلام اور مسلمانوں سے نفرت سرفہرست ہے' اس کے نزدیک تمام مسلمان برے ہیں۔ اس کے تمام میڈیا پر مسلمان دہشت گرد' نکمے' عیاش اور عالمی امن کے لئے خطرہ بنا کر پیش کئے جاتے ہیں۔ وہ اپنے صحافیوں کو کہتا ہے کہ ذہین اور باصلاحیت لوگوں سے نفرت کرو' خصوصاً مسلمانوں میں سے اگر کوئی تعلیم یافتہ اور باصلاحیت ہو تو اس کی کردار کشی کرو۔ اس کے نزدیک نسل پرستی اس وقت تک نہیں پھل پھول سکتی جب تک لوگوں کا اعتماد پیدائشی باصلاحیت لیڈروں پر سے ختم نہ ہو جائے۔ اس کی پالیسی کا حصہ ہے کہ کلچر اور ثقافت کو تباہ چار چیزوں سے کیا جاسکتا ہے۔ 1۔ میکانکی میوزک' 2۔ سکینڈلز' 3۔ غلیظ جنسی ترغیبات اور مستقل طور پر پھیلائی جانے والی Conspiracies یعنی افواہ سازی' یہی افواہ سازی پاکستان کے حوالے سے ہر دوسرے روز منظر عام پر آتی ہے۔ یہ ٹوٹ جائے گا' یہ دہشت گردوں کی آماجگاہ ہے' اس کا ایٹمی پروگرام دنیا کے امن کے لئے خطرہ ہے اور پھر اسی افواہ سازی پر میرے ملک کا میڈیا ٹاک شوز کرتا ہے۔ آٹھ بلین ڈالر کی ذاتی جائیداد کا مالک مرڈوک تین بار ٹائمز کے سو اہم ترین افراد کے طور پر دکھایا جاچکا ہے۔ دنیا کے امیر ترین لوگوں میں 117 نمبر پر آنے والا یہ شخص سکائی نیوز کے مالک کی حیثیت سے مارگریٹ تھیچر کو برسر اقتدار لانے اور فوکس نیوز کے ذریعے باراک اوباما کی صدارت کا حصے دار رہا ہے۔ گیارہ ستمبر کے واقعے سے لے کر عراق اور افغانستان کی جنگ میں پوری دنیا کو جھونکنے اور اس جنگ کو پوری دنیا کے لائف سٹائل کے بقا کی جنگ بنا کر پیش کرنے میں یہ کامیاب رہا ہے۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ پارٹیوں کی حمایت بھی بدلتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرے کو جتوا کر اس سے اپنے ایجنڈے کی تکمیل کرواتا ہے۔

اس ایک شخص کی کہانی اسقدر خوفناک اور طویل ہے کہ اس کیلئے کئی کتابوں کی ضخامت چاہئے۔ کارپوریٹ کلچر کا پروردہ میڈیا کہاں سے سرمایہ حاصل کرتا ہے' کیوں کرتا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں یہ سب اس کی کہانی سے واضح ہوتے ہیں۔ یہ بڑے میڈیا ہاؤس اور کارپوریٹ دنیا کے آقا اپنے کمزور ترین میڈیا کو بھی کسی غریب ترین ملک میں بھی گرنے نہیں دیتے۔ اس کی چکا چوند ماند نہیں ہونے دیتے۔ اسے سرمایے کا نیا خون فراہم کرتے ہیں۔

یہ اکیسویں صدی کے اس ایٹمی ہتھیار کو تازہ دم رکھتے ہیں لیکن حیرت ہے ان ڈیڑھ ارب مسلمانوں پر جو اس سارے میڈیا کا ہدف ہیں۔ جن میں لکھ پتی بھی ہیں اور ارب پتی بھی جن کے گھروں پر روز یہ ہتھیار خاموشی سے وار کرتا چلا جاتا ہے اور انہیں احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایٹمی طاقت بن جانے سے دفاع مضبوط ہو جاتا ہے۔ جب گھر ہی تباہ ہو جائیں وہاں سے اقدار' روایات' مذہب اور اخلاق کا جنازہ نکل جائے تو ایسے تباہ حال گھر' ملک یا امت کو بچانے کا فائدہ۔ کل روز حشر وہ اپنے اس سرمایے کا حساب دے سکیں گے جب یہ سوال پوچھا جائے گا کہ پوری دنیا تمہارے وجود پر میڈیا کا ہتھیار لے کر اعلان جنگ کر چکی تھی' وار پر وار کر رہی تھی اور تم نے اس کے خلاف جہاد میں ایک پائی بھی خرچ نہ کی اور اپنے ملکوں' شہروں' گھروں اور خاندانوں کو ان کے حوالے کر دیا۔ تم نے ایسا ایک بھی ہتھیار اپنی قوم یا امت کو نہ دیا۔ جواب ہوگا کسی کے پاس؟

پتھر کی آنکھ اور لکڑی کا جالہ

یونان کے ویران شہر مسترا کی ویران شہر پناہ یا فصیل کے پاس کھڑے ہوئے مشہور مورخ ٹائن بی نے 1912ء کی ایک شام سامنے دیکھا تو سپارٹا کا میدان حد نظر تک نظر آ رہا تھا۔ جس ویران شہر میں وہ کھڑا تھا وہ کبھی ہنستا بستا روشنیوں اور رنگوں کا شہر ہوتا تھا اور آج ایک کھنڈر سے بھی کم حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ٹائن بی کہتا ہے کہ میں سوچتا رہا کہ 1821ء تک یہ شہر خوشحال ہے کہ ایک دن غول در غول حملہ آور شہر میں داخل ہوتے ہیں' شہریوں کا قتل عام کرتے ہیں اور شہر کو برباد کر کے کھنڈر بنا دیتے ہیں۔ ٹائن بی کہتا ہے کہ میں اس شہر کی فصیل کے ساتھ کھڑے گھنٹوں سوچتا رہا کہ اس بے مقصد قتل عام اور تباہی کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ انسان کی اس وحشیانہ درندگی پر بھی بہت دل گیر ہوا اور حیران بھی کہ انسان اس خطہ ارضی پر وہ واحد جاندار ہے جسے اپنی انا اور ذات کی تسکین کے لئے اپنے ہم جنسوں کی تباہی اور بربادی چاہئے ہوتی ہے۔ جب دوسرے تباہ ہوتے ہیں' برباد ہوتے ہیں' ان کے بچے مرتے ہیں' ان کے گھر اجڑتے ہیں تو اسے تسکین حاصل ہوتی ہے' اس کا سر فخر سے بلند ہوتا ہے یہ فتح کے نشے میں سرشار ہوتا ہے۔ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب میں ٹائن بی نے آٹھ ہزار صفحات پر مشتمل "اے سٹڈی آف ہسٹری" لکھ ڈالی اور اس کے ہر صفحہ پر اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اسباب و علل پر یہ تاریخ کی سب سے بڑی کتاب ہے۔

میں جب بھی کسی شہر کا یہ منظر دیکھتا ہوں جس میں ایک گروہ دوسرے گروہ پر پل پڑا ہے یا راہ چلتے لوگ زندگی کی بازی ہار رہے ہیں' گھر اور دکانوں کو آگ لگائی جا رہی ہے تو ٹائن بی کے ترتیب سے دیئے گئے ان واقعات پر نظر دوڑاتا ہوں جن میں انسانی وحشت کی کہانی ازل سے شروع ہوتی ہے اور ابد تک چلتی چلی جا رہی ہے۔ بربادیوں کی یہ تاریخ کسی خاص واقعہ' کسی وجہ یا حقوق کی کسی جنگ سے شروع نہیں ہوتی۔ بس اچانک ایک قوم کو یہ خیال آ جاتا ہے کہ وہ عظیم ہے' سب سے عظیم' اس سے بہتر کوئی نسل اس دنیا میں موجود نہیں اور پھر اس برتری کو ثابت کرنے کے لئے جنون میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ جنون جسے اجتماعی پاگل پن کہا جا سکتا ہے ایسا خوفناک ہوتا ہے کہ اچانک سپارٹا کے لوگوں کو خیال ہوا کہ ان کے ہمسائے ان سے کمتر اور کمزور زندگی گزار رہے ہیں اور وہ آٹھویں صدی قبل مسیح میں اپنے ہمسایے میزی نینز پر چڑھ دوڑے۔ یہ جنگ سولہ برس تک جاری رہی لیکن وہ جو برتری کے جنون میں تھے جیت گئے اور لوگوں کی زندگی کو اجیرن کر دیا۔ سو سال تک یہ لوگ ان کے ظلم و ستم سہتے رہے لیکن پھر سو سال بعد اٹھے اور سپارٹا کے لوگوں سے جیتنے کے لئے بیس سال جنگ کی اور اس دفعہ انہوں نے سپارٹا کو کھنڈر بنا دیا۔

لیکن سو سال کی اذیت اور 36 سال کی جنگ کے بعد انہوں نے دو عجیب و غریب فیصلے کیے ایک تو میزی نینز کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور ایک حصے کا مالک اور آقا اپنا نسلی آدمی بنایا اور باقی مقامی لوگ غلام بنا دیئے گئے۔ ان غلاموں کے بچوں میں اگر ذرا بھی ذہانت ہوتی تو اسے قتل کر دیا جاتا۔ اپنی نسل کی بقا کے لئے انہوں نے ایک حکمت عملی بنائی۔ انہوں نے پورے کے پورے شہر کو ایک فوجی چھاؤنی میں تبدیل کر دیا۔ ان کے لڑکے اور لڑکیاں گھروں سے سات برس کی عمر میں رخصت ہو جاتے اور فوجی کیمپ میں تربیت حاصل کرتے' دونوں کو ایک جیسی تربیت دی جاتی۔ حتیٰ کہ کشتیوں کے مقابلے بھی عورتوں اور مردوں کے علیحدہ نہیں ہوتے تھے۔ دونوں برابر ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے' لڑکا بیوی کے ساتھ سہاگ رات بسر کرنے کے بعد بیرک میں واپس چلا جاتا۔ عورتیں اپنے بال چھوٹے رکھتیں اور مردانہ لباس پہنتیں۔ اگر کوئی شوہر صحت مند یا بچے پیدا کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہوتا تو اس کی ذمہ داری ہوتی کہ اپنی بیوی کے لئے کسی قابل مرد کا بندوبست کرے ورنہ بیوی خود کسی کو اپنے طور پر منتخب کر لیتی۔ یہی وہ سپارٹا کے حیران کن جنگجو تھے جنہوں نے یونان کا تہذیبی شہر ایتھنز فتح کیا تھا۔ لیکن اس فتح کے لئے بھی انہیں 27 برس جنگ لڑنا پڑی۔ یہ تاریخ کی اولین عصبیت اور نسل پرستی کی داستانوں میں سے ایک ہے۔ سپارٹا کے لوگوں نے اپنی نسلی عصبیت کو اسقدر خوفناک بنا لیا تھا کہ ان کے لوگ ہر وقت ایک فوجی پریڈ کی طرح تنے ہوئے رہتے۔ ٹائن بی کہتا ہے کہ یہ نسلی تعصب سے غرور اور دوسروں کی برتری کے خوف سے اتنے اکڑ جاتے ہیں کہ پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ یہ اس تناؤ میں آنکھ تک نہیں جھپکتے چاہے مکڑی اس کے اردگرد جالا بن رہی ہو۔

پتھر کی آنکھ والے ایسے کتنے کردار ہیں جو میرے ملک کے در و بام پر ان الوؤں کی طرح بیٹھے ہیں جن کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ علاقہ ویرانے میں کیوں تبدیل نہیں ہو جاتا۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے تعصب سے بھرے ہوئے فقرے اور دوسروں سے نفرت آمیز نعرے ان کی مقبولیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ جب اپنے لوگوں کو سپارٹا کے عوام کی طرح ہتھیار بند ہونے' فوجی تربیت کی طرح منظم کرنے اور ویسے ہی اپنی اولادوں تک کو کسی ناگہانی جنگ کے لیے تیار کرنے کو کہتے ہیں تو ان کی انا کو تسکین مل رہی ہوتی ہے۔ یہ اپنی جانب سے اپنی قوم کا دفاع کرتے ہوئے لازوال ہیرو بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

سپارٹا اور ایتھنز سے لے کر بابل اور مصر تک اور پھر جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم تک انسان نے رنگ نسل' زبان اور علاقے کے نام پر جس قدر خون بہایا ہے وہ انسان کی اسی خونی جبلت کا نتیجہ ہے۔ یہ آگ جب ایک دفعہ شروع ہوتی ہے تو پھر مدتوں جلتی رہتی ہے۔ بجھ بھی جائے تو راکھ میں سلگتی رہتی ہے۔ اس آگ پر تیل ہمیشہ وہ لوگ ڈالتے ہیں جن کے دماغ میں یہ سودا سما جاتا ہے کہ ہم فقرے باز ہیں' ہماری گفتگو آگ لگا دیتی ہے اور دشمنوں کو جلاتی ہے۔ میرے ملک میں بھی ان دنوں ایسے فقرے بازوں کا راج ہے۔ کوئی راشن جمع کرنے کا کہتا ہے تو کوئی کسی کو بھوکے ننگے کا لقب دیتا ہے' کسی کو تخت لاہور یاد آتا ہے تو کوئی پشتونوں کی تقسیم کا رونا روتا ہے۔ یہ سب لوگ جو اپنی بیان بازیوں سے پھولے نہیں سما رہے' انہیں اس آگ کا علم نہیں کہ یہ جب پھیلتی ہے تو بستی کو خاکستر کرنے سے پہلے دم نہیں لیتی۔ یہ بجھنے کے لئے لاکھوں کروڑوں لوگوں کا خون مانگتی ہے اور اس میں ان سارے بیان بازوں اور لیڈروں کا خون بھی شامل ہو جاتا ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لو' سپارٹا کا شاید ہی کوئی نام و نشان اور ذکر تک موجود ہو لیکن ایتھنز کے افلاطون، ارسطو، سقراط اور بقراط کو کون نہیں جانتا۔ تعصب اور نسلی تقسیم سے شہر تو برباد ہوتے ہی ہیں انسانوں کے نام بھی تاریخ کے صفحات سے فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔

فساد سے پاک کرنے کی حکمت الٰہی

اگر کسی کے گمان میں یہ بات ہے کہ وہ اپنی طاقت‘ خاندانی حیثیت اور عوامی حمایت کی وجہ سے کسی علاقے‘ جگہ یا ملک کا سدا حکمران اور مالک و مختار بنا رہے گا اور اس کا یہ تخت و تاج‘ اس کی اولاد میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہے گا تو خواہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو یا نہ ہو‘ اسے اللہ کے رسول پر اتارے گئے پیغام حق پر اعتبار ہو یا نہ ہو‘ اس کے لئے تاریخ کی گواہی اس قدر مستند اور معتبر ہے کہ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں مطلق العنان حکمرانوں کی گردنیں نہ کاٹی گئی ہوں‘ ان کی اولاد نے ذلت و رسوائی کی زندگی نہ گزاری ہو۔ کئی ہزار سال کی تاریخ کو کھنگالنے کی ضرورت نہیں‘ دلی کے تخت کو مغلیہ جاہ و جلال کی علامت سمجھنے والوں کی اولادوں نے اسی شہر دلی میں گدھا گاڑیاں چلائیں اور پانڈیوں کا کام کر کے رزق کمایا۔ شاہ ایران تو ابھی کل کی کہانی ہے جس کے خوبصورت خاندان کی تصویروں کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرتا تھا کہ یہ لوگ دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔ کبھی کسی نے سوچا تھا کہ مصر میں ہر آواز کو طاقت کے ذریعے خاموش کر دینے والا حسنی مبارک ایک دن جانوروں کی طرح ایک پنجرے میں بند ہو کر عدالت کے روبرو اپنے خلاف الزامات سنے گا۔ اسے خود بھی شاید یقین نہ ہو حالانکہ جس دریائے نیل کے کنارے وہ رہتا تھا اس نے فرعون کا انجام دیکھا تھا۔ انسان کا کمال یہ ہے کہ تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والی ان تبدیلیوں کی کوئی نہ کوئی توجیہہ یا تعبیر ضرور کر لیتا ہے۔ ہر تاریخی کتاب میں ایک باب ایسا ضرور موجود ہے جس کا عنوان ”زوال کے اسباب“ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ گبن نے جب قدیم روم کی تاریخ لکھی تو اس کا عنوان ہی ”فال آف دی رومن ایمپائر“ رکھا۔ مشہور مورخ ٹائن بی کا کئی ہزار صفحات پر مشتمل کام صرف ان وجوہات پر مشتمل ہے کہ فلاں قوم کیوں ابھری‘ اقتدار پر چھائی اور فلاں قوم کی ذلت و رسوائی اور ناکامی کی کیا وجوہات تھیں۔ انسان کی یہ ساری تگ و دو اور ساری جدوجہد اس مفروضے پر قائم ہے کہ اگر فلاں فلاں کام کر لیے جائیں تو اقتدار پر قیامت تک گرفت رہ سکتی ہے اور فلاں فلاں خامیاں آ جائیں تو مضبوط اقتدار بھی دھڑام سے گر جاتا ہے‘ لیکن تاریخ کبھی کبھی لوگوں کو حیران بھی کر دیتی ہے۔ طاقت بھی ہے‘ فوج بھی وفادار ہے‘ دنیا کی مضبوط ترین حکومتیں بھی ساتھ دے رہی ہیں۔ عوام میں جو سر اٹھاتا ہے یا تو اسے غائب کر دیا جاتا ہے یا پھر موت اس کا مقدر بنا دی جاتی ہے۔ سب لوازمات اقتدار موجود اور ایک دن تخت دھڑام سے گر جاتا ہے۔ دلوں پر راج کرنے والا‘ برطانیہ کو جنگ عظیم دوم میں فتح سے ہمکنار کرنے والا‘ جس کی شعلہ بیان تقریروں پر پورا ملک فریفتہ ہوتا تھا‘ کوئی یقین کر سکتا تھا کہ وہ چرچل لوگوں کے دلوں سے ایسا اترے گا کہ جنگ جیتنے کے بعد الیکشن ہار جائے گا۔ لیکن مورخین نے ان واقعات کی بھی توجیہات ”زوال کے اسباب“ کے باب میں لکھ کر یہ فرض ادا کر دیا کہ یہ سارا نظام کوئی مالک کائنات نہیں چلا رہا بلکہ انسان ہی خدا ہے اور علت و معلول یعنی Causeandeffect ہی دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر افغانستان میں جب اپنے زمانے کی عالمی طاقت برطانیہ شکست سے دوچار ہوئی تو وجوہات میں افغانوں کی بے سروسامانی کو بنیادی وجہ قرار دیا گیا کہ ان کے پاس تو کھونے کے لئے کچھ نہ تھا اس لیے وہ بے جگری سے لڑے۔ روس کی شکست کو امریکی امداد‘ پاکستان کی ایجنسیوں اور عربوں کے پیسے کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد امریکہ کی شکست کی تعبیرات بھی اسی علت و معلول کی زبان میں سامنے آ جائیں گی اور انسان یہ سوچ کر خوش ہو جائے گا کہ وہی اس زمین کا مالک و مختار اور حاکم ہے۔ لیکن میرے اللہ نے سورہ بقرہ کی آیت نمبر 251 میں اپنی حاکمیت‘ منشا اور دنیا چلانے کی حکمت کا واضح اعلان کر دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے ”اگر اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین پر فساد سے نظام بگڑ جاتا۔ دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ اس طرح وہ دفع فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے“)۔ یہ اس عظیم پالیسی ساز رب کی حکمت کا اعلان ہے اور اسے اپنے فیصلے کرنے کے لئے کسی اسباب و علل کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ وہ فرماتا ہے ”میں جسے چاہوں عزت دوں‘ جسے چاہوں ذلت‘ جسے چاہوں بادشاہت عطا کروں اور جس سے چاہوں چھین لوں“۔ لیکن فرمان کے آخر میں کہا کہ میرے ہاتھ میں خیر ہے۔ یعنی وہ جو فیصلہ بھی فرماتا ہے بندوں کی بھلائی کے لیے فرماتا ہے۔ اگر ظالموں‘ فاسقوں اور بددیانتوں کو کسی قوم پر مسلط کرتا ہے تو ایک تو یہ اس قوم کے اعمال پر اس کی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرا وہ مہلت عطا کرتا ہے کہ شاید قوم اپنے اعمال درست کرے اور ظلم سے لاتعلقی اختیار کرے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو وہ ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے ہٹا دیتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے فیصلے لوگوں کے اعمال پر منحصر ہوتے ہیں۔ اگر ظالم حکمرانوں سے تنگ آئے لوگ اس کی طرف رجوع کر لیں تو اپنے بندوں پر مہربان حاکم مسلط کر دیتا ہے۔ لیکن اگر اس نے دنیا کو فساد سے پاک کرنا ہو تو پھر بستیوں کی بستیاں اجڑتی ہیں اور نسلوں کی نسلیں تبدیل ہو جاتیں۔ چھ کروڑ لوگ لقمہ اجل بنتے ہیں تو یورپ میں قوم پرستی اور نسل پرستی کا تعصب ہٹلر اور مسولینی کے ساتھ خاک ہو جاتا ہے۔ سورہ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر میں امام جلال الدین سیوطی نے ایک اور توضیح رسول اللہ کی احادیث سے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اللہ کے نیک بندوں کی وجہ سے زمین سے آفتیں اور بلائیں دور ہوتی ہیں۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا رحمٰن کے خلیل کی مثل چالیس آدمیوں سے زمین خالی نہیں ہوتی‘ ان کی وجہ سے تمہیں بارش دی جاتی ہے اور ان کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے۔ ان میں کوئی مر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا مقرر فرماتا ہے (الاوسط‘ طبرانی)۔ امام احمد بن حنبل نے الزہد میں عبداللہ ابن عباس کی ایک روایت نقل کی کہ زمین نوح علیہ السلام کے بعد سات ایسے افراد سے کبھی خالی نہیں ہوتی جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اہل زمین کا دفاع کرتا ہے۔

ایسے ہی لوگ ہیں جو اس مملکت خداداد پاکستان کے حق میں دن رات آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی دعائیں کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ ملک اس دنیا میں اللہ کے نام کی غیرت کی علامت ہے۔ یہی لوگ تھے جو گزشتہ تین سالوں سے لوگوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہتے رہے لیکن حیف ہے اس قوم پر جو بھارت کے خلاف کرکٹ میچ جیتنے کے لئے تسبیح و نوافل میں غرق ہو گئی لیکن اس ملک میں امن و سلامتی کے لئے اس کے حضور سر بسجود نہ ہوئی۔ ایسے میں حکمرانوں کے دعوے اور نعرے میرے رب کو ناراض کرنے کے لئے کافی تھے جو فرماتا ہے کہ میں ”خوف میں امان دیتا ہوں“ ہم نے کہا ہمارے پاس پولیس ہے‘ ایف سی ہے رینجرز ہے اور پھر فوج ہے‘ ہم امن قائم کریں گے لیکن ہر دوسرے دن ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں اور شرم بیچ کر پھر دعوے کرنے لگتے ہیں۔ ایسے میں میرے اللہ کا وہ ازلی اور ابدی اصول حرکت میں آ جاتا ہے کہ اگر ہم بعض گروہوں کو بعض گروہوں سے نہ ہٹاتے تو زمین پر فساد پھیل جاتا۔ عوامی حمایت ہو یا عسکری طاقت‘ نسلی گروہ بندی ہو یا لسانی تعصب یہ سب کے سب خاک میں مل جاتے ہیں جب اللہ تبدیلی کا فیصلہ کرتا ہے اور اس کے اس فیصلے کے لئے بے کسوں‘ لاچاروں اور بے نواؤں کی کروڑوں فریادیں موصول ہو چکی ہیں۔ کتنی ماؤں کی آہیں اور کتنے بے گناہ مارے گئے لوگوں کے یتیم بچوں اور بیواؤں کی دلدوز چیخیں اس کی بارگاہ میں باریابی حاصل کر چکی ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب نوح علیہ السلام کے مثیل سات افراد بھی اللہ کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر کے یہی دعا مانگتے ہیں کہ ظالموں کی نسل سے بھی کسی کو باقی مت رکھنا۔

نوٹ: خط و کتابت کیلئے میرا پتہ اوریا مقبول جان۔ 20 کلب روڈ جی او آر۔ ون۔ مال روڈ۔ لاہور

گوند کا تالاب

ہم کس بدقسمت میڈیا کے ہاتھوں یرغمال ہیں جو اپنی آزادی سے لے کر اب تک اس ملک کے ٹوٹنے‘ معاشی طور پر دیوالیہ ہونے اور دہشت گرد ریاست کے اعلان پر تبصروں اور تجزیوں سے اپنی خواہشوں کا اظہار کرتا رہتا ہے لیکن اپنے آقاؤں کی ذلت و رسوائی پر خاموش ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ ان کے آقا نہیں بلکہ وہ بت ہیں جن کی یہ پوجا کرتے ہیں۔ یہ ان کی پرستش کے مندر ہیں ان کی مرادوں‘ آرزوؤں اور تمناؤں کا محور ہیں۔ مندر میں کبھی ایک بت نہیں ہوا کرتا۔ دنیا بھر کی دیومالائی دنیا جسے Mythology کہتے ہیں‘ اس میں ہر دیومالا میں ایک طاقتور ترین بت ہوتا ہے اور پھر اس کے ساتھ اس کے حواریوں کی ایک پوری کھیپ۔ یہ سب کے سب اس طاقتور بت کے حاشیہ نشین ہوتے ہیں۔ میرے ملک کے میڈیا کے مندر میں طاقت ور بت امریکہ ہے۔ اس بت کی پوجا اس لئے کی جاتی ہے کہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کائنات کی زمامِ کار اور کلی اختیار مالک کائنات کے ہاتھوں میں نہیں ہے بلکہ امریکہ جو چاہے کرے‘ جس کو چاہے معاشی پابندیاں لگا کر بھوکا مار دے‘ فوجی امداد بند کر کے کمزور کر دے‘ دہشت گرد قرار دے کر قید تنہائی میں سزا سنا دے اور اگر غیظ و غضب میں آئے تو ملکوں پر چڑھ دوڑے‘ قتل و غارت کا بازار گرم کرے‘ اپنی ٹیکنالوجی کے زور پر ہزاروں میٹر کی بلندی سے بم برسائے اور بستیوں کی بستیاں ویران کر دے۔ طاقت کے پجاری اس بت کی اس طرح پوجا کرتے ہیں کہ اس کی کسی کمزوری کا تذکرہ تک نہیں کرتے کہ کہیں عام مخلوق جس کو ہم نے اس ماورائی مخلوق سے ڈرا کر رکھا ہوا ہے کہ اس کا خوف دور نہ ہو جائے۔ وہ انگڑائی لے کر اس طویل سجدے سے اٹھ کر کھڑی نہ ہو جائے۔ طاقت کے ان پجاریوں کا ایک اور ہتھیار ہوتا ہے کہ لوگوں کو کمزور‘ بے یار و مددگار اور نااہل و غریب ثابت کرنا۔ اگر وہ بت ناراض ہو گیا تو تم پر فاقے آجائیں گے‘ تمہارا سارا اسلحہ اس کی دین ہے‘ تم پر دشمن چڑھ دوڑے گا‘ اس کی مدد نہ ہو تو تم دیوالیہ ہو جاؤ۔ تمہارے ملک کو تو اس نے بچا کر رکھا ہوا ہے ورنہ اس ملک کے حصے بخرے کرنے کی ساری تیاری مکمل ہے۔ جب کبھی اس آقا بت کا کوئی چھوٹا سا کارندہ پاکستان کے حق میں بیان دیتا ہے تو تبصرہ نگاروں کی باچھیں کھلی ہوتی ہیں اور جیسے ہی وہاں سے ناراضی کے اشارے ملتے ہیں تو ملک کے مستقبل پر تبصرے ہونے لگتے ہیں۔ بس دیوتا ناراض ہو گیا ہے اب دیکھو ہمارا کیا حشر ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ طاقت کے پجاریوں کے پاس ایک دوسرا مندر بھی تھا جس میں روس کا بت اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ پجاری اپنے اپنے بت کی طاقت پر نازاں تھے۔ ہر کوئی اپنے والے کے قصیدے گاتا تھا۔ جس دن روس افغانستان میں داخل ہوا تھا تو ان پجاری تبصرہ نگاروں کی خوشی دیدنی تھی۔ سرحدوں پر سرخ انقلاب کی دستک کے ترانے گائے جا رہے تھے۔ وہ جو ان دونوں مندروں سے الگ مالک کائنات کی کبریائی پر یقین رکھتے تھے انہیں بدترین انجام سے ڈرایا جا رہا تھا۔ بت دھڑام سے ٹوٹا۔ کرچی کرچی ہوا۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ سب کے سب جو موجودہ بت امریکہ کے مندر پر لعنت بھیجتے تھے چند لمحوں میں اس کے سامنے سربسجود ہو گئے کہ طاقت ور کی پوجا کے بغیر تو سانس لینا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اسے انسانی حقوق‘ عالمی اقدار اور معاشی ترقی کا نمائندہ گردانا گیا۔ لیکن اپنے ملک کے بارے میں تبصروں‘ جائزوں اور تجزیوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کی نظر میں یہ کل بھی ناکام ریاست تھی‘ ایک غلط اصول یعنی مذہب کے نام پر بنی ہوئی اور آج بھی ہے۔

اس غلامی میں میڈیا نے بھرپور حصہ لیا۔ جس کے بس میں جتنا تھا اس نے نسل‘ رنگ‘ زبان اور علاقے کی بنیاد پر اس مملکت کے وجود کی نفی کرنے کی کوشش کی۔ ایک ایسی فصل بوئی جس کے کاٹنے کے دن آئے ہیں تو سب سے زیادہ خوفزدہ یہی میڈیا ہے۔ زبان اور نسل کی بنیاد پر گرتی لاشوں کے شہر کراچی میں شہر چھوڑنے‘ خاموش رہنے یا ساتھ دینے کی دھمکیاں صرف میڈیا کو مل رہی ہیں لیکن اس خوف کے عالم میں جب انجام نظر آ رہا ہے‘ یہ لوگ پھر بھی اپنے آقا کے عیب چھپانے کی ذمہ داری نہیں بھولے۔

امریکہ کی دو سو سالہ تاریخ میں گزشتہ منگل دو اگست کا دن ایسا تھا جس کی وجہ سے پوری دنیا کی معیشت کی سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ امریکہ پر قرضوں کا بوجھ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس کی معیشت مزید آگے نہیں بڑھ پا رہی تھی۔ امریکی خزانے کے سربراہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر منگل کو امریکی ایوان نے مزید قرضے کا بندوبست نہ کیا تو ہم دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیں گے۔ اس خدشے کی وجہ سے تمام بڑی عالمی سٹاک مارکیٹیں گر گئی تھیں۔ یورو کے مقابلے میں ڈالر 1.4375 ہو گیا اور ین کے مقابلے میں تاریخی کم ترین سطح یعنی 78.12 پر چلا گیا۔ اسی وجہ سے سونے کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں۔ خام تیل کی قیمتیں گر گئیں۔ امریکہ قرضے 143 کھرب ڈالر تک جا پہنچے جس کی وجہ سے اوباما کو اپنے صوابدیدی فنڈ میں 10 کھرب ڈالر کمی اور صحت کی سہولت کے فنڈ میں ساڑھے چھ کھرب ڈالر کمی کرنا پڑی۔ اس بحران سے بند ہونے والے بنکوں کی تعداد 58 ہو گئی۔ یہ بحران اس قدر شدید تھا کہ اگر ہمارا میڈیا اپنے ہی ملک کے بنکوں اور منی ایکسچینجز کا چکر لگا لیتا تو دیکھتا کہ لوگ کیسے پاگلوں کی طرح ڈالر بیچ کر یورو خرید رہے تھے۔ بحران وقتی طور پر ٹل گیا۔ منگل کے روز ری پبلکن پارٹی کے ارکان مزید قرضے لینے اور عوام پر مزید ٹیکسوں کے بوجھ لادنے کے لئے حکمران جماعت کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گئے لیکن یہ چند دن پوری دنیا سولی پر لٹکی رہی۔ امریکی معیشت کا جو حال ہے اس کے بارے میں پوری دنیا اب اس نتیجے پر پہنچتی جا رہی ہے کہ یہ کسی بھی وقت دھڑام سے گر سکتی ہے۔ تاریخ ایک اور منظرنامے کو دہرانے کے لئے تیار ہے کہ جب چاند اور خلا میں امریکہ کا مقابلہ کرنے والا روس افغانستان میں ذلت آمیز شکست کے بعد اپنی کھوکھلی معیشت کی قبر میں اس طرح دفن ہوا کہ راشن کی دکانوں پر انسانوں کی قطاریں لگ گئیں اور بھوک و افلاس نے اس عظیم طاقت کو اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ وہاں سے عورتیں جسم فروشی کے لئے یورپ اور امریکہ میں درآمد ہونے لگیں۔ امریکی مردوں سے شادی کے سہانے خواب دکھانے والے ہزاروں ایجنٹوں کے دفاتر کھل گئے جنہوں نے غربت کی ماری اس عالمی طاقت کی معاشی بدحالی سے خوب فائدہ اٹھایا۔

افغان اور عراق جنگ کے بعد امریکہ کا یہ زوال میرے میڈیا کی نظروں سے اوجھل رہا۔ دنیا کی ہر ویب سائٹ اور ہر چینل اسے بریکنگ نیوز کے طور پر نشر کرتا رہا لیکن ہم کیسے کرتے۔ ہمارے دلوں میں بسا طاقت کا بت ٹوٹ جاتا۔ ہم تو صرف وہائٹ ہاؤس کے ترجمان کو براہ راست دکھاتے ہیں۔ مائیکل جیکسن اور ڈیانا کی تدفین دکھاتے ہیں۔ شاہی جوڑوں کی شادیاں دکھائی جاتی ہیں لیکن شاید کسی کو اس حقیقت کا ادراک تک نہیں جو تاریخ کے اوراق پر پہلے بھی لکھی جا چکی ہے اور اس کا صرف دہرائے جانا باقی ہے۔ جس وقت امریکی افغانستان کو تر نوالہ سمجھ کر داخل ہو رہے تھے تو ملا عمر نے ایک نعرہ لگایا تھا۔ افغانستان گوند کا تالاب ہے۔ اس گوند کے تالاب میں کتنے غرق ہوئے۔ برطانیہ‘ روس اور امریکہ‘ تمام عالمی طاقتیں‘ تمام طاقت کے مندر کے عظیم بت۔

انقلاب کی فصل پکنے کے دن

میرے ملک کے عظیم دانشوروں اور مؤرخوں کو ایک "عظیم" جنون لاحق ہے کہ کسی طرح تاریخ کو یوں توڑ موڑ کر پیش کیا جائے کہ جس سے ثابت ہو سکے کہ اس سرزمین پر رہنے والے نکمے، ناکارہ، جاہل اور فرسودہ خیالات کے لوگ ہیں اور یہ ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ان کے حکمران نااہل، عیاش اور بے کار تھے اور یہ جو ملک اسلام کے نام پر بنا ہے یہی اصل میں خرابی کی جڑ ہے۔ جس دن سے یہ مملکت وجود میں آئی ہے ان کا دنوں کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ ان کے "ارشادات" پر عمل کرتے ہوئے لوگ نسل، رنگ اور زبان کی تلواریں سونت کر میدان میں نکل آئیں اور ایک دوسرے کی لاشوں پر کھڑے ہو کر رقص کریں۔ یہ رقص تو شروع ہے لیکن یہ سارے "عظیم" دانشور، محقق، سیاسی رہنما اور مؤرخ اس بات کو بھولے ہوئے ہیں کہ نفرت کے زہر میں ڈوبی ہوئی تلواریں جب میان سے نکلتی ہیں تو پہلے عام آدمی ہی شکار ہوتے ہیں، پھر یہ لاوا اس قدر پھوٹتا ہے کہ بڑے بڑوں کی گردنیں گاجر مولی کی طرح کٹنے لگتی ہیں۔ کوئی یہ دلیل نہیں سنتا کہ میں نے تو تمہارے حقوق کی ترجمانی کی تھی۔ میں تو تمہیں محرومیوں سے نکالنا چاہتا تھا۔ تاریخ میں ہر ایسے عظیم رہنما اور دانشور کی گردن کٹتے دیکھی گئی ہے جس نے عصبیت کا بیج بویا، لوگوں کو جنگ میں جھونکا، موت کے رقص پر خوش ہوا اور پھر کبھی ہٹلر اور میسولینی کی طرح ذلت کی موت مرا اور کبھی ارشمیدس کی طرح سائنسی ایجادات کے باوجود وینس والوں کے نسلی تعصب کا شکار ہو گیا۔ تعصب کی سیاست کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ پچاس سال تک چکوال کا رہنے والا میرا دوست زمرد حسین بلوچ حقوق کی جدوجہد میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے اور آج اُس کی اولاد اپنے شہر مستونگ سے دربدر کر دی جاتی ہے۔ وہ جو قلات پبلشرز کے چھوٹے سے کمرے سے ان عظیم مؤرخوں کی کتابیں شائع کرتا تھا، آج اُس کی روح ان نظریات کا تماشہ اپنی اولاد کی دربدری کی صورت میں دیکھ رہی ہے۔

کس قدر جھوٹ تھا جو اس قوم کے سامنے بول کر ان کو برگشتہ کیا گیا۔ برصغیر میں مسلمانوں کے دور کو فرسودہ اور انگریز کی آمد کو رحمت تعبیر کرنے والے یہ مؤرخین تاریخ کی ان حقیقتوں کو کیسے جھٹلا سکتے ہیں کہ وہ مسلم ہندوستان جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا، جس پر ابھی جمہوریت اور کارپوریٹ کلچر کے بدنما پنجے نہیں گڑے تھے وہاں خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص عبدالغفور کے اثاثے ایسٹ انڈیا کمپنی سے زیادہ تھے۔ بنگال کے جگ ھت سیٹھ فیملی کے پاس بینک آف انگلینڈ سے زیادہ سرمایہ تھا۔ 1757 میں جنگ پلاسی کی لوٹ مار سے جو سرمایہ حاصل ہوا وہ پورے یورپ کی جی ڈی پی سے زیادہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فرانس، انگلینڈ اور پُرتگال کی افواج سے سپاہی بھاگ کر یہاں آکر بھرتی ہوتے تھے کہ زیادہ تنخواہ حاصل کریں اور قسمت بنائیں۔ کیپٹن الیگزینڈر ہملٹن نے محمد تغلق کے زمانے کی روداد لکھی ہے جو مؤرخ یہ ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں کہ مسلمان حکمران صرف تعمیرات کرتے تھے وہ یہ حقیقت نہیں بتاتے کہ اس کیپٹن کی یادداشتوں کے مطابق صرف دلی شہر میں دس ہزار سکول اور کالج موجود تھے اور پورے شہر میں ستر بیمارستان یعنی ہسپتال تھے۔ بنگال میں چالیس ہزار سکول اور کالج تھے جن میں کسی میں بھی چار سو سے کم طالب علم نہ تھے۔ ابن بطوطہ کا سفر نامہ اُٹھائیں وہ بمبئی کے قریب ایک جگہ ہواز کا ذکر کرتا ہے جہاں دو سکول مردوں اور تیرہ سکول عورتوں کے تھے اور پورے علاقے میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا خواہ مرد ہو یا عورت جسے قرآن حفظ نہ ہو اور وہ اس کا ترجمہ نہ جانتا ہو۔ دنیا کی سب سے بڑی سٹیل انڈسٹری برصغیر میں تھی اور یہ برتری 1880 تک قائم رہی۔ یہی حال جہازرانی کے شعبے میں تھا۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ جہاز یہاں بنتے تھے۔ اس برصغیر کی برآمدات ان ادوار میں کبھی بھی درآمدات سے زیادہ نہیں ہوئیں۔ یہ خوشحالی صرف چند لوگوں تک محدود نہ تھی بلکہ لارڈ میکالے کی 1835 کی تقریر کا وہ فقرہ اس کی تصدیق کرتا ہے کہ میں نے ہندوستان کے طول و عرض میں سفر کیا ہے لیکن مجھے کسی جگہ کوئی فقیر نظر نہیں آیا اور کہیں کوئی چور دکھائی نہیں دیا۔ 1911 کی مردم شماری جو انگریز نے خود کروائی، اُس کے مطابق اس علاقے کی شرح خواندگی نوے فیصد سے زیادہ تھی۔ یہ چند حقائق ہیں ورنہ ٹھٹھہ جیسے علاقے میں چار سو اعلیٰ تعلیمی اداروں سے لے کر حیدر آباد کے دنیا کے بہترین مرکز تراجم تک بہت کچھ ہے جس پر فخر کیا جا سکے۔ لیکن میرے یہ عظیم دانشور دوست صرف یہ ثابت کرنے میں زور قلم صرف کرتے ہیں کہ ہم جاہل، فرسودہ اور ناکارہ ماضی کے امین ہیں۔

اس کے بعد کی کہانی کوئی نہیں سناتا کہ کیسے یہ ہنستا کھیلتا ہندوستان جو دنیا بھر کی نظروں میں سونے کی چڑیا تھا، جس کی معاشی خوشحالی پر لوگ رشک کرتے تھے اور کولمبس جس کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔ جس ملک میں انگریز کی آمد سے پہلے کبھی شیعہ سُنی، دیوبندی بریلوی، پنجابی پٹھان، سندھی مارواڑی نفرتیں موجود نہ تھیں اور نہ کبھی اس بنیاد پر فساد ہوئے تھے۔ جہاں اس تمام معاشی خوشحالی اور اقتصادی ترقی کا پھل ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب سمیٹتے تھے۔ جس شرحِ تعلیم کا ذکر 1911 کی مردم شماری میں ملتا ہے وہ مسلمان حکمرانوں کی ایک غیر رسمی تعلیم پالیسی یعنی "نان فارمل ایجوکیشن" کا نتیجہ تھی جس کے تحت ہر گاؤں میں ایک مسلمان اور ایک ہندو اتالیق مقرر تھا جو حکومت سے وظیفہ لیتا تھا۔ جس کا کام مسلمان کو قرآن، فارسی اور حساب اور ہندو کو گیتا، فارسی اور حساب سکھانا تھا۔

مجھے تاریخ کے رونے نہیں رونے، ہمیں کس نے اور کیوں تباہ کیا سب کو معلوم ہے لیکن دکھ اُس وقت ہوتا ہے جب لوٹنے والے اور تباہ کرنے والے کو نجات دہندہ، ہیرو اور مستقبل کی اُمیدوں کا مرکز بنا دیا جائے۔ مسلمانوں کی دولت اور طاقت کے لٹ جانے کا المیہ کوئی المیہ نہیں، المیہ تو وہ احساس کمتری ہے جو میرے ملک کے "عظیم" دانشوروں نے اس قوم کے دماغوں میں زہر کی طرح بھر دیا ہے۔ بار بار کے ذلت آمیز فقروں سے اسے ہلکان کر دیا ہے۔ کیا ہو تم، ذلیل و رسوا لوگو، تم میں کوئی آکسفورڈ اور کیمبرج نہیں، کوئی سٹورائٹ مل اور سارتر نہیں، کوئی ایجادات کرنے والے ذہن نہیں۔ ریل گاڑی سے لے کر ٹیلیفون اور بجلی کے بلب سے کر ہوائی جہاز تک سب وہ لوگ بناتے ہیں، تم تو بس بیٹھے عیش کرتے ہو، نکمے اور ناکارہ۔ اس سب پر ایک بات کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور یہ ہے کاٹ کا فقرہ، اصل بُ غ ض باطن، اور "یاد کرتے ہو اپنے ماضی کو، پدرم سلطان بود"، "مسلم اُمہ کی رٹ لگاتے ہو، کدھر ہے وہ اُمہ"۔ یہ چند فقرے نہیں وہ خوف ہے ان سب کے دلوں میں بسا ہوا۔ ان کے آقاؤں کے دل میں بھی یہی خوف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب 1920 تک جنگ عظیم اوّل کے بعد مسلمانوں کے حصے بخرے کیے گئے تو جس کے پاس تیل کی زیادہ دولت تھی اُس کا ملک اتنا ہی چھوٹا بنایا گیا۔ دنیا کے دس بڑے تیل کے کنوؤں میں سے سات مسلمانوں کے پاس ہیں۔ اگر اس قوم کو اس طرح مرعوب کر کے تقسیم نہ کیا جاتا، اسے احساس کمتری کا شکار کر کے مارا نہ جاتا تو آج دنیا کا نقشہ مختلف ہوتا۔ ایک صدی گزر چکی۔ اب آزمائشوں اور مصیبتوں کے زمانے ختم ہونے کو ہیں۔ ترکی کی انگڑائی اس کی جانب اشارہ ہے اور اس انقلاب کی دوسری منزل میرا ملک پاکستان ہے۔ انقلاب کی فصل پک چکی ہے، جب فصل پک جائے تو کوّے اور ٹڈی دل فصل تباہ کرنے آتے ہیں۔ ایسے میں صرف چند کوّے لٹکانے ہوتے ہیں، فصل محفوظ ہو جاتی ہے۔

جب روح بیمار ہو جائے

جب گھروں سے چیخ وپکار کی صدائیں مسلسل بلند ہو رہی ہوں، بیواؤں اور یتیموں کی آہ وبکا ارد گرد بسنے والوں کے دل دہلا دیتی ہو، موت کا سناٹا اس قدر خوفناک ہو کہ ماؤں کو دن بھر دھڑکا لگا رہے کہ ان کے لخت جگر شام کو گھر سلامت لوٹیں گے یا نہیں تو ایسے شہر دیر تک اللہ کے غضب اور اُس کے قہر سے محفوظ نہیں رہا کرتے۔ اس لئے کہ یہ اُس کا ہی دعویٰ ہے کہ کون ہے جو مضطرب دلوں کی فریاد سنتا ہے۔ اگر انسان اس ظلم و ستم پر افسردہ و پریشان ہو جائیں، ان کی آنکھیں لوگوں کے دکھوں میں نم ہو جائیں اور ان کے زخموں کا مرہم بن جائیں، لوگ دکھوں کا مداوا کرنے کے لئے نکل پڑیں تو پھر رحمت پروردگار بھی جوش میں آجاتی ہے اور دلوں کو جوڑ دیتی ہے۔ کہ یہ بھی اُسی مالک حقیقی کا دعویٰ ہے کہ وہ بھوک میں کھانا اور خوف میں امن عطا کرتا ہے (القریش)۔ لیکن یہاں تو عالم ہی اور ہے۔ ایک جانب لاشیں گرتی ہیں تو دوسری جانب غصے سے آنکھیں لال ہو جاتیں ہیں، منہ سے جھاگ نکلنے لگتی ہے، زبان اول فول بکنے لگتی ہے، بندوقوں کے بلٹ کھینچنے کی آوازیں گونجتی ہیں اور پھر دوسری جانب لاشوں کا حساب برابر کر دیا جاتا ہے۔ شام کو ٹیلی ویژن کے مذاکروں پر یہی لوگ پارساؤں کا روپ دھارے ملک و قوم کے نجات دہندہ بنے منافقوں کی زبان بول رہے ہوتے ہیں۔ کمال ہے اس ملک کے میڈیا کا کہ گذشتہ ایک سال سے کشت وخون کا بازار گرم ہے، لیکن تبصرے اور تجزیے کے لئے ان کو ہی بلایا جاتا ہے جن کی وجہ سے یہ آگ لگی، جن کے ہاتھوں گھر اُجڑے، گودیں ویران ہوئیں، جن کی گوہر افشانی اور "حُسن گفتار" سے آگ بڑھکتی ہے، شعلے لپکتے ہیں۔ لیکن کوئی ان ماؤں، بیٹیوں، بیواؤں، یتیموں کی صورتیں ٹیلی ویژن سکرین پر نہیں لے کر آتا کہ جو چیخ چیخ کر بتائیں کہ ان کے قاتل کون ہیں، وہ درندے کون ہیں جن کی وجہ سے اس شہر کا امن غارت ہوا۔ لیکن جب کسی جگہ کا مقدر عذاب ہو تو ایسی مضطرب صداؤں کو آواز نہیں ملا کرتی، وہ سیدھا عرشِ عظیم سے جا ٹکراتی ہیں اور وہیں سے اپنا جواب لے کر واپس لوٹتی ہے۔

تاریخ ایسے کئی شہروں کے افسانے بیان کرتی ہے جو اسی طرح انسانوں کی درندگی کا شکار ہوئے اور پھر اللہ کا فیصلہ آگیا۔ میں یہاں الہامی کتابوں میں دیئے گئے قصوں کا ذکر نہیں کروں گا کہ میرے روشن خیال اور عقلیت پسند دوستوں کو یہ صرف کہانیاں لگتی ہیں۔ میں تو 1348ء سے پہلے کے قانون اور انصاف کے علمبردار انگلینڈ کا ذکر کروں گا۔ جہاں خوشحالی بھی تھی اور ترقی بھی۔ لیکن اس کے شہروں میں بھی اسی طرح سیاسی اور سماجی رہنما قاتلوں، اغواکاروں، لٹیروں اور تاوان خوروں کے جتھوں کے سرپرست بن گئے تھے۔ اس دور کی تصویر لیوک اوون نے اپنی کتاب "ہسٹری آف کرائم ان انگلینڈ" میں یوں کھینچی ہے۔ "گھروں کو روز بروز آگ لگا دی جاتی تھی۔ مردوں عورتوں کو یرغمال بنا کر ان سے تاوان کی رقم وصول کی جاتی۔ تاوان دینے کے بعد بھی اگر کوئی خوفناک انجام سے بچ جاتا تو اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کرتا" جان ٹیلر لکھتا ہے کہ "اُس وقت انگلستان انتہائی خوشحال اور دولت مند تھا لیکن وہاں لٹیروں کے گروہ چھوٹی موٹی افواج کی طرح تھے۔ یہ گروہ جہاں کہیں رونق ہوتی، میلہ لگا ہوتا وہاں پر ٹوٹ پڑتے۔ وہ کسی بھی شہر کو یرغمال بنا لیتے، قبضہ کرتے، اُسے لوٹ کر آگ لگا دیتے۔ 1347ء اور 1348ء کے دو سالوں میں ایک لٹیرے نے چند اہم رہنماؤں کی آشیر باد سے برسٹل پر قبضہ کر لیا اور وہ بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے والے جہازوں کو لوٹنے لگا۔ ان میں بادشاہ کے اپنے جہاز بھی شامل ہوتے۔ وہ حکم دیتا تو لوٹ مار شروع ہو جاتی، حکم دیتا تو فوراً شہر میں امن ہو جاتا۔ تنگ آکر بادشاہ کو ان لٹیروں کے پشت پناہ لارڈ تھامس اور لارڈ برکلے کو امن قائم کرنے اور منانے کے لئے بھیجنا پڑا۔" عدالتوں کا حال وہی تھا جیسے کراچی شہر میں 12 مئی کے مقدمے کے دوران ہوا تھا۔ مانچسٹر کی ایک عدالت میں ایک بدنام لٹیرے کا کیس زیر سماعت تھا۔ عدالت کے ارد گرد مجمع ہو گیا جو عدالت کی جانب جانے والے ہر شخص پر حملہ کرتا۔ مجبوراً عدالت کو مقدمہ منسوخ کرنا پڑا۔ یہ قصہ صرف انگلینڈ کے شہروں تک محدود نہ تھا بلکہ یورپ کا ہر بڑا شہر اسی عذاب میں مبتلا تھا۔ نہ کوئی مرنے والوں کی موت کا نوحہ سنتا تھا اور نہ لٹنے کی آہ وبکا۔ ہر کسی کو اپنے اپنے گروہ کے قزاق، لٹیرے، قاتل اور چور عزیز تھے۔

ایسے میں جب خلق خدا چاروں جانب سے مایوس اور نااُمید ہو جائے۔ حالات کے بدلنے کا کوئی راستہ موجود نہ ہو، خلقت ظلم کے خلاف سینہ سپر ہونے کی بجائے مجرمانہ طور پر خاموش ہو جائے تو پھر مالک کائنات پوری کی پوری نسل کو تبدیل کر دیتا ہے۔ اُس کے غضب اور ناراضگی کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی انگلینڈ میں بلکہ پورے یورپ میں ہوا۔ 1348ء کی گرمیاں شدید بارشوں کی وجہ سے سرد ہو گئیں۔ فصلیں بارشوں کے اثر سے کھیتوں میں ہی جل گئیں۔ لوگ سمجھے اس سال شدید قحط آئے گا۔ سب غلہ جمع کرنے میں لگ گئے لیکن اللہ کی جانب سے ایک اور عذاب ان کے انتظار میں تھا۔ اگست 1348ء کی ایک صبح برطانیہ کے ساحلی علاقوں میں پلیگ کے شواہد نظر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کے گاؤں اس کا شکار ہو کر صرف دو یا تین دن کے اندر موت کی آغوش میں چلے گئے۔ یکم نومبر کو پلیگ لندن شہر پہنچا اور صرف ایک ہفتے کے اندر ستر ہزار کے شہر میں سے تیس ہزار افراد لقمہ اجل بن گئے۔ دو سالوں کے دوران اس مرض نے انگلینڈ کی چالیس فیصد آبادی کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔ بیس لاکھ لوگ مر گئے اور پچاس لاکھ کے برطانیہ کی آبادی تیس لاکھ رہ گئی۔ یہی حال یورپ کے باقی شہروں کا ہوا۔ پورے یورپ کی آدھی آبادی ختم ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ اس کا جرثومہ چین سے شاہراہِ ریشم کے راستے تجارتی قافلوں کے ساتھ یورپ پہنچا۔ عذاب جہاں آنا تھا وہی اس کی منزل تھی۔ راستے کے شہروں میں سے نسبتاً خاموشی سے گذر گیا لیکن یورپ جہاں اُس وقت قتل وغارت، اغوا برائے تاوان، لوٹ مار اور بھتہ خوری کا راج تھا، اُسے برباد کر کے رکھ دیا۔ پورے یورپ کی آدھی سے زیادہ آبادی ختم ہو گئی۔ موت اس قدر آناً فاناً ہوتی کہ دو یا تین دن میں بستی کی بستی انسانوں سے خالی ہو جاتی۔ سالوں بعد تحقیقات ہوئیں۔ وجوہات بیان کی گئیں۔ کسی نے کہا طب کا علم اتنا ترقی یافتہ نہ تھا۔ کسی نے جواب دیا، لوگ حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل درآمد نہیں کرتے تھے۔ وباء کو روکنے کے لئے سرحدوں پر روک تھام کے انتظام نہیں تھے۔ سب سائنسی تجزیے اس بات سے خالی ہوتے ہیں کہ بستیاں صرف گوشت پوشت کے انسانوں اور اینٹ گارے کی عمارتوں سے نہیں استوار ہوتیں بلکہ اس میں ایک روح دوڑتی ہے، انصاف، اخلاق، امن اور چین کی روح۔ یہ روح بیمار بھی ہو جاتی ہے۔ اس کا علاج بھی ہوتا ہے۔ لیکن جب روح کی بیماری اس قدر بڑھ جائے کہ علاج ناممکن ہو تو پھر اُس کا علاج موت ہوتا ہے۔ میرے اللہ نے یہی اصول بار بار فرمایا ہے کہ جب تمہارے اعمال اور افعال سدھرنے کے قابل نہ ہوں تو اللہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم یا نسل آباد کر دے گا۔ ڈرو اس وقت سے جب ایسا فیصلہ ہو جائے۔

خوف زدہ، دہشت گرد، جنونی

کوئی اُسے دہشت گرد، خونی، ظالم یا جنونی کے نام سے نہیں پکار رہا۔ کوئی نہیں کہتا کہ اس شخص نے نوے سے زیادہ انسانوں کی جان لی ہے۔ اُس نے جس جگہ تعلیم حاصل کی ہے، جس ادارے میں اُس کی تربیت ہوئی ہے اُس کو بند کر دو، بلکہ ایسے تمام اداروں کو بند کر دو کیونکہ یہ نفرت پھیلاتے ہیں۔ اُس شخص نے اپنے آپ کو یورپی متعصب نسل پرست نہیں کہا بلکہ وہ خود کو ایک عیسائی بنیاد پرست کہتا ہے جو مسلمانوں کے وجود سے شدید نفرت کرتا ہے اور انہیں اپنے ارد گرد دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ کسی نے یہ نعرۂ مستانہ نہیں لگایا کہ چرچ اور گرجا گھر نفرت اور دہشت سلوگردی کے مراکز ہیں۔ یہ ہے دنیا بھر کے میڈیا اور میرے ملک کے میڈیا کا انصاف اور "جانبدارانہ "رویہ۔ او میں ہونے والے بم دھماکے اور مرنے والے نوے افراد کی فوٹیج اتنی ہی دیر تک میڈیا پر ہیڈ لائن کی حیثیت رکھتی تھی جب تک اُس کے مجرم کا علم نہ تھا کیونکہ اس طرح جس کو چاہو مجرم بنا دو کا ہتھیار ہاتھ میں آیا ہوا تھا۔ القاعدہ ہے، طالبان ہے، مسلمان شدت پسند ہیں اور سب سے بڑھ کر اسلام کی تعلیمات۔ لیکن جس شخص نے گھر پھونک کر یہ تماشا بنایا تھا وہ تو اپنے تعصب اور اپنی نفرت کا بر ملا اظہار چاہتا تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے یورپ کو خبردار کرتا آ رہا تھا کہ دیکھو ایک دن اس خطے یعنی جسے کبھی مسیحی یورپ کہا جاتا تھا۔ اور شاید آج بھی وہ اُسی تقسیم پر قائم ہے، وہاں کا اکثریتی مذہب اسلام ہو جائے گا۔ اینڈرس بہرنگ بری وک (Behring Breivik Anders)، سنہرے بالوں والا ناروے کا شہری جس کی عمر صرف 32 سال ہے۔ جس نے بزنس ایڈ منسٹریشن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، ایک کسان بھی ہے اور تاجر بھی۔ اپنے آپ کو ایک شدت پسند اور کٹر عیسائی کہتا ہے اور خود کو یورپ کے اُس خوف کا نمائندہ تصور کرتا ہے، جس نے وہاں کے بہت سے سیاستدانوں، دانشوروں اور تجزیہ نگاروں کی تنقیدیں حرام کر رکھی ہیں۔ خوف یہ ہے کہ اگر یورپ کے ممالک میں مسلمانوں کی آبادی ایسے ہی پھیلتی رہی اور وہ اسی طرح پھلتے پھولتے رہے تو ایک دن یہ مغرب نہ عیسائیت کا گھر رہے گا اور نہ گوروں کا وطن۔ بری وک نے اسی خوف کو پوری دنیا کے سامنے آشکار کرنے کے لئے اپنے ہی ہم وطن نوے لوگوں کی جان لے لی۔ موت کے اس رقص پر اس کا انداز روم کے اُس مشہور بادشاہ نیرو جیسا تھا جس نے روم کے شہر کو آگ لگائی اور پھر شعلوں سے جلتے ہوئے شہر کو دیکھتے ہوئے دور بیٹھ کر بانسری بجاتا رہا۔ نیرو تو شاید اپنی کسی فن کارانہ کسک اور پاگل پن سے مجبور ہو کر یہ سب کچھ کر رہا تھا لیکن بری وک کا جنون تو ایک طویل سوچ کا نتیجہ ہے جو یورپ کے خوف کی علامت ہے۔

اس نے اس قتل و غارت سے بہت پہلے اپنے شدت پسند اور کٹر خیالات کا اظہار 1516 صفحات پر مشتمل مینی فسٹو میں کیا۔ اس مینی فسٹو کا نام (2083، یورپ کا اعلانِ آزادی) (Declaration of Independence 2083, A European) تھا۔ نفرت سے بھری ہوئی اس تحریر میں یورپ کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف مقدس جنگ کے آغاز کے لئے کہا گیا ہے۔ ناروے کے قتل عام سے پہلے اُس نے یوٹیوب پر ایک ویڈیو جاری کی جس میں اُس نے تمام بنیاد پرست عیسائیوں کو شہادت گلے لگانے کے لئے کہا۔ اُس کے بعد اُس نے ایک عمارت میں بم دھماکہ کیا جہاں گیارہ لوگ مر گئے پھر دو گھنٹے بعد وہ لیبر پارٹی جو آزاد اور روشن خیال سیاسی جماعت ہے اُس کے کیمپ میں گھس گیا جہاں نوجوان موجود تھے اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی جس سے 82 نوجوان مارے گئے۔

بری وک کے مینی فسٹو میں جہاں اور بہت کچھ نفرت سے بھرا ہوا ہے وہاں اس شدت پسند دہشت گرد جنونی کے کچھ پسندیدہ پاکستانی افراد بھی ہیں اور ناپسندیدہ پاکستانی رہنما بھی۔ ناپسندیدہ لوگ تو وہی ہیں جو میرے ملک کے روشن خیال لوگوں کو بھی اچھے نہیں لگتے۔ ایک علامہ اقبال اور دوسرے ابوالاعلیٰ مودودی۔ وہ سب سے زیادہ پاکستان، پاکستانیوں اور خصوصاً اس مملکت کی بنیاد دو قومی نظریے سے خوفزدہ ہے۔ وہ اپنے بچپن کے ایک پاکستانی دوست کا ذکر کرتا ہے جو ناروے میں رہ کر یہاں کے ماحول سے اس لئے نفرت کرتا ہے کیونکہ یہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پاکستانیوں کی آبادیاں ہر ملک میں بڑھتی جا رہی ہیں اور یورپی باشندے کم ہو رہے ہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ سارے پاکستانی برصغیر میں 1947 کی طرح یہاں بھی دو قومی نظریے کی طرح علیحدہ وطن مانگیں گے۔ اس ساری صورتِ حال کو وہ Pakistanization of Europe (یورپ کی پاکستانیت) سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے علم ہے کہ یورپ میں دھڑا دھڑ لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ برطانیہ میں روزانہ دو سے تین اور فرانس میں تین سے چار گورے مسلمان ہو رہے ہیں۔ اس کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں، لیکن وہ پاکستان کی انسانی حقوق کی علمبردار حنا جیلانی اور پاکستان کے انگریزی اخبار کے کالم نگار رضی اعظمی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ پاکستان میں ان دونوں کے مطابق ہندوؤں اور عیسائیوں کو زبردستی مسلمان بنایا جاتا ہے۔ یہ دونوں کہتے ہیں کہ کیوں کوئی مسلمان عیسائی یا ہندو نہیں ہوتا۔

میرے یہ دونوں روشن خیال دانشور شاید تاریخ کے بہتے دھارے میں حقائق سے آشنا نہیں۔ دنیا کی پوری تاریخ میں ہمیشہ یہ ہوتا آیا ہے کہ لوگ فاتحین کا دین قبول کر لیتے تھے۔ جہاں جہاں عیسائی اقوام گئیں وہاں لوگ عیسائی ہو گئے۔ میں زبردستی کا ذکر نہیں کروں گا حالانکہ فلپائن کے مظالم کا تو ایک پورا باب ہے۔ لیکن مسلمان یا اسلام دنیا کا وہ واحد مذہب ہے کہ جب چنگیز خان کی اولاد نے بغداد کو تاخت و تاراج کیا تو پھر آگے بڑھتے ہوئے جب ان کی مسلمانوں کے دین سے آشنا ہوئی تو اس کے پوتے نے اسلام قبول کر لیا۔ یہی فاتح تھے جن کی نسل سے برصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوا۔ میرے ان دونوں عظیم دانشوروں کو تاریخ کی اس حقیقت کی بھی خبر ہو گی کہ جہاں جہاں میرے پیارے رسول ﷺ کے تیار کردہ لوگ اسلام لے کر گئے وہاں لوگوں نے اپنا رہن سہن، ثقافت یہاں تک کہ مادری زبان بھی ترک کر دی۔ عراق، شام، لبنان، مصر، اُردن اور مراکش میں کبھی عربی نہیں بولی جاتی تھی۔ آج یہ عرب دنیا کا حصہ ہیں۔ کیا برطانیہ میں مسلمان ہونے والے ایک لاکھ نسلی انگریز جن میں ستر ہزار عورتیں ہیں جو پہلے حجاب پہنتی ہیں پھر کلمہ پڑھتی ہیں۔ کیا یہ سب تلوار کے خوف سے مسلمان ہوئے ہیں۔ وہ تو وہاں اکثریت میں ہیں، ان کی حکومت ہے۔ کوئی پورے یورپ میں ایسے جوق در جوق ہندو، عیسائی یا بدھ کیوں نہیں ہوتا۔ سچائی نے ایک دن کھلنا ہوتا ہے اور یہ میرے اللہ کا وعدہ ہے جو قرآن میں فرماتا ہے "ہم نے ایک رسول ﷺ بھیجا ہدایت دے کر اور حق پر قائم دین کے ساتھ تاکہ اُسے دوسرے تمام ادیان پر غالب کر دیں "چاہے کافروں کو یہ کتنا ہی بُرا کیوں نہ لگے۔

نیلسن منڈیلا اور سیّد علی گیلانی

عینک میں اُس شخص سے صرف دو بار ملا ہوں۔ نرم گفتار چہرے پر متانت، بلا کی ذہین آنکھیں کہ جن کی چمک کے شیشوں کے پیچھے سے بھی نظر آتی تھی، لیکن گفتگو درد میں ڈوبی ہوئی، ایسا لگتا جیسے کشمیری مسلمانوں کا دکھ بیان کرتے کرتے ان آنکھوں میں رُکے ہوئے آنسو ابھی سیلاب کی طرح بہہ نکلے تو شاید محفل میں ہر کسی کی آنکھ نم ہو جائے۔ عمر کے اس حصے میں جب لوگ دنیا چھوڑ کر آرام کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں، یہ شخص نوجوانوں کی طرح ملکوں ملکوں مظلوم کشمیریوں کا مقدمہ اپنی گفتگو اور تحریر سے لڑتا گھومتا پھرتا تھا۔ میرے ملک کے دانشور بھی عجیب ہیں، اس سے طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ ان میں سے ایک سوال اُس کے جذبات میں طوفان برپا کرنے کے لئے کافی تھا۔ کسی ایک نے پوچھا، کشمیر کو آزاد ملک کی حیثیت سے بھارت سے علیحدہ کروانے والے لوگ کتنے ہیں۔ اُس نے کہا مٹھی بھر، پھر کہا پاکستان کے رویے سے مایوس لوگ کتنے ہیں۔ یہاں اس بوڑھے شخص کی آواز رعب سے گرجی اور اُس نے کہا کہ میرا جواب وہی ہے جو کشمیر میں آزادی کی تحریک کے متفقہ قائد سیّد علی گیلانی نے حرم کی چار دیواری میں ایک پاکستانی وزیر خارجہ کو دیا تھا جو امریکی ایجنڈے کے مطابق کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنے کی جانب گفتگو بڑھا رہا تھا۔ سیّد علی گیلانی نے کہا، پاکستان کشمیریوں کے لئے ایک ملک نہیں بلکہ پاکستان ان کا ایمان ہے۔ آج یہ نرم گفتار اور سراپا امن شخص غلام نبی فائی امریکہ میں گرفتار ہے ۔ اُس پر الزام ہے کہ وہ کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کا مقدمہ گفتگو اور تحریر کے ذریعے دنیا بھر اور خصوصاً امریکہ میں کیوں لڑ رہا ہے۔ غلام نبی فائی جو بنیادی طور پر کشمیری ہے لیکن مدتوں امریکہ میں رہنے کی وجہ سے وہاں کا شہری بھی ہے۔ اُس شخص نے کشمیر کا مقدمہ اس بلا سے لڑا کہ امریکی کانگریس میں اُس کے کئی ہم نوا پیدا ہو گئے۔ دفتر خارجہ کے ملازم اُسے ایک سچا اور کھرا انسان سمجھتے اور اُس کی گفتگو غور سے سنتے۔ دنیا بھر کے کتنے حکمران تھے جن سے اُس نے ذاتی مراسم بنا لئے تھے۔ وہ امریکہ کے سب سے اہم مقام کیپٹل ہل جہاں تمام کانگریس کے ممبران موجود ہوتے، وہاں کشمیر کانفرنس باقاعدگی سے منعقد کرواتا۔ نہ اسلحہ بردار نہ ہتھیار اُٹھانے والے ساتھ ، لیکن پھر بھی اس کے خوف کا یہ عالم کہ اُسے اس الزام پر گرفتار کیا گیا کہ اُس نے مظلوموں کی آواز بلند کرنے کے لئے رجسٹریشن کیوں نہیں کروائی تھی۔

یہ سوال اُس امریکہ میں اُٹھایا گیا ہے جہاں سالوں آئرلینڈ کے رہائشی اپنے ساتھیوں کے لئے چندہ اکٹھا کرتے جو ان کو وہاں دیا جاتا تاکہ وہ انگلینڈ کے خلاف مسلح جدوجہد جاری رکھ سکیں۔ یہ وہ معاملہ تھا جس پر انگلینڈ جیسے دوست ملک نے جب بھی احتجاج کیا اُسے جنگ آزادی اور حقوقِ انسانی کے نام پر ٹکا سا جواب دے دیا گیا۔ اسی امریکہ میں کئی ایسے کیسینو اور جوئے کے اڈے ہیں جو لاس ویگاس کے شہر میں کھولے گئے ہیں اور جن کی آمدنی سیدھی اسرائیلی حکومت کے اُس فنڈ میں جاتی ہے جو فلسطینی علاقوں پر یہودی بستیاں بسانے اور وہاں پر ہونے والی مزاحمت کو کچلنے پر خرچ ہوتی ہے۔ مدتوں افریقن نیشنل کانگریس نے جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے خلاف اپنی تحریک اسی امریکہ میں منظم کی اور یہیں وہ ان تمام کانگریس کے ممبران سے ملتے رہے۔ یہیں سے نیلسن منڈیلا کے وجود کو پوری دنیا میں ہیرو تسلیم کروایا گیا۔ افریقہ کے کونے میں واقع جنوبی افریقہ جو معدنی دولت سے مالا مال ہے وہاں ایک نسل پرست گوری حکومت دوسری نسل یعنی کالے افریقیوں پر ظلم و جور سے حکومت کر رہی تھی۔ وہاں پر اکثریت کالوں کی تھی لیکن گوروں کا اقتدار پر قبضہ قائم تھا۔ ایک رنگ کی دوسرے رنگ کی قوم کے ساتھ لڑائی اور جدوجہد تھی۔ ساری دنیا کا میڈیا، انسانی حقوق کے علمبردار دانشور، ادیب، روشن خیال اس ظلم پر چیخ رہے تھے۔ عالمی برادری اس قدر "بیدار" تھی کہ جنوبی افریقہ کی کرکٹ ٹیم کے ساتھ کوئی میچ نہیں کھیلتا تھا۔ وہاں کے پادریوں تک کے ارشادات دنیا میں نشر ہوتے جو وہ گوری نسل پرست حکومت کے خلاف بولتے۔ ستائیس سال قید کاٹنے والا نیلسن منڈیلا عالمی ضمیر کی آواز بن کر اُبھرا۔ پوری دنیا کا دباؤ تھا۔ وہاں کے رہنے والوں کو بدترین غلامی سے نجات دلوائی گئی۔ پتہ نہیں کیوں اُس وقت بھی میرے دل میں یہ سوال اُٹھا تھا کہ اگر یہ سارے کالے جو جنوبی افریقہ میں رہتے ہیں مسلمان ہوتے اور گورے ہی حکمران ہوتے تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ جنوبی افریقہ میں نسل پرست حکومت کو ختم ہوئے کئی دہائیاں گذر چکی ہیں اور بار بار میرے اس سوال کو تقویت بھی ملی ہے۔ میں اسے عالمی دو قومی نظریہ سمجھتا ہوں یہ عالمی دو قومی نظریہ میرا نہیں میرے اللہ کا عطا کردہ ہے۔ آپ اس دو قومی نظریے کی کسوٹی پر دنیا بھر کے مسلمانوں اور دیگر قوموں کو پرکھ کر دیکھ لیں آپ کو اس سے سچا کوئی نظریہ نظر نہیں آئے گا۔ یہ جنوبی افریقہ کی عیسائی سیاہ فام اکثریت کی آزادی تک محدود نہیں ہے۔ انڈونیشیا میں ایک علاقہ تھا مشرقی تیمور۔ وہاں کے رہنے والے رنگ، نسل، زبان اور علاقے کے معاملے میں ایک تھے۔ سب کی شکل و شباہت اور طرزِ زندگی ایک جیسا تھا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد جب انڈونیشیا کی تخلیق جدید ہوئی تو یہ ایک ساتھ تھا۔ لیکن عالمی ضمیر اور عالمی برادری اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھی جب تک مشرقی تیمور کے عیسائیوں کو مذہب کی بنیاد پر علیحدہ نہیں کروالیا۔ سوڈان کے جنوبی سوڈان کی کہانی تو ابھی چند دن پرانی ہے۔ اس علاقے کو دارفور کہتے ہیں۔ یہ علاقہ بھی باقی سوڈان کی طرح ایک جیسے سیاہ فام افریقیوں، ایک رنگ، نسل اور زبان والوں سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن پورے سوڈان پر مسلمانوں کی حکومت تھی اور یہ لوگ عیسائی تھے اس لئے عالمی ضمیر اور انصاف کی نظر میں اس محکوم قوم کی آزادی ضروری تھی۔ دنیا پوری کی پوری ایک جانب اکٹھی ہوئی اور سوڈان کی مسلمان حکومت دوسری جانب اور یہ عالمی برادری اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھی جب تک مذہب کی بنیاد پر ان کو آزاد نہیں کروالیا گیا۔

غلام نبی فائی جیسا مرنجا مرنج اور شریف النفس انسان جو یہ سمجھتا تھا کہ اس عالمی ضمیر اور عالمی برادری کو دلیل کے ذریعے قائل کر کے کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کا مقدمہ لڑا جا سکتا ہے، اُسے گرفتار ہونا ہی تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ یہ لفظ عالمی برادری ایک ڈھونگ ہے، فراڈ ہے۔ یہ تو میرے اللہ کی بنائی ہوئی تقسیم کی علامت ہے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا تھا "الکفر ملۃ واحدہ" پورا کفر ایک ملت ہے۔ یہ ملت واحدہ صرف ایک قوم کے خلاف متحد ہے اور وہ قوم ہے ملت اسلام۔ میرے ملک کا دانشور اسے مانے یا نہ مانے عالمی برادری کے لئے میں نفرت کی علامت، دشمنی کا معیار ہوں۔ غلام نبی فائی کس غلط فہمی میں تھا۔ عالمی برادری اور منافق دانشوروں کے ہاں نیلسن منڈیلا ہیرو بن سکتا ہے سیّد علی گیلانی نہیں۔

تعصب کا پودا اور اُس کی پیاس

جو بیج میری سرزمین پر "عظیم" محقق، دانشور، تاریخ دان، سیاست دان اور شاعر صرف اس وجہ سے 63 سال سے بوتے آئے ہیں کہ کہیں اس ملک کے رہنے والے رنگ، نسل، زبان اور قبیلے سے بالاتر ہو کر اس ملک کی وجہ تخلیق یعنی اسلام کی جانب نہ دیکھنے لگ جائیں، اب اُس کی فصل کاٹنے کے دن آ گئے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوم پرستی کے درخت پر آج تک قتل و غارت کے زہریلے کانٹوں اور نفرت کے کڑوے کسیلے پھل کے سوا کوئی اور فصل کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکی۔ میرے ملک کے یہ ذہین افراد جنہوں نے کتابوں میں قوم کی یہ تعریف پڑھ کر رٹ رکھی تھی کہ قومیں جغرافیہ، ثقافت اور نسل سے بنتی ہیں ان کے علم کو جب سادہ لوح، ان پڑھ لیکن ایمان کی دولت سے مالامال برصغیر کے مسلمانوں نے مذہب کی بنیاد پر مملکت تشکیل دے کر شکست دی تو ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ صرف ان کے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور نہ کانوں پر بھروسہ قائم تھا۔ اس دن یعنی چودہ اگست 1947ء سے لے کر آج تک یہ سب لوگ اس سرزمین پر نسل، رنگ، زبان اور قبیلے کا بیج بوتے آئے ہیں۔ یہاں سب کے سب انسان نہیں بلکہ چار قومیں آباد ہیں، چار اکائیاں ہیں۔ ان کا اپنا کلچر ہے، ثقافت ہے، رہنے کے طور طریقے ہیں۔ ان میں کچھ کو مظلوم اقوام بتایا گیا اور کچھ کو ظالم، تاکہ اس خطے میں قوم پرستی کے تعصب کو ہوا ملے۔ شاید ان لوگوں نے دنیا کی تاریخ پڑھی نہیں تھی یا پھر ان کو اس بات کا یقین تھا کہ جب اس تعصب کے نام پر تلواریں نیام سے باہر آئیں گی، آگ اُگلتی بندوقیں گرجیں گی، گھر جلائے جائیں گے تو ان کی اپنی جان یا ان کا گھر سلامت رہے گا۔ لیکن ایسا کبھی ہوتا نہیں اور نہ ہی تاریخ میں ایسا کبھی ہوا ہے۔ مجھے زیادہ دور کی تاریخ کے حوالے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تو اس دنیا میں وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے نسلی برتری اور قومی تعصب کی خون آشام جنگیں دیکھیں ہیں۔ یورپ پر ایک زمانے میں ایسے ہی "عظیم" دانشوروں کو خبط چڑھا کہ مذہب سے نجات حاصل کی جائے۔ یہ انسانوں کو تقسیم کرتا ہے، لڑاتا ہے، اس کے قوانین انسانی آزادیوں پر قدغن لگاتے ہیں۔ مذہبی پیشوا کون ہوتے ہیں جو ٹھیکیدار بنتے ہیں انسانوں کے۔ قصور چرچ کے "پادریوں کا تھا کہ ان کی روش درست نہ تھی، لیکن گالی مذہب کو دی جانے لگی۔ جیسے میرے ملک کے "بلند پایہ لوگ مولویوں کی غلطیوں کی بنیاد پر اسلام کو بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ کیا اس دنیا میں سارے کے سارے ڈاکٹر بھی بُرے اور نکمے ہو جائیں تو میڈیکل کے علم کو گالی دی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسا صرف مذہب کے ساتھ ہوتا ہے۔ جعلی پیر کو دیکھ کر تصوف کی اعلیٰ اقدار کی نفی کر دو، کوئی مولوی کسی جرم میں پکڑا جائے تو سیدھا اسلام کو بُرا بھلا کہہ دو۔ یہی رویہ یورپ میں اس قدر سرایت کر گیا کہ پھر ایک دن انہوں نے اپنے کاروبارِ زندگی سے مذہب کو خیر آباد کہہ دیا۔ کہا یہ انسانوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس دنیا کو بنانے والا کون ہوتا ہے جو ہمیں بتائے کہ ہم نے زندگی کیسے گذارنا ہے۔ ہم خود اصول وضع کریں گے اور جب چاہیں گے اپنی سہولت کے لئے تبدیل کر لیں گے۔ ہم چاہیں تو مرد اور مرد کی آپس میں شادی کو جائز قرار دے دیں۔ یہ ہماری زندگی ہے ہم بے شک کروڑوں کی تعداد میں ہر سال بغیر شادی کے اولاد حاصل کریں، ہمیں کون روک سکتا ہے۔ آزادی، حریت اور "انسان عظیم ہے خدایا" جیسے اصولوں کی بنیاد پر پورے یورپ میں مذہب کو ریاست کے کاروبار سے طلاق دے دی گئی اور اجتماعی زندگی سے اُسے دیس نکالا مل گیا۔ یہ عمل ٹھیک بیسویں صدی شروع ہونے سے پہلے تک مکمل ہو گیا۔ ان عظیم مفکرین نے کا سانس لیا اور پھر اپنی ایک نئی پہچان کے لئے بنیادیں بنانا شروع کر دیں۔ نسل رنگ اور زبان کے قدیم تعصبات سکھ کی بنیاد پر کتابوں کی کتابیں لکھی گئیں اور زمین سے رشتے جوڑنے کے لئے لاکھوں سال پرانے دفن شدہ انسانوں کے ڈھانچوں سے اپنے ڈانڈے ملائے گئے۔ نسلی تفاخر اور گروہی برتری کو قوموں کے عروج اور انسانوں کی ترقی کی بنیاد بنایا گیا۔ یہ صرف دس گیارہ سال کا عمل تھا کہ 1911ء کے آس پاس پورا یورپ جنگ عظیم اوّل کی آگ میں جھونک دیا گیا۔ وہ آگ جس میں لاکھوں گھر راکھ کا ڈھیر ہوئے اور کروڑوں انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ خاندان اُجڑے، گھر سے بے گھر ہوئے۔ انسانوں نے ابھی تھوڑی دیر کے لئے سُکھ کا سانس لیا تھا، لیکن شاید ابھی اس نسلی برتری اور قومی تعصب کے پودے کو مزید خون چاہیے تھا۔ جرمنی اور اٹلی میں ہٹلر اور میسولینی پیدا ہوئے۔ جن کی دھواں دار تقریریں ہمارے آج کے کسی بھی قوم پرست رہنما سے کم نہ تھیں۔ یہ دونوں ایسے ہی جذبات سے کھیلتے اور لوگوں کو برتری کا احساس بھی دلاتے اور محرومیوں کی یاد بھی۔ ایسے لکھنے والوں کی بھی کمی نہ تھی، جو ان کے افکار و نظریات پر تاریخی حقائق ڈھونڈ کر لاتے۔ چند سالوں میں نسلی تعصب کی گرمی اس قدر بڑھی کہ دنیا نے دوسری جنگ عظیم کا نظارہ کر لیا۔ اس جنگ کی تباہیوں کے گواہ تو آپ کو آج بھی دنیا کے کسی نہ کسی ملک میں بلکہ اکثر ملکوں میں ضرور مل جائیں گے۔ تعصب کے پودے کو اب بہت خون مل چکا تھا۔ اس کی مثال بھی عام پودے کی طرح ہوتی ہے۔ تھوڑا تھوڑا پانی ملتا رہے تو پروان چڑھتا رہتا ہے لیکن زیادہ پانی مل جائے تو جل جاتا ہے۔ چند لاشیں گریں، خون بہے تو نفرت اور تعصب کے پودے کو جلا ملتی ہے لیکن جب آگ اور خون برسنے لگ جائے تو انسان کے اندر بیٹھا قوم پرستی کا یہ خوفناک دیو سہم جاتا ہے۔ روانڈا کے ہوتو اور ٹوٹسی قبیلوں کی دس لاکھ لاشیں تو ابھی کل کی بات ہے۔ گلیوں بازاروں اور گھروں میں لاشوں کے تعفن نے اس نسلی اور قوم پرستی کے بھوت کو یورپ سے یوں نکال باہر کیا کہ اب وہاں کوئی اس بنیاد پر لڑنے کا نام نہیں لیتا۔

جس زمین کو میرا مالک "الارض ل للہ" یہ زمین اللہ کی ہے۔ اور جس مخلوق کو وہ "ال خلق کلھم عیال اللہ"، پوری مخلوق اللہ کا کنبہ بتاتا ہے وہاں ہم کبھی زمین سے تعلق پر مرتے مارتے ہیں اور کبھی نسل کی برتری پر۔ نہ کوئی میرا مورخ یا دانشور یہ بتاتا ہے کہ اس زمین کا کوئی مستقل رہائشی نہیں، سب کے آباؤ اجداد اپنے علاقوں سے بھوک، ننگ، افلاس یا دشمنوں کے خوف سے یہاں آئے تھے۔ آریائی قومیں اپنے علاقوں میں قحط کے خوف سے بھاگ کر یہاں آئیں۔ بابر کا جینا وہاں کے لوگوں نے دوبھر کر دیا تھا، اُس کی بہنیں شیبانی نے یرغمال بنا لیں تھیں۔ ایران، روس، شام، عراق اور چین ہر جگہ سے لوگ اس خطے میں رزق ڈھونڈنے آئے اور آباد ہو گئے۔ کوئی نسلاً اس برصغیر کا نہیں ہے اور دنیا میں کہیں بھی کوئی نسلاً کسی علاقے کا نہیں ہوتا۔ کوئی مورخ نہیں بتاتا کہ یہ سب وسائل کی ہجرت ہے اور وسائل کی جنگ، کوئی اسے دھرتی ماتا کا نام دیتا ہے تو کوئی نسلی برتری کا۔ یہ بیج 63 سال سے بویا جا رہا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس خطے میں سیّد الانبیاء ﷺ کے بتائے گئے اصولوں کی بات نہ ہو۔ اس ملک میں جو تباہی اس رہبر دو عالم ﷺ کے اس اصول پر بنا تھا کہ "نسل، رنگ اور قبیلے کے بُت میرے پاؤں کی ٹھوکر میں ہیں" وہاں اسی فرمان کی روز توہین ہوتی ہے، یہ تناور درخت جسے تھوڑا تھوڑا خون دے کر پالا گیا تھا۔ یا تو اسے خود کاٹ دو، ورنہ اس کے جلانے کے لئے بہت سا خون درکار ہو گا۔ اور شاید ان لوگوں کا خون بھی بہہ جائے جنہوں نے 63 سال اس کی آبیاری کی۔ اس کی پیاس بہت ہے۔ پودا بویا ہے تو اس کی پیاس بھی تمہیں اپنے خون سے بجھانا پڑے گی، تب جا کر چین آئے گا۔

ابھی تو آغاز ہے

جس روز سے اس دنیا کے نقشے پر برصغیر کے مسلمانوں کے لہو سے ایک ایسی لکیر کھینچی گئی ہے جس نے فیصلہ کر دیا کہ کلمۂ طیبہ پڑھنے والا راجپوت ایک جانب اور برہما اور وشنو کو ماننے والا دوسری سمت۔ ایک ہی نسل، ایک ہی رنگ اور ایک ہی زبان بولنے والے خون کا دریا عبور کر کے ایک ایسی مملکت کی بنیاد رکھ رہے تھے، ایک ایسی تقسیم کا اعلان کر رہے تھے جسے میرے اللہ نے تخلیق کائنات کے وقت واضح کیا تھا کہ اس دنیا میں صرف دو گروہ ہیں۔ ایک حزب اللہ یعنی اللہ کا گروہ اور دوسرا حزب الشیاطین یعنی شیاطین کا گروہ۔ اسی روز سے اس انوکھی اور نرالی مملکت پاکستان سے بغض، حسد اور کینہ رکھنے والے، اسے نیست و نابود ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں دنیا کے درجنوں ملک ایسے بے ڈھنگے طریقے سے بنے تھے کہ یقین نہیں آتا تھا ایسا کیوں کیا گیا۔ ایک ہی زبان بولنے والے کرد، جو خلافت عثمانیہ میں اکٹھے تھے، شام، عراق، ترکی اور ایران میں تقسیم ہو گئے۔ صدیوں اکٹھے رہنے والے شام، لبنان، اردن اور تیونس۔ نہ زبان علیحدہ، نہ مذہب علیحدہ اور نہ رنگ و نسل علیحدہ، لیکن تقسیم کر دیئے گئے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ پوری دنیا میں جس ملک کے وجود میں آتے ہی یہ گفتگو شروع ہو گئی تھی کہ یہ ٹوٹ جائے گا، یہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا، یہ بنا ہی غلط بنیاد پر ہے وہ پاکستان ہے۔ اور گفتگو کرنے والے وہ عظیم دانشور، مؤرخ اور مصنف تھے جن کے محدود دماغوں میں یہ بات سما نہیں رہی تھی کہ قومیں تو نسل، رنگ اور زبان سے بنتی ہیں یہ ایک "غیر فطری" طریقہ یعنی مذہب کے نام پر ملک کیسے بن گیا۔ حالانکہ میرا اللہ صرف اسی تقسیم کو فطری قرار دیتا ہے اور تاریخ نے ہر موڑ پر اسے ثابت کیا ہے۔ آج دنیا کے کسی بھی مہذب اور ترقی یافتہ ملک میں چلے جائیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد نہ آپ کی عرب پہچان ہے نہ ایرانی، نہ پاکستانی اور نہ افغانی آپ ان کے نزدیک صرف اور صرف مسلمان ہیں۔ وہ آپ کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مثلاً دہشت گرد مسلمان، رجعت پسند مذہبی مسلمان، ماڈریٹ مسلمان اور اگر آپ ان کی تہذیب میں رچ بس گئے ہیں، ان کے رنگ ڈھنگ اختیار کر لئے ہیں تو امریکی یا یورپی مسلمان۔ گذشتہ دس سالوں میں جتنی بھی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں، رینڈ کارپوریشن، بروکنگ انسٹی ٹیوٹ یا کسی بڑے تھنک ٹینک نے جتنے سروے یا رپورٹ مرتب کیں سب کی سب اسی دو قومی نظریے کی تقسیم پر ہیں۔ ایک قوم مسلمان اور دوسری قوم باقی دنیا۔ فلپائن کا عیسائی ہو، اسرائیل کا یہودی، چین کا لامذہب یا بھارت کا ہندو، سب کے سب ایک قوم ہیں "مہذب"، ترقی کی دلدادہ اور دوسری جانب مسلمان۔ آج سے پچاس سال پہلے تک چونکہ مسلمانوں کو تقسیم کرنا مقصود تھا اسی لئے ساری تحقیق رنگ، نسل اور قبیلے کے نام پر کی جاتی تھی۔ یہ بابل کی سرزمین کے عراقی ہیں، یہ نیل کے ساحل والے فرعون کی اولاد، سائرسِ اعظم کی نسل ایرانی اور سندھ کی تہذیب کے امین ہندوستان والے۔ پوری دنیا میں ان بنیادوں پر قومیت کا اتنا چرچا تھا کہ وہ جو کیمونزم کو پوری انسانیت کا نظریہ سمجھتے تھے انہوں نے بھی ستر سال اپنی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں اسی بات پر تحقیق کی اور کہا کہ کیمونزم کا راستہ نیشنلزم سے ہو کر جاتا ہے۔

استعماری قوم کا لفظ تخلیق کیا گیا۔ اور سب سے پہلے اسے پاکستان کے نظریے کی نفی کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ انسانوں کی غربت یا سرمایہ داری کی بات نہ کی گئی بلکہ کہا گیا کہ فلاں قوم نے تمہارے حقوق غصب کیے ہیں۔ خواہ اس قوم کے ننانوے فیصد لوگ غربت و افلاس کی چکی میں ہی کیوں نہ پس رہے ہوں، وہ ظالم، حقوق غصب کرنے والی اور استعماری قوم بنا دی گئی۔ پھر جو گالی چاہے اُسے دے دو، جہاں چاہے مار دو، اور اگر ایک دفعہ نسل کی بنیاد پر تعصب شروع ہو جائے تو ہٹلر کی جنگ عظیم کی طرح چھ کروڑ جانیں لے کر ہی ختم ہوتا ہے۔

اس مملکت خداداد پاکستان سے نفرت کا ایک اور اظہار یوں کیا جاتا تھا کہ یہ تو معاشی بنیادوں پر بنا تھا، مسلمان پس رہے تھے، قائداعظم تو سیکولر تھے، انگریزی لباس پہنتے تھے۔ جس شخص کے نظریے کی بنیاد پر لاکھوں لوگ شہید ہو جائیں، مذہب کی بنیاد پر تقسیم ہو جائیں، ایک ملک پوری دنیا سے انوکھا تخلیق ہو جائے، اسے پینٹ کوٹ پہننے پر سیکولر بنا دیا گیا۔ اس طرح تو انگلینڈ میں مسلمان ہونے والے ایک لاکھ گورے سارے کے سارے سیکولر ہو گئے۔ اگر معاشی بنیاد پر تقسیم ہوتی تو کروڑوں شودر صدیوں سے ذلت و رسوائی اور بدترین انسانی سلوک کے ساتھ زندہ تھے، ان کا ملک پہلے بن جاتا۔ پھر کہا جاتا ہے قائداعظم تو کیبنٹ مشن مان کر متحدہ ہندوستان میں رہنا چاہتے تھے۔ انہیں اندازہ نہیں کہ یہ میرے اللہ کا کرم تھا قائداعظم پر کہ انہیں توفیق دی گئی، ورنہ اس ملک کی تخلیق کا فیصلہ تو آسمانوں پر ہو چکا تھا۔ جس کی سب سے پہلی بشارت عاشق رسول ﷺ علامہ اقبال نے خطبۂ الہ آباد میں دی تھی۔ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ملک بنانے کے لئے تحریک چلاؤ بلکہ ایک روحانی پیشین گوئی کی تھی کہ وہ علاقے جو ہندوستان میں ایک ساتھ ملحق ہیں اور جہاں مسلمان اکثریت سے ہیں ایک آزاد اسلامی ملک ان کا مقدر ہے۔ اس بشارت کے بعد ایک اور فقرہ کہا تھا کہ یہ ملک وسطی ایشیا کی محکوم ریاستوں کی آزادی کا باعث بنے گا۔ تاریخ نے یہ پیشین گوئی ثابت کی۔ اسی ملک نے روس سے جنگ کی، عظیم طاقت ٹوٹی اور مسلمانوں کی چھ ریاستیں آزاد ہوئیں۔ تاریخ اُٹھا کر دیکھیں اس ملک کو جس نے بھی گزند پہنچانے کی کوشش کی اُس کا انجام میرے اللہ نے کیسے کیا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں تین لوگوں کا حصہ تھا۔ ان تینوں افراد کے خاندانوں تک کا انجام سب کے سامنے ہے۔ لیکن پھر بھی یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس کے دانشور، مؤرخ، یہاں تک کہ سیاستدان روز یہ راگ الاپتے ہیں، یہ ملک نہیں بچ سکتا، ہمارے ساتھ ایسا کیا گیا تو یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ انہیں اندازہ نہیں کہ اس پوری دنیا میں اس ملک کا وجود اللہ کی غیرت و حمیت سے وابستہ ہے۔ یہ وہ خطہ ہے کہ جب اس کی تخلیق کا عمل شروع ہوا تھا تو اس علاقے کے تمام صاحبانِ نظر اور صوفیائے کرام اس تحریک کا ہراول دستہ تھے۔ ایک اور بات کی جاتی ہے کہ اگر یہ اللہ یا اسلام کے نام پر بنا تھا تو علماء اس کے مخالف کیوں تھے۔ کیا احمقانہ بات ہے۔ اس ملک میں اکثریت بریلوی مکتبہ فکر کی ہے، سارے کے سارے بریلوی علماء اور مشائخ قائداعظم کے ساتھ تھے، اہل حدیث ساتھ تھے، دیوبند سے شبیر احمد عثمانی اور ظفر اللہ انصاری ساتھ تھے۔ اگر یہ سب نہ بھی ہوتے تو مسلمان ساتھ تھے سب کے سب سوائے چند دانشور اور مفکرین کے جو آج بھی اُٹھتے بیٹھتے سوچتے ہیں کہ ملک کب ٹوٹے گا۔ بھارت کے پنڈتوں نے کہا تھا کہ یہ ملک ستاروں کی گردش میں ہے اور اس کی وینس کی دشا 60 سال کے اندر اسے ختم کر دے گی۔ ساٹھ سال گذر گئے۔ اب بھارت کے کسی جوتشی کی کتاب یا رسالہ اُٹھائیں، ان پر ایک خوف طاری ہے۔ وہ پیشین گوئیاں کرتے پھرتے ہیں ایک یہ کہ 2011 کے آخر میں پاکستان کا ایک طاقتور دور شروع ہو گا اور بھارت کا زوال یہاں تک کہ 2013 میں پاکستان بھارت پر کامیاب حملہ کر دے گا۔ میں جوتش پر تو یقین نہیں رکھتا لیکن وہ جو جہانِ حیرت کے شناسا ہیں بتاتے ہیں کہ قضا و قدر کے فیصلے اپنی علامتوں سے نظر آ رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے اس مملکت خداداد پاکستان پر صفائی کا موسم آ چکا ہے۔ یہ موسم ہر قوم پر اُس وقت آتا ہے جب حالات بدلنے والے ہوتے ہیں۔ وہ جنہیں اس مملکت کے وجود، اُس کے انوکھے نظریاتی پن سے نفرت ہے انہوں نے اب منظر سے ہٹنا ہے۔ قوم جو اللہ سے رجوع نہیں کرتی تھی، ایسے عذاب میں مبتلا ہو گی کہ ہر کوئی پکار پکار کر اللہ کی مدد کا طالب ہو جاتا ہے۔ اب ایسا ہی ہو گا، ہر کوئی اُس کی نصرت چاہے گا، اُس سے گناہوں کی معافی طلب کرے گا اور میرا رحمٰن و رحیم تو معاف کرنے والا ہے۔ ایسے میں لوگوں کو وہ سب کچھ عطا ہو جاتا ہے جس کی وہ خواہش کریں، لیڈر بھی، امن و سکون بھی اور خوشحالی بھی، ابھی تو معاملہ شروع ہوا ہے۔ آپریشن کے آغاز ہی میں مریض کے مرنے کی باتیں کرنے والوں کو مایوسی ہو گی۔

پاکستان۔ آئندہ دنوں کا دارِ ارقم اور مدینہ

جب ساری زمین اللہ تبارک و تعالٰی کی ہے اور وہ اس کا تنہا مالک اور مختارِ کل ہے۔ انسان پر اگر ایک جگہ رزق تنگ ہو جائے تو اللہ کہتا ہے کہ نکلو کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں ہے۔ وہ پوری مخلوق کو اپنا کنبہ قرار دیتا ہے۔ اپنے لئے "سب جہانوں کا پالنے والا" کا خطاب پسند کرتا ہے اور جس رسول ﷺ کی ہم پیروی کرتے ہیں اسے تمام جہانوں کے لئے رحمت کا خطاب عطا کرتا ہے۔ جس رسول ﷺ کی دعوت کے ہم سب قائل ہیں وہ تو قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے ہے۔ پھر تم پاکستان کو ایک خاص اہمیت کیوں دیتے ہو، اس سرزمین کا احترام کیوں کرتے ہو، اس سے تمہارا جذباتی لگاؤ کیوں ہے۔ تمہارے آباؤاجداد نے تو ایک علاقہ، ایک جگہ یا ایک قبیلے سے کبھی اتنا گہرا لگاؤ نہیں رکھا تھا۔ وہ تو اللہ کے دین کا پرچم لے کر ملکوں ملکوں پھیل گئے۔ جہاں ان سے لوگوں نے جنگ کی وہ اپنی جان ہاتھوں پر لیکر میدان میں آ نکلے۔ ایران اور روم کی عظیم الشان سلطنتوں کو روند ڈالا۔ جہاں امن و آشتی سے رہنے کا موقع مل گیا وہاں ایسے آباد ہوئے کہ لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ ملائشیا اور انڈونیشیا کے ساحلوں پر اترنے والے مسلمان صرف چند تھے لیکن آج انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ نہ تلوار نیام سے برآمد ہوئی اور نہ فتح و نصرت کے پرچم لہرائے گئے۔ اللہ تو کسی سرزمین اور علاقے تک نہ انسان کو محدود کرتا ہے، نہ اپنے دین کو اور نہ اپنے رسول ﷺ کی رحمت کو۔ رنگ، نسل، علاقہ اور قبائل کا تعصب تو وہ ہے جس کے بارے میں اپنے آخری خطبے کے دوران رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ آج رنگ، نسل اور عصبیت کے تمام بُت میرے پاؤں کی ٹھوکر پر ہیں۔ زمین، علاقہ اور نسل کی عصبیت تو وہ تصور ہے جس کی بنیاد پر اس دنیا کو تقسیم کیا گیا۔ یہی عصبیت اور علاقائی تعصب تھا کہ یورپ نے دو عالمی جنگیں لڑیں، کروڑوں لوگوں کا خون کیا۔ دنیا کا کوئی جھگڑا یا فساد اٹھا لیں وہ کسی خطۂ زمین کے بارے میں ہو گا۔ کوئی فاک لینڈ پر لڑ رہا ہے تو کوئی تبت کے علاقے پر۔ کسی کا جھگڑا شط العرب پر ہے تو کوئی دارفور اور مشرقی تیمور کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ گذشتہ دو صدیوں کی جنگیں ایک خاص تصور پر مبنی جھگڑے پر ہوئیں جسے عرفِ عام میں "متنازعہ علاقہ" کہتے ہیں۔ کشمیر ہے، فلسطین ہے، چیچنیا ہے یا بوسنیا۔ اگر یہ سب کے سب تصورِ وطنیت کی وجہ سے لڑ جھگڑ رہے ہیں تو پھر پاکستان بھی تو اسی طرح ایک علاقہ، ایک قوم ہے اور ایک ملک ہے۔ تم اس سے محبت کیوں کرتے ہو، اسی سے جذباتی لگاؤ کیوں رکھتے ہو۔ یہ سوال صرف مجھ سے نہیں کئے جاتے بلکہ ایسے سوالوں کی بوچھاڑ مدتوں ہر اس پر جاری رہی جو مسلم اُمہ کی بات بھی کرتا ہو اور پاکستان سے بھی محبت رکھتا ہو۔ خود علامہ اقبال جب نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر مسلمانوں کو متحد ہونے کا درس دیتے تھے تو اس وقت جب انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ ملک کا تصور پیش کیا تو ان پر سوالات کی بارش ہو گئی۔

یہ ملک پاکستان کیا ہے۔ اس کی حیثیت اور مقام کیسا ہے۔ اس کے ساتھ صدیوں سے کون کون سی بشارتیں وابستہ ہیں۔ اس کی حیثیت اور مرتبہ صاحبانِ نظر کے دلوں میں کیسا ہے اور میرے اللہ کو یہ ملک اپنی تمام تر ناکامیوں، خرابیوں اور گناہوں کے باوجود بھی کیوں عزیز ہے۔ اگر میں بشارتوں اور عقیدتوں کے اس طویل سلسلے کو آج کی بے رحم دنیا تک لے کر آؤں تو مجھے یہ مملکت خداداد پاکستان آئندہ آنے والے دنوں کا "دارِ ارقم" نظر آتا ہے۔ دارِ ارقم صفا کی پہاڑیوں کے نزدیک وہ گھر تھا جہاں رسول اللہ ﷺ کی ابتدائی دعوت کے زمانے میں مکہ کے ظالم معاشرے سے ڈرے ڈرے سہمے مسلمان جمع ہوئے تھے۔ گرم ریت پر جھُلسے ہوئے بدن والے حضرت بلالؓ سے لے کر اپنے والدین حضرت یاسر اور حضرت سمیہ کی المناک اور دردناک شہادت کا دکھ سمیٹے ہوئے حضرت عمار بن یاسرؓ تک۔ قبیلے کے خوف سے چھپتے چھپاتے حضرت ابوذر غفاریؓ۔ باپ کے تشدد سے رنجیدہ حضرت عثمانؓ۔ یہ سب کے سب ایک نئے مستقبل کی نوید بننے والے تھے۔ ایک ایسی دعوت کی بشارت تھے جسے دنیا کے کونے کونے میں پھیلنا تھا۔ اس وقت شاید ہی کسی کو یقین تھا کہ نسل، رنگ، عقیدے اور علاقے کے بُت کو توڑ کر ایک جگہ جمع ہونے والے یہ مٹھی بھر لوگ جن میں بلال جیسا غلام سیّدنا بلالؓ کہلواتا ہے، یہ لوگ دنیا بھر پر چھانے والے ہیں۔

پاکستان بھی گذشتہ صدی بلکہ گذشتہ دو صدیوں کا وہ حیران کن معجزہ ہے جس نے دنیا کے نسل، رنگ، علاقہ اور قوم کے عقیدے کو اپنے پاؤں تلے روندا ہے۔ پوری دنیا کو جب ان بنیادوں پر تقسیم کیا جا رہا تھا، پچاس ملکوں سے دو سو ملک بن رہے تھے تو کوئی کہتا میں جرمن ہوں تو کوئی ترک، کوئی عرب تو کوئی ایرانی، لیکن ایسے میں صرف ایک ملک ایسا تھا جس کے رہنے والے نے ایک نعرہ بلند کیا تھا کہ ہمیں ان سب سے الگ کر دو۔ اس لئے کہ ہم ان سب سے مختلف ہیں کیونکہ ہم اللہ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں۔ مدتوں سے صاحبانِ نظر یہ پیش گوئیاں کر رہے تھے کہ اس خطے کو چن لیا گیا ہے کہ جب سب اپنے اپنے ملکوں کے باہر اپنے رنگ، نسل اور زبان کی تختی لگائیں گے، اس خطے کے لوگ اپنے ملک کے دروازے پر اللہ کے نام کی تختی لگائیں گے۔ اس نام کی تختی لگانے کی دیر تھی کہ آزمائشوں اور امتحانوں کا دور شروع ہوا۔ اس قوم نے لاکھوں شہداء کی قربانی اس سرزمین کی سرحدوں پر دی۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس نعرے اور دعوے کی وجہ سے شہید ہوئے کہ ہم اپنے بھائیوں، رشتے داروں اور قبیلے کے لوگوں کو اس لئے چھوڑتے ہیں کہ وہ تجھے واحد مالک و مختار نہیں مانتے۔ اللہ کے نزدیک اس سرزمین پر اور اس سرزمین کی حرمت پر بہنے والے اس خون کی بڑی تکریم ہے۔ وہ تو اپنے راستے میں نکلنے والے گھوڑوں کے سُموں تک کی قسم اُٹھاتا ہے۔ اس لئے جو لوگ اس مملکت خداداد پاکستان میں رہتے ہوئے اس کا مذاق اُڑاتے ہیں وہ اللہ کے رمز آشنا صاحبانِ نظر کی نگاہوں میں وہی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو مشرکین مکہ رکھتے تھے۔ پاکستان کی ایک اور صفت جو میرے اللہ کو بہت عزیز ہے وہ مسلمانوں کے لئے ایک جائے امان کا ہونا ہے۔ اللہ کو جہاں ہجرت کرنے والے پسند ہیں وہیں ان کے لئے جائے امان بننے والے مدینہ کے لوگ بھی محبوب ہیں۔ یوں پاکستان دارِ ارقم بھی ہے اور زخم خوردہ اور ہجرت زدہ مسلمانانِ عالم کے لئے مدینہ بھی۔ آپ اس دنیا کے نقشے پر دیکھیں۔ 50 سے زیادہ ملک ہیں جو مسلمانوں کے ہیں۔ لیکن اسلام کے نام پر نہیں عراقیوں، شامیوں اور عربوں کے نام پر بنے۔ سعودی عرب تیل کی دولت سے مالامال ہے لیکن شاید ہی دنیا کا کوئی ہجرت زدہ مسلمان وہاں پناہ لے سکے۔ ایران خود کو اسلامی جمہوریہ کہلاتا ہے لیکن شاید ہی کسی دوسرے ملک کے مسلمان کو ایران میں مستقل رہائش کی اجازت مل سکے۔ پاکستان اپنے وجود میں آنے سے لے کر آج تک اپنے دروازے خانماں برباد مسلمانوں کے لئے کھولے ہوئے ہے۔ بھارت سے آئیں، بنگال سے آئیں، بہاری آئیں، برما سے آئیں، افغانستان سے تیس لاکھ آئیں، جن پر ان کی ظالم حکومتیں زندگی تنگ کر دیں وہ اس ملک میں پناہ لے سکتے ہیں۔ اور یہاں کے لوگ اپنے دروازے اُن کے لئے وا کر دیتے ہیں۔ اس ملک کے عوام کی یہ خصوصیت ہے جو اللہ کو بہت عزیز ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں صرف اس لئے لوگ ہجرت کرنے کے لئے نہیں جاتے کہ وہ مسلمان ملک ہے اور ہمارے لئے جائے پناہ ہے۔ سب جگہ لاکھوں لوگ جاتے ہیں لیکن نوکری کی تلاش میں، رزق کی سرگردانی میں۔

یہی وہ خصوصیات ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس ملک پر ہمیشہ اپنا دستِ رحمت رکھا۔ جس ملک میں چپڑاسی سے صدر تک بددیانتی کے سمندر میں ڈوبے ہوں، وہ عالمی نقشے پر ایک ایٹمی طاقت کے طور پر اُبھرے جس کی ٹیکنالوجی کے دروازے ہی اُس پر بند ہوں۔ لوگ سوال کرتے ہیں، ایسا کیوں ہے۔ کھانے کو روٹی نہیں اور بم بنائے جا رہے ہیں۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس دارِ ارقم اور مدینہ کی خاصیت رکھنے والے ملک کو اللہ نے بدر کے میدان میں اتارنا ہے۔ نصرت کے پرچم اسی سرزمین سے بلند ہونے ہیں۔ بشارتوں کی یہی زمین ہے جہاں سے میرِ عرب کو ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔ یہیں سے وہ انقلاب کا پرچم بلند ہونا ہے جس سے مسلم اُمہ کے سینے پر بنی سرحدوں نے ٹوٹنا ہے اور درویش صوفی برکت علی جو صوفیاء کی صدیوں پرانی بشارتوں کو اپنے اس فقرے میں جمع کر گئے کہ وہ دن دور نہیں جب پاکستان کی [illegible] میں اقوامِ عالم کے فیصلے ہوا کریں گے۔

عذاب کو قریب کرتے لوگ

ہو سکتا ہے انسانی حقوق کے علمبردار، روشن خیال دانشور، سول سوسائٹی کے تہذیب یافتہ لوگ اور میرے ملک کے باشعور صحافی اسے ایک دقیانوس، فرسودہ خیال اور ماضی میں زندہ رہنے والے ایک دیوانے کا خوف سمجھیں، لیکن 24 جون 2011ء سے لے کر آج تک میں ایک لرزا دینے والے ڈر میں مبتلا ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ بحیثیت قوم ہم گناہوں میں لتھڑے ہوئے تھے، بددیانت تھے، نااہل اور ناکارہ تھے، لیکن اس سب کے باوجود ہم اپنی غلطیوں اور اپنے گناہوں پر فخر نہیں کرتے تھے۔ ہم ان کا برملا اظہار کرنے سے کتراتے تھے۔ ہم میں سے جو کوئی کسی ایسے عیب میں مبتلا ہوتا تھا تو اُس کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اُس کا راز کسی پر نہ کھلے۔ اگر کوئی شخص اس معاملے میں شرم وحیاء کو بالائے طاق رکھ دیتا تھا تو معاشرہ اُس سے نفرت ضرور کرتا تھا۔ اپنی اولاد کو اُس کی صحبت سے دُور رہنے کے لئے ضرور کہا جاتا تھا۔ یوں تو اپنے عیبوں پر فخر کرنے کی اکاذکا مثالیں گذشتہ دس سالوں کے روشن خیال دور میں ملنا شروع ہو گئیں تھیں جب لوگوں نے میڈیا کی آزادی کا سہارا لیتے ہوئے یا پھر انٹرنیٹ پر اپنے جذباتی معاملات کا اظہار کرتے ہوئے گفتگو شروع کر دی تھی۔ ان سب نے گناہ پر گفتگو کے لئے ایک بڑا خوبصورت لفظ ایجاد کیا تھا۔ یوں تو یہ لفظ سوشیالوجی یعنی معاشریات کے علم کا لفظ ہے لیکن اُسے آج کے مہذب دور میں معاشرے کی ناروا پابندیوں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ ہے Taboo (ٹیبو) ہے۔ یعنی اگر بھائی بہن، باپ بیٹی، خالہ بھانجا یا چچا بھتیجی آپس میں تعلقات استوار کر لیں تو اسے صدیوں کی معاشرتی پابندی اور جبر کی صورت قرار دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ آزادیٔ رائے کے تقاضے یہ ہیں کہ اس معاملے پر کھل کر بحث کی جائے اور وجوہات تلاش کی جائیں کہ یہ رشتوں کا احترام کیوں، کیسے اور کس نے انسانوں پر مسلط کیا ہے۔ اسی طرح ہم جنس پرستی کو بھی اسی لفظ ٹیبو کے زمرے میں لاکر بحث کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ تاریخ کی عظیم شخصیتوں کے نام لئے جاتے ہیں، شاعروں کی شاعری اور افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس موضوع پر آزادیٔ اظہار اور انسانی حقوق کے نام پر مغرب میں بحث تو کئی سالوں سے چل رہی ہے۔ 1924ء میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوا تو اسی سال نیویارک کے شہر میں ہم جنس پرستوں کے حقوق کے لئے پہلی تنظیم وجود میں آئی۔ اُسی سال مشہور ہم جنس پرست ہنگامے اور لاٹھی چارج ہوا۔ یہ جون کا مہینہ تھا۔ اُس دن سے لے کر آج تک جون کے آخری ہفتے میں "گے پرائڈ" یعنی ہم جنس پرستی کے فخر کے نام پر دن منایا جاتا ہے۔ 1996ء میں اسی دن میں امریکہ کے ہم جنس پرستی کے حوالے سے سب سے بدنام شہر سان فرانسسکو میں تھا۔ پورے شہر میں ہم جنس پرستی کی علامت قوسِ قزح والے سات رنگوں کے جھنڈے لہرا رہے تھے اور گولڈن گیٹ برج سے لے کر شہر کی سڑکوں پر ہزاروں لوگ اس پریڈ میں شریک تھے۔ بحث کا یہ عالم تھا کہ ٹیکساس کے مشہور پادری سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو تازہ تحقیق کی مثالیں دے کر ثابت کر رہا تھا کہ ہم جنس پرستی تو اب ایک پیدائشی رجحان ہے جو آدمی کو جینز کی صورت ورثے میں ملتا ہے۔ اُس زمانے سے اس شہر کا ڈپٹی میئر ایک ہم جنس پرست تھا جو کانوں میں بالی اور ہونٹوں پر بے رنگ لپ سٹک لگا کر ہمارے ساتھ میٹنگ میں شریک ہوا تھا۔ ایک عام تاثر پورے شہر میں یہ تھا کہ یہ ہم جنس پرست لوگ کسی کو تنگ نہیں کرتے، اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ٹھیک پندرہ سال بعد گزشتہ دنوں امریکی صدر نے جون کے مہینے کو ہم جنس پرستوں کے حقوق کا مہینہ قرار دے دیا اور امریکہ کے پڑوس کینیڈا میں اس سال ہم جنس پرستوں کی ٹورنٹو شہر میں ہونے والی پریڈ میں دس لاکھ لوگ شریک ہوئے۔

امریکی صدر باراک اوبامہ کے اس اعلان کے بعد 26 جون 2011 کو پاکستان کے شہر اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے نے ہم جنس پرستوں کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی جس میں اس مملکت خداداد پاکستان کے 75 افراد نے شرکت کی۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے قائم مقام امریکی سفیر رچرڈ ہوگ لینڈ نے کہا کہ امریکہ دنیا بھر میں ہم جنس پرستوں کے حقوق کی حمایت کرتا ہے۔ یہ خبر اخبار کی زینت تو بہت کم بنی لیکن امریکی سفارت خانے کی ویب سائٹ پر آنے کے بعد بالکل ویسی ہی بحث کا آغاز ہو گیا جیسی 1921 میں امریکہ میں شروع ہوئی تھی۔ بلاگ بننے شروع ہوئے۔ ایک شخص نوازش نے لکھا کہ "یہ میرا اپنا جسم ہے، میں اسے جیسے چاہوں استعمال کروں، ریاست اور گلی کے عام مولوی ہمارے بستروں سے دور رہیں" ایکسپریس ٹریبون کے بلاگ پر ایک نوجوان علی نے لکھا کہ اے مروجہ اصولوں کے مطابق زندگی گذارنے والے لوگو! سوچو! کیوں ایک شخص ہم جنس پرستی کی راہ اختیار کرتا جبکہ اس راہ میں ظلم وتشدد ہے، معاشرتی پابندیاں ہیں، بدنامی ہے لیکن پھر بھی وہ اس طرف مائل ہوتا ہے۔ ایک اور نوجوان نے کہا کہ مجھ پر کتنی سخت پابندی ہے، میرے گھر والے مجھے خونخوار مرد دیکھنا چاہتے ہیں مگر میں نہیں بننا چاہتا۔ میں اپنے جنسی تعلقات چھپاتا ہوں، ظالم معاشرے کے ڈر اور خوف سے۔ امریکی سفارت خانے کی اس تقریب سے ایک ماہ قبل نتھیا گلی میں ایک این جی او "راتیں سب کے لئے NightsforAll" سے پورے پاکستان سے جسم فروش عورتوں اور ہم جنس پرستوں کو جمع کر کے ایک تربیتی ورکشاپ کروائی گئی۔ اس ورکشاپ میں سب کو اپنے اپنے تجربات بیان کرنے اور اپنی اپنی کہانیاں سنانے کے لئے کہا گیا تاکہ جو سب کچھ وہ معاشرے کی ناروا پابندیوں کی وجہ سے چھپاتے ہیں کھل کر بیان کر سکیں۔

میرا اللہ یہ حکم دیتا ہے کہ اپنے گناہ کو دوسروں کے سامنے بیان کر کے اپنے خلاف گواہ مت پیدا کرو۔ گناہ جب تک بندے اور اللہ کے درمیان رہتا ہے تو توبہ کی قبولیت کے قریب ہوتا ہے۔ لیکن گواہ بناؤ گے تو پھر مقدمہ درج ہو گیا اور سزا لازم۔ تہذیبوں کے بگڑنے اور تباہ ہونے کی داستانیں پڑھیں تو تاریخ ہر موڑ پر رُک کر بتاتی ہے کہ فلاں معاشرہ اس وجہ سے ملیامیٹ ہو گیا کہ وہاں لوگوں نے گناہوں پر فخر اور ان کا برملا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ہم اپنے بددیانت، کرپٹ اور نااہل لوگوں کا دفاع تو مدت سے کر رہے تھے۔ ایسے لوگوں کو بار بار منتخب بھی کرتے رہے جو فخر سے کہتے تھے کہ کرپشن میں سب کی برابر باری آنی چاہیے۔ لیکن شاید ہم نے اپنی تباہی اور بربادی کے پروانے پر دستخط کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ پورا معاشرہ خاموش ہے۔ نہ کوئی برائی سے روکتا ہے اور نہ ہی نیکی کی تلقین کرتا ہے۔ ایسے میں جس عذاب کی چاپ دیر سے سنائی دے رہی ہے اُس کی ایک جھلک بھی اگر لوگوں کو دکھائی دے جائے تو گڑ گڑا کر معافی مانگنے لگیں اور قوم کے عذاب کا فیصلہ اسی دنیا میں کر دیا جاتا ہے تاکہ اللہ کی زمین پاک صاف رہے۔ لیکن شاید ہم نے اللہ کے غضب کو آواز دینے اور بار بار دینے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ اب جو اس قوم کی مرضی۔ موت اور عذاب تو سب پر بیک وقت آئے گا لیکن انجام علیحدہ علیحدہ۔ اللہ سے ڈرنے والوں کا اور ہے اور اللہ کو آنکھیں دکھانے، اُس کے اصولوں کا تمسخر اڑانے والوں کا اور۔

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش

میرے سامنے بھارت کے سب سے متعصب اخبار "دی ہندو" کا 28 جون 2011ء کا شمارہ ہے اور میں اُس کے اہم ترین صفحے پر چھپنے والے تجزیاتی مضمون کے اوپر دی گئی اُس تلخیص کو پڑھ کر حیرت میں گم ہوں۔ مضمون بھارت کے مشہور تجزیہ نگار اور پاکستان خصوصاً مسلمان دشمنی کے لئے نام کمانے والے ایم کے بھدر کمار نے لکھا ہے۔ مضمون کا خلاصہ جو ان چند سطروں میں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ باراک اوباما نے افغان پالیسی میں اس موجودہ تبدیلی اور افواج کی واپسی کے لئے بھارت سے مشورہ کیا ہوگا۔ اس لئے بھارت کو فوراً طالبان سے مذاکرات شروع کرنے چاہئیں تاکہ پاکستانیوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ افغانستان کے بارے میں ہمارے کیا ارادے ہیں" ایک متعصب ہندو اخبار کا متعصب تجزیہ نگار اپنے ملکی مفاد کے لئے ان طالبان سے مذاکرات کی حمایت کر رہا ہے جسے وہ مدت سے دہشت گرد اور انسانیت کے دشمن گردانتا تھا۔ جو یہ تجزیے دیا کرتے تھے کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت کی وجہ سے کشمیر میں دخل اندازی بڑھی ہے، جہاد میں اضافہ ہوا ہے، بھارتی سیکورٹی فورسز پر حملوں میں تیزی آئی ہے اور اموات کی شرح بڑھ گئی ہے۔

جس ملک کے وزیراعظم واجپائی نے امریکی حملے کے بعد 15 اگست 2002ء کو لال قلعہ دلی سے تقریر کرتے ہوئے پاکستان کو مخاطب کر کے کہا تھا "تم کو بڑا فخر تھا کہ طالبان ہمارے ساتھ ہیں۔ آج کہاں ہیں تمہارے طالبان" جنہوں نے مدتوں طالبان کی حکومت کے خلاف شمالی اتحاد کے گروہوں کی امداد کی اور امریکی حملے کے بعد امریکہ کی پٹھو حکومت کے دور میں وہاں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کی۔ ہر محاذ پر طالبان کو دہشت گرد کہا۔ آج انہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ اس خطے کی صورت بدل چکی ہے۔ جس سرزمین پر گذشتہ ایک سو سال میں دنیا کی تین بڑی طاقتیں ذلت آمیز شکست کھا کر رسوائی کے ساتھ نکلیں، وہاں عام تجزیہ نگاروں کی نظر میں تو شاید جن بھوتوں کا بسیرا ہو گا لیکن جو لوگ اللہ کی کبریائی پر یقین رکھتے ہیں اور جنہیں اللہ کے اس دعوے کے پورا ہونے پر پختہ ایمان ہے کہ اگر تم صرف مجھ پر بھروسہ کرو گے تو میں تمہاری تھوڑی تعداد کو بڑے گروہوں پر غلبہ عطا کروں گا۔ ان کیلئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ مسلمانوں کو اب اس دعوے کے ثبوت کے لئے بدر، اُحد، خندق اور قادسیہ کی مثالیں دے کر سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ صرف اتنا کہنے کی ضرورت ہے کہ یہ تو تمہارے سامنے کی بات ہے۔ دنیا کے 48 ممالک کی افواج، نہ کوئی مددگار، پڑوس کے مسلمان بھائی بھی بے غیرتوں کی طرح دشمن کے ساتھی۔ ایسے میں کون تھا جس نے بے یار و مددگار طالبان کو یہ نصرت بخشی کہ امریکہ وہاں سے آسانی کے ساتھ کم سے کم جانی نقصان کی ضمانت کے لئے "بدنام دہشت گرد" طالبان سے مذاکرات کر رہا ہے۔ کتنا مضحکہ خیز امریکی صدر کا بیان ہے کہ طالبان تو افغان قوم کا حصہ ہیں اور امریکہ کو ان کی وجہ سے "ہوم لینڈ سیکورٹی" کا کوئی خطرہ نہیں۔ طالبان کے نمائندوں کے سامنے جب امریکی افواج کے جانے کا یہ شیڈول رکھا گیا کہ دسمبر 2011ء تک دس ہزار، جون 2012ء تک مزید 33000 اور 2013 اور 2014 تک تمام امریکی افواج افغانستان سے چلی جائیں گی۔ اس شیڈول کے جواب میں طالبان کا جواب وہی تھا جو کسی بھی اللہ کی بڑائی اور طاقت پر ایمان رکھنے والے مسلمان کا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا "افغانستان کے مسئلے کا واحد حل امریکی اور دیگر افواج کی افغانستان کی سرزمین سے فوری واپسی ہے۔ ایسا نہ ہوا تو ہماری مسلح جدوجہد میں روز بروز اضافہ ہو گا" یہ وہ خوف ہے جس کے تحت "دی ہندو" اخبار کے تجزیہ نگار نے کہا ہے کہ بھارت کو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ پاکستان کی افغانستان میں دلچسپی ضروری امر ہے، لیکن طالبان سے مذاکرات کے ذریعے یہ تاثر دینا چاہیے کہ دونوں ملک مل کر افغانستان کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ بھارت جس نے افغان طالبان کے خلاف پوری زور آزمائی کی 'شمالی اتحاد کی مدد کے لئے تاجکستان کے شہر فارخور میں اپنا ائیر بیس بنایا ہے۔ جہاں سے وہ انہیں فوجی اور مالی امداد مہیا کرتا رہا ہے لیکن آج اس ذلت آمیز صورت حال میں اُس کے سامنے ایک بہت بڑا سوال یہ ہے کیا وہ غیرت و حمیت سے آراستہ مسلمان طالبان کو یا پھر مستقبل میں بننے والی کسی بھی افغان حکومت کو مالی اور فوجی امداد کے ذریعے پاکستان کے خلاف کھڑا کر سکتا ہے یا نہیں۔ دنیا بھر کے دفاعی تجزیہ نگار اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ یہ تو پاکستان کا "دوست" امریکہ تھا جس نے افغانستان کو پاکستان کے خلاف سرگرمیوں کا مرکز بننے دیا۔

شکست سامنے ہو، اربوں ڈالر ڈوب رہے ہوں، وہ امریکہ جس پر اس خطے میں بھارت اور میرے ملک کا روشن خیال طبقہ تکیہ کئے بیٹھا تھا بھاگ رہا ہو، تو بزدلوں اور دوسروں کی طاقت کے بل بوتے اور شہ پر اکڑنے والوں کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ آپ میرے ملک کے میڈیا کے ان "عظیم" تجزیہ نگاروں اور دانشوروں کے بدلتے لہجوں پر غور کریں۔ جب دنیا طالبان سے مذاکرات پر مجبور ہے یہ "دہشت گردوں کا قلع قمع کرنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ کوئی چیخ کر کہہ رہا ہے، ان کے ساتھ سعودی عرب، قطر، کویت اور متحدہ عرب امارات کی طرح نمٹا جائے۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ ہماری جان کا جنجال ہے۔ کیا عقل پائی ہے۔ یہ مثالیں دیتے ہوئے ان کو یہ بات بھول جاتی ہے کہ ان ملکوں میں "دہشت گردوں" کے خلاف کارروائی سے بہت پہلے انہوں نے میڈیا کا تاگلہ گھونٹا کہ آواز تک نکلنے نہیں دی۔ پھر جس کو چاہا دہشت گرد کہہ کر اُس کا خاتمہ کر دیا۔ اور آج یہ سب کے سب ممالک ایک عوامی طوفان کا سامنا کر رہے ہیں۔ سب عرب ظالم اور سیکولر حکمران عوام کے غیظ و غضب سے بھاگ رہے ہیں، جو موجود ہیں وہ خوفزدہ ہیں۔ جو دانشور ان ملکوں کی مثالیں دیتے نہیں تھکتے انہیں علم ہونا چاہیے کہ دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر پہلی چھری میڈیا کی گردن پر چلائی جاتی ہے۔

خوف کا عالم ہے۔ ہمارا ان داتا، ناخدا اور سہارا شکست کھا کر بھاگ رہا ہے۔ افغان کاسہ لیس حکمران، پاکستانی حکومتی کارپرداز، ایران میں جمع ہوئے۔ وہ ملک جس نے پورے دس سال عراق اور افغانستان کے عوام کے خلاف امریکہ کو قدم جمانے کا موقع دیا۔ تینوں ملک اُس "دہشت گردی" کے خلاف جنگ کا اعلان کر رہے ہیں جس کے بارے میں باراک اوباما نے کہا کہ اب یہ جنگ اس مقام پر ہے کہ دور سے نگرانی کرنا ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے دنیا کے بتوں کو پوجا ہو انہیں ان طاقتور کھلونوں کے ٹوٹنے کا بڑا دکھ ہوتا ہے۔ وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں کہ شاید کوئی اور بت مل جائے جس کی پوجا کریں۔ 1980ء تک جو روشن خیال تھے وہ روس کو پوجا کرتے تھے۔ وہ بت ٹوٹا تو امریکہ کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ اب تو اس بت خانے میں کوئی بت سلامت نہیں ہے۔ دنیا کی طاقتوں پر بھروسہ کرنے والوں کا عالم شکست دیدنی ہوتا ہے۔ سارے اندرونی خوف اور نفسیاتی اُلجھنیں کھل کر ناچنے لگتی ہیں۔ اوہ! یہ خوفناک طالبان جیت رہے ہیں، ہم پتھر کے زمانے کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہ جو نظر رکھتے تھے، جنہیں اللہ نے بصیرت عطا کی تھی، دس سال پہلے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ امریکہ افغانستان میں نہیں جیت سکے گا، بھاگ جائے گا، سب مذاق اُڑاتے تھے۔ اب وہ صاحبانِ بصیرت ان دنوں ایک گفتگو کر رہے ہیں۔ جب جنگ ختم ہوتی ہے تو فیصلوں کے دن آتے ہیں۔ ٹرائل شروع ہوتا ہے۔ میرے اللہ پر بھروسہ کرنے والوں اور دنیا کی طاقت پر بھروسہ کرنے والوں کی جنگ ختم ہو رہی ہے۔ جس نے جس کا ساتھ دیا اُس کا انجام اُس کے ساتھ ہو گا۔ یہی میرے رب کا فیصلہ ہے۔ اس فیصلے کا اعلان تو ہو چکا، صرف معافی کی مہلت باقی ہے۔ ہے کوئی جو اس قوم کو پکار پکار کر بتائے جب اللہ کے غالب ہونے کی نشانیاں واضح ہو جائیں تو سارے بتوں سے منہ موڑ کر اُس کے حضور سجدہ ریز ہو جانا چاہیے۔ ایسا تو فرعون کے دربار میں موجود جادوگروں نے بھی کر دیا تھا۔ اس قوم کے پاس دو ہی راستے ہیں۔ جادوگروں کی طرح اللہ کی طاقت پر ایمان لا کر خوف سے نکل جاتی ہے یا پھر فرعون کی طرح زمین پر بڑا بن کر اُس کے عذاب کا انتظار کرتی ہے۔

سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا ہوا

20 اپریل 1970ء میں امریکہ کے صدر رچرڈ نکسن نے اسی طرح ٹیلی ویژن پر آکر اعلان کیا تھا جس طرح صدر اوباما نے افغانستان سے امریکی افواج کے بارے میں کہا ہے۔ نکسن نے کہا کہ ہم ویت نام سے ایک لاکھ پچاس ہزار افواج کو واپس بلا رہے ہیں۔ وہ جنگ جس میں لاکھوں لوگ مارے گئے تھے۔ کتنے شہر برباد ہوئے تھے۔ خود امریکہ کے 59 ہزار فوجی لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ اب اختتام پذیر ہو رہی تھی۔ امریکہ ویت نام سے جا رہا تھا۔ جہاں وہ مدتوں اس نام پر انسانوں کا خون بہاتا رہا کہ دنیا کو کیمونسٹ دہشت گردوں سے بچانا ہے۔ یہ دہشت گرد انسانیت کے دشمن ہیں۔ یہ ہمارا لائف سٹائل ہم سے چھیننا چاہتے ہیں۔ ویت نام تو امریکی جارحیت کی جنگ لڑ رہا تھا اور اب اس کے نہتے عوام فتح کے نزدیک تھے۔ لیکن ویت نام کے پڑوس میں ایک ملک تھا کمبوڈیا۔ ویت نام کی جنگ کے دوران امریکی حکومت اور اُس کا پریس ہمیشہ ایک الزام لگاتا رہا کہ اس ملک کمبوڈیا میں چالیس ہزار کے قریب ویت نام پیپلز آرمی کے دہشت گرد پناہ لئے ہوئے ہیں اور مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ اُن کے محفوظ ٹھکانے ہیں اور کمبوڈیا کی حکومت ایک غیر جانبدار کردار ادا کرتے ہوئے انہیں پھلنے پھولنے کا موقع دے رہی ہے۔ تبصرہ نگار یہاں تک لکھتے رہے کہ آج جو امریکہ ویت نام سے شکست خوردہ ہو کر نکل رہا ہے اس کی بنیادی وجہ پڑوس میں قائم کیمونسٹ دہشت گردوں کے وہ ٹھکانے ہیں جہاں سے ویت نام کے اندر برابر کمک مہیا کی جاتی ہے۔ یہاں لوگوں کو تربیت بھی دی جاتی ہے اور اسلحے کے بھی بڑے بڑے ذخیرے چھپائے گئے ہیں۔ کمبوڈیا کی یہ مشرقی سرحد ایک غیر آباد سا علاقہ ہے اور کیمونسٹ دہشت گرد ویت نام میں کاروائیاں کر کے یہاں آکر چھپ جاتے ہیں۔ ایک طویل عرصے سے امریکی حکومت اور اُس کا میڈیا پوری دنیا کو یہ باور کروانے میں لگا رہا کہ عظیم امریکی فوج جس میں ریمبو جیسے دیو مالائی کردار ہوتے ہیں وہ کبھی شکست نہ کھاتی اگر کمبوڈیا کی اندر خانے دہشت گردوں کو پناہ دینے کی پالیسی نہ جاری رہتی۔ امریکی کمبوڈیا کے سربراہ سہانوک کو قائل کرتے رہے کہ اس دوغلی پالیسی سے باز آجاؤ۔ دنیا بھر میں غیر جانبدار بنتے ہو لیکن تمہارے وہ علاقے جو ویت نام کی سرحد کے قریب ہیں ان میں دہشت گرد چھپے بیٹھے ہیں۔ صدر جانسن نے ایک خفیہ مشن کی منظوری دی تا کہ ان جگہوں کی نشاندہی کی جائے جہاں دہشت گردوں کے ٹھکانے موجود ہیں۔

اب امریکہ کے جانے کا وقت آگیا تھا۔ ذلت و رسوائی تو اُس کا مقدر تھی ہی لیکن اس ذلت کو کم کیسے کیا جائے۔ اُس زمانے میں بھی آج کی طرح بکاؤ دانشور اور تجزیہ نگار ہوتے تھے۔ ایسے کمبوڈیا میں بھی تھے۔ انہوں نے شور مچانا شروع کیا کہ ویت نام کے گوریلے ہماری زمین پر دہشت اور بربریت کی علامت ہیں۔ یہ ہمارے ملک میں امن کے لئے خطرہ ہیں۔ انہوں نے ہماری سلامتی تباہ کر دی ہے۔ ان کے خلاف سہانوک کو فیصلہ کن جنگ کرنا ہو گی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جب کمبوڈیا میں ان کیمونسٹ دہشت گردوں کے خلاف ملکی مفاد کے نام پر ریلیاں نکل رہی تھیں امریکہ ویت نام کے ان دہشت گردوں کے ساتھ فرانس میں مذاکرات کر رہا تھا۔ دانشوروں اور تجزیہ نگاروں کا غصہ دیدنی تھا۔ سہانوک کو وہ کیمونسٹ دہشت گردوں کا سرپرست قرار دیتے تھے۔ یوں ملکی مفاد اور امریکی پشت پناہی پر وہاں کے کاسہ لیس اسمبلی ممبران نے سہانوک کو برطرف کر کے جنرل لون مول کو عارضی طور پر اقتدار دے دیا۔ یہ جنرل امریکہ کا پٹھو تھا اور امریکی اشاروں پر ناچتا تھا۔ ادھر کیمونسٹ دہشت گردوں سے مذاکرات چل رہے تھے اور دوسری جانب امریکی فوج کے کمانڈر نے صدر نکسن سے کمبوڈیا میں دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر حملوں کے لئے B-52 طیاروں سے بمباری کی اجازت طلب کی۔ صدر نکسن یہ اجازت نہیں دے رہا تھا کیونکہ اس سے عام لوگوں کے مرنے کا خطرہ تھا۔ کہ اچانک ویت نامی گوریلوں کی جانب سے ایک بڑی کاروائی ہوئی جس میں چند امریکی مارے گئے۔ اس کے بعد امریکی صدر نے فوراً B-52 طیاروں سے کمبوڈیا میں موجود دہشت گردوں کے ٹھکانوں کو تباہ و برباد کرنے کی اجازت دے دی۔ چودہ مہینوں تک امریکہ کے B-52 بمبار طیارے تیس ہزار مرتبہ اڑے اور انہوں نے کمبوڈیا پر ایک لاکھ آٹھ ہزار ٹن گولہ بارود گرایا اور کمبوڈیا کو ایک ایسا مقام بنا دیا جس کے اُجڑے شہر بربریت کی کہانی سناتے تھے۔ جس وقت کمبوڈیا پر حملے ہو رہے تھے امریکہ اس لمحے ان ویت نامی دہشت گردوں سے مذاکرات بھی کر رہا تھا اور اپنے فوجیوں کو بھی وہاں سے نکال رہا تھا۔ اس میں بدترین کردار اُس امریکی کاسہ لیس جرنیل لون مول کا تھا جو ساتھ ساتھ ان کیمونسٹ دہشت گردوں کے خلاف ملک کے اندر بھی جنگ جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کی بدترین مثال 15 اپریل 1971ء کا وہ واقعہ ہے جب آٹھ سو ایسے کیمونسٹ "دہشت گردوں" کو پکڑا گیا جو ویت نامی نسل سے تعلق رکھتے تھے لیکن صدیوں سے یہاں آباد تھے۔ انہیں دہشت گردوں کا ساتھی قرار دیا گیا۔ ایک گاؤں کے باہر جس کا نام چوری چنگوار تھا انہیں رسیوں سے باندھا گیا اور پھر گولیوں سے بھون دیا گیا اور لاشیں می کانگ دریا میں بہا دی گئیں تا کہ بہتی ہوئی ویت نام میں داخل ہوں اور لوگ خوفزدہ ہو جائیں۔ امریکی صدر نکسن نے کہا کہ یہ ہمارا سب سے کامیاب آپریشن تھا کیونکہ ہمیں 1971ء اور 1972ء میں جب ہم پڑوسی ملک کمبوڈیا پر بم برسا رہے تھے تو ہمیں ویت نام میں ایک پر سکون وقفہ میسر آگیا تھا اور ہم اپنے فوجی بحفاظت وہاں سے لے گئے تھے۔

امریکہ کی کیمونسٹ دہشت گردوں سے جنگ ختم ہو گئی۔ ویت نام آزاد ہو گیا، سنبھل گیا لیکن کمبوڈیا آج تک نہیں سنبھل سکا۔ آج بھی ویسا ہی عالم ہے۔ امریکہ کے اخبار آج کل تو تبصرے نہیں کرتے، بلکہ خبریں دیتے ہیں "کہ امریکی افواج نے پاکستان میں ڈھائی سو سے زیادہ ایسے مقامات نشان زدہ کر لئے جہاں حملے کرنے ہیں۔ طالبان دہشت گردوں" سے امریکہ کے مذاکرات بھی ہو رہے ہیں اور ہمارے ملک کا میڈیا اور عظیم تجزیہ نگار ان کے خلاف سخت کاروائی کا مطالبہ بھی کر رہے ہیں۔ ہنگامے، سیاسی اکھاڑ پچھاڑ اور افراتفری بھی عروج پر ہے۔ امریکہ کا یہ المیہ ہے کہ اُس نے ہمیشہ ایک ہی تاریخ کو دہرایا اور ایک ہی حکمتِ عملی اختیار کی۔ شاید طاقت کا نشہ ہے، یا پھر اُسے حکومتوں میں سے اپنے لئے وفادار اور ملک و قوم کے غدار مل جاتے ہیں جو اپنا ہی گھر خود تباہ کرنے پر تیار ہوں۔ بنگال میں میر جعفر ملے تو میسور میں بھی میر جعفر ملنے کی توقع رکھنی چاہیے بے شک ان کا اپنا ملک کمبوڈیا کی طرح ملیامیٹ ہو جائے۔

سُود نہیں قرضِ حسنہ

جس ملک میں اربوں روپے بددیانتی اور کرپشن میں ڈوبے ہوئے اداروں کو ہر سال دیئے جاتے ہوں، جہاں گندم کی سبسڈی پر اس قوم کے غریب لوگوں کے خون پسینہ سے اکٹھے کئے گئے ٹیکسوں سے اربوں روپے خرچ کر دیئے جائیں، جہاں کبھی بے نظیر انکم سپورٹ، کبھی بیت المال اور کبھی کسی اور سکیم کے تحت اربوں روپے کی خیرات دی جاتی ہو، جہاں سستی روٹی، مفت تعلیم اور مفت کتابوں کے نعروں پر اربوں روپے خرچ کئے جاتے ہوں۔ یہ تمام روپے یا تو مخصوص مفادات کے زیرِ اثر خرچ ہوتے ہیں یا پھر سیاسی مفادات کی تکمیل کے لئے۔ لیکن اگر کوئی ان تمام حکمرانوں کو ایک مشورہ دے کہ ان سارے پیسوں سے جو تم ہر سال خرچ کرتے ہو اور پھر طرح طرح کے طعنے بھی سنتے ہو، الزامات بھی برداشت کرتے ہو، اگر ان سب کو ملا کر ایک ایسا بینکاری کا نظام شروع کریں جو قرضِ حسنہ کی بنیاد پر قائم ہو، جس کے تمام انتظامی اخراجات حکومت برداشت کرے اور اس مملکت خداداد پاکستان میں ایک بلا سود بینکاری کی طرح ڈالی جائے تو سب کی جبینوں پر بل پڑنے لگتے ہیں۔ سب کے سب مشورہ دینے والے کو دقیانوس اور فرسودہ کہنے لگتے ہیں۔ طرح طرح کے سوال اُٹھتے ہیں۔ یہ سودی نظام ہی تو ہے جو آج معاشرتی اور صنعتی ترقی کی بنیاد ہے۔ اس کے بغیر تو ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ ان عظیم دانشوروں اور معاشی تجزیہ نگاروں کو میرے اللہ نے صرف تین سال پہلے ایسا جواب دیا کہ ان سب کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں۔ یہ تو صرف تین سال پہلے کی بات ہے جب امریکہ، برطانیہ اور سود کے بل بوتے اور ناجائز دھن دولت کی بدولت آباد ہونے والا دبئی اس طرح ڈوبے کہ اربوں ڈالریوں لگتا تھا کہ سمندر کی نذر ہو گئے۔ وہ جائیدادیں جن کی قیمتیں گھنٹوں کے حساب سے بڑھتی تھیں انہیں کوڑیوں کے مول بھی خریدنے والا کوئی نہ تھا۔ بینکوں کے دروازے پر تالے پڑ گئے تھے۔ تو ایسے میں امریکہ اور برطانیہ نے اپنی معیشتوں کو مستحکم کرنے کے لئے شرح سود کو صفر کے قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ یعنی عملی طور پر سود کو ختم کر دیا تاکہ ان کی معیشت پھلے اور پھولے۔ صرف انتظامی اخراجات کے لئے پیسے لئے جاتے تھے۔ مدتوں سے سود کی بنیاد پر چلتی ہوئی معیشتوں نے تسلیم کیا کہ معیشت کو استحکام دینا ہو تو سود کو ختم کرنا ہو گا۔ لیکن ہمارے کسی سیاستدان، معیشت کے ماہر اور اقتصادی امور کے تجزیہ نگار نے اس واضح علامت سے بھی کوئی سبق حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔

یہ سبق ہم کیوں حاصل نہیں کرتے۔ ہم جن کے گھروں میں قرآن پاک کسی پاک صاف مقام پر ضرور موجود ہوتا ہے اور ہم میں سے بہت سے ایسے ہوں گے جنہوں نے قرآن پاک کی وہ آیت بھی پڑھی ہو گی جس میں اللہ نے سود کا کاروبار کرنے کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا ہے۔ لیکن ہمارے ہر چوراہے پر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلانِ جنگ کے بڑے بڑے بورڈ جگمگاتے ہیں، اُس کی دکانیں کھلی ہیں، ان کے خوشنما ترغیبات کے اشتہار اخبارات اور ٹی وی کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا کسی نے سارے بینکاری نظام پر غور کیا ہے جس کو لندن کے علاقوں میں آباد ان یہودی سناروں نے شروع کیا جن کے پاس لوگ سونا رکھتے تھے اور وہ اُس کے عوض ایک چٹ دیا کرتے تھے جس سے لوگ خریداری کرتے تھے۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ ایک تولہ رکھوا کر تھوڑا سا پیسہ دینے سے لوگ دو تولے یا تین تولے کی چٹ بھی جاری کروا لیتے۔ یوں ایک ایسا طبقہ یا گروہ وجود میں آ گیا جن کے پاس لوگوں کا سرمایہ تھا اور وہ جس کو جس طرح چاہتے دیتے، جس کاروبار میں چاہتے استعمال کرتے اور سونا بے شک کم ہو جتنی چاہے چٹیں جاری کر دیتے۔ یوں ان یہودی سناروں نے برطانیہ میں بینک آف انگلینڈ کی بنیاد رکھی اور ایک ایسے سسٹم کا آغاز کیا جس کے تحت لاکھوں لوگوں کی تھوڑی تھوڑی بچتیں سود کا لالچ دے کر اکٹھی کی جائیں اور انہیں چند من مانے افراد کو دیا جائے اور وہ جو چاہے اُس سے کریں، کاروبار کر کے ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری کریں، نقصان ہو تو دیوالیہ کہلا کر غریب عوام کی جمع پونجی ہڑپ کر لیں۔ زیادہ ہو تو پورا بینک ڈوب جائے اور عام آدمی روتا پیٹتا رہ جائے۔ سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ ورلڈ بینک اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک ایک یا ڈیڑھ فیصد انتظامی اخراجات لے کر ملکوں کو قرضہ دیتے ہیں اور ہمارے حکمران بہانہ یہ کرتے ہیں کہ ہم سودی نظام کے گھن چکر سے کیسے نکلیں۔

دراصل مسئلہ یہ ہے کہ میرے ملک کے حکمران طبقوں کو غریب کے پیسوں کی ایسی لت پڑی ہوئی ہے کہ اس وقت پاکستان میں موجود تمام بینکوں سے حکومت نے قرضہ لے رکھا ہے اور وہ مہنگی شرح سود پر۔ ہم بجٹ کا خسارہ یا تو سناروں کے کاغذوں کی طرح نوٹ چھاپ کر پورا کرتے ہیں یا پھر لوگوں کے بینکوں میں پڑے ہوئے پیسے ہضم کر کے۔ ہماری ساری کی ساری معیشت ان پیسوں کے گرد گھومتی ہے جو لوگوں نے یہ سمجھ کر بینکوں میں محفوظ کر رکھا ہے کہ کل ان کے کام آئیں گے۔ اس وقت بینکوں کے اس خزانے کا ستر فیصد سے زیادہ حکومت کو قرض دیا جا چکا ہے اور حکومت ان بینکوں کو جو سود ادا کر رہی ہے ان سے ان بینکوں کی عالیشان عمارتیں ائیر کنڈیشنڈ دفاتر، بہترین کاریں اور اللے تللے چل رہے ہیں۔ "دکھ جھیلے بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں"۔ اس بی فاختہ یعنی عوام کو دکھ جھیلنا ہی چاہیے کہ اُس نے یہ تصور کر لیا ہے کہ شاید اللہ کے خزانوں میں کوئی کمی واقع ہونے والی ہے اس لئے آنے والے کل کا بندوبست کر لیا جائے۔ جس مغربی معاشرے سے یہ بینکاری نظام آیا ہے وہاں عوام کی اکثریت بچت پر یقین نہیں رکھتی۔ جو کماتی ہے، اُڑا دیتی ہے اور بوقت ضرورت یعنی بیماری، بے روزگاری اور بڑھاپے میں حکومت ان کی کفالت کو موجود ہوتی ہے۔ لوگوں کا ٹیکس لوگوں پر خرچ ہوتا ہے۔ اسی لئے سود کی لعنت کا وہ اثر اُس معاشرے پر نہیں ہوا جو ہمارے اوپر ہوا ہے۔ ہم تو روز لٹتے ہیں، تباہ ہوتے ہیں، دیوالیہ ہو جاتے ہیں۔

لوگ سوال کرتے ہیں اس بینکاری نظام کا جو معیشت کی بنیاد بن چکا ہے اُس کا توڑ کیا ہے۔ یاروں نے اسلامی بینکاری کے نام پر توڑ نکالنے کی کوشش کی لیکن وہاں بھی اجارہ دار بینک، آپ سے پیسے اکٹھے کئے، جہاں چاہے لگا دیئے اور بتایا اتنا منافع اور اتنا نقصان۔ اب جو سرکار کو سولہ فیصد سود پر رقم دی جا رہی ہے یہ کونسا اسلامی کاروبار ہے۔ لیکن ہم خوش کہ اسلام کے مطابق ہمارا روپیہ محفوظ ہے۔ اسلام اس قسم کی تجارت اور نفع و نقصان کو پسند نہیں کرتا جس میں آپ کو علم تک نہ ہو کہ مال حرام کاروبار میں لگ رہا ہے یا حلال۔ اسلام کے ہاں اگر کوئی تصور بینک کا ہو سکتا ہے اور بن سکتا ہے تو وہ یہ کہ ایک ایسا ادارہ جس کے پاس ایک طویل لسٹ موجود ہو جہاں پر سرمایہ کاری کی جا سکے، لوگ آ کر مرضی سے اپنا ادارہ چنیں، وہاں روپیہ خود اپنی مرضی سے لگائیں اور بینک ایک ملازم کی طرح وہاں ان کے روپے کی دیکھ بھال کرے اور اُس کی تنخواہ وصول کرے۔ لیکن ایسا نہ سرمایہ دار ہونے دے گا اور نہ حکومت کیونکہ اس میں سب کے مزے ہی مزے ہیں۔ پیسہ کسی اور کا، لوٹ کر کھائے کوئی اور، اور سود بینک والوں کی عیاشیوں کا باعث بنے۔ میرے اللہ نے سود کے توڑ کے لئے صرف ایک ہی راستہ بیان کیا ہے قرضِ حسنہ۔ جس ملک میں ایک اکیلا شخص ڈاکٹر امجد ثاقب اخوت کے نام پر ایک ارب سے زیادہ روپے سے کئی سالوں سے قرضِ حسنہ کی سکیم چلا رہا ہو، اور غریب لوگ اسے رقم واپس بھی کریں اور چھوٹے موٹے کاروبار سے اپنے پاؤں پر کھڑے بھی ہو جائیں، وہاں اگر حکومت یہ سوال کرے کہ اس نظام کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ اللہ کے نام پر حاصل کئے گئے ملک میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے جنگ کی دکانیں کھلی ہوں، ڈھول بجا کر میڈیا پر نقارۂ جنگ بج رہا ہو اور توقع یہ کہ ہم پر رحم ہو گا، ہم پر عذاب نہیں اترے گا، ہم امن اور چین سے زندگی گذار لیں گے۔

بُتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

جولائی 1920ء کی ایک صبح جب اُمتِ مسلمہ کی مرکزیت اور خلافت کے خاتمے کے لئے پہلی جنگ عظیم کے دوران تمام اتحادی افواج خلافت عثمانیہ پر ٹوٹ پڑی تھیں تو اس دن دمشق فتح ہوا تھا۔ فرانسیسی جرنیل ہنری گوراوُڈ شہر میں داخل ہوا اور سیدھا اُمیہ مسجد کے ساتھ باغ میں موجود صلاح الدین ایوبی کی قبر پر پہنچا۔ اُس نے اپنے فوجی بوٹوں سے زور سے قبر کو ٹھڈا مارا اور زور سے بولا، صلاح الدین! اُٹھو ہم واپس آگئے ہیں۔ میری یہاں موجودگی صلیب کی ہلال کے اوپر فتح کی علامت ہے۔ اسی قبر کے باہر تلوار لہراتے ہوئے برطانوی فوج کے کمانڈر ایڈمنڈ ایلن بائی نے کہا، آج مقدس صلیبی جنگیں لڑنے والوں کی خواہشات کی تکمیل ہوئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یورپ کی منافقت کا اظہار کرتے ہوئے تیرہ سال کے بعد اُس نے ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ یروشلم کو تو ہم نے ایک جغرافیائی اہمیت (StrategicImportance) کی وجہ سے فتح کیا تھا، اس میں کوئی مذہبی جذبہ یا انتقام شامل نہیں تھا۔ لیکن اس زمانے کے برطانوی اخبار تو آج بھی ریکارڈ کا حصہ اور عجائب گھروں میں موجود ہیں جن میں ایک کارٹون بہت مقبول ہوا تھا جس میں رچرڈ شیر دل جس نے صلاح الدین ایوبی سے شکست کھائی تھی، اُسے پہاڑ پر کھڑے یروشلم شہر کو دیکھتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور کارٹون پر لکھا تھا "آخر کار میرا خواب پورا ہو گیا"۔ صلیبی جنگیں تقریباً دو سو سال تک جاری رہیں۔ یہ 1096 میں شروع ہوئیں اور آخری اور نویں صلیبی جنگ 1272 میں ختم ہوئی۔ ان جنگوں میں مسلمانوں کو مسلمان نہیں بلکہ سارسین (SARCEN) کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ یہ لفظ دراصل قدیم روم کی سلطنت میں صحرا کے رہنے والے اجڈ اور گنوار) لوگوں کے لئے بولا جاتا تھا۔ بعد میں اس کو عربوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا لیکن صلیبی جنگوں میں یہ لفظ تمام اہل اسلام کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہ لفظ اسی طرح خطرناک تھا جیسے آج کے دور میں دہشت گرد، القاعدہ یا طالبان ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ صلیبی جنگیں صرف عیسائیوں نے نہیں لڑیں بلکہ میرے پیارے رسول ﷺ کے قول کے مطابق "پورا کفر ایک واحد قوم ہے"، 4 ستمبر 1271 میں برطانیہ کا شہزادہ ایڈورڈ نویں صلیبی جنگ کے لئے افواج کے ساتھ جب قبرص میں موجود تھا تو اُس نے ایران پر قابض منگول بادشاہ آباغا کو مدد کے لئے پکارا۔ اُس نے حامی بھری اور اکتوبر 1271 میں اُس کی افواج شہزادہ ایڈورڈ کی مدد کے لئے پہنچ گئیں جنہوں نے مل کر مسلمانوں پر حملہ کیا جنہیں وہ اپنی زبان میں سارسین کہتے تھے لیکن شکست ان متحدہ افواج کا مقدر بن گئی۔ اس سارے زمانے میں لکھی گئی تاریخوں میں یورپ کو مسیحی یورپ کہا جاتا رہا۔ مسیحی یورپ کا یہی نقشہ ہے جسے آج کے دور میں یورپین یونین کہا اور لکھا جاتا ہے۔ اس نقشے سے وہ تمام خطے باہر ہیں جو نیلی یا شربتی آنکھوں، سنہرے بالوں اور گوری رنگت والے انسانوں سے آباد ہیں لیکن ان کے آباء واجداد نے کلمۂ طیبہ پڑھ کر اسلام کو سینے سے لگایا تھا اور آج خواہ ان کی رنگت مسیحی یورپ کے انسانوں جیسی ہو، ان کے لباس اور بالوں کی تراش خراش بھی اُسی طرح ہو، ان کی رگوں میں بھی آریائی خون دوڑ رہا ہو لیکن ان کا نام جوزف کی جگہ یوسف اور جیکب کی جگہ یعقوب ہے تو خواہ وہ یورپ کی دیوار کے ساتھ ملے ہوئے کیوں نہ ہوں، وہ ترکی کی طرح کبھی ان کی متحدہ بازنطینی سلطنت کا دارالحکومت کیوں نہ رہے ہوں، موجودہ یورپ سے باہر ہیں۔ دنیا بھر میں دو قومی نظریے کا نعرہ ہندوستان میں 1930 کے خطبہ الہ آباد میں پہلی دفعہ علامہ اقبال نے نہیں لگایا تھا بلکہ پوپ اربن دوئم نے 1096 میں لگایا تھا جب اُس نے تمام مسیحی یورپ کو مسلمانوں کے خلاف مقدس صلیبی جنگ لڑنے کے لئے متحد کیا تھا۔ پوپ اربن دوئم منافق نہیں تھا۔ اس نے واضح اور صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ یہ عیسائیت اور اسلام کی جنگ ہے۔ منگول بادشاہ بھی منافق نہیں تھا، اُس نے بھی کہا تھا کہ ہم دونوں کا دشمن مشترک ہے یعنی مسلمان، اس لئے ہم دونوں کا مفاد بھی مشترک ہے۔ اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ اگر پوری مسلم اُمہ ایک قوم ہے تو پھر پاکستان بنا کر علیحدہ قوم تخلیق کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ علیحدہ علیحدہ ملک اور قوم کا مطالبہ کبھی مسلمانوں کی جانب سے نہیں تھا۔ جب پورا مغرب مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے جنگ عظیم اوّل میں متحد تھا اس وقت بھی شریف مکہ کا نعرہ یہ تھا کہ خلافت تو قریش کا حق ہے یوں اس نعرے پر مسلم اُمہ کو تقسیم کر کے اس پر فتح حاصل کی گئی اور پوری اُمت کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا۔ یہی وہ دور تھا جب اس برصغیر میں تاریخ کی پہلی سیاسی تحریک خلافت موومنٹ چلی تھی۔ یہ وہ تحریک خلافت تھی جس میں ایک محکوم قوم نے اپنی آزادی کے لئے جدوجہد نہیں کی تھی بلکہ مسلمانوں کی مرکزیت کو بچانے اور خلافت کے اُس ادارے کے تحفظ کے لئے کوشش کی تھی جو ٹوٹا پھوٹا سہی لیکن ان کے ایک ہونے، ایک اُمت یا ایک قوم ہونے کی علامت کے طور پر موجود تھا۔ یہ علامت اس قدر آنکھوں میں کھٹکتی تھی کہ وہ ملت کفر جس کے فاتحین ہمارے قبر میں سوئے ہوئے سورما کی بے حرمتی پر اتر آئے تھے، انہوں نے اسے اس طرح پارہ پارہ کیا کہ دوبارہ متحد نہ ہو سکے۔ تیونس سے لے کر عراق تک، سب لوگوں کا مذہب ایک، زبان ایک، قبائل اور نسلی رنگ ڈھنگ ایک، صدیوں سے علاقہ ایک، لیکن لکیریں ڈال دی گئیں۔ جس کے پاس جتنی تیل کی دولت تھی اتنا ہی چھوٹا ملک دیا گیا کہ خود اس کا تحفظ نہ کر سکے۔ قطر، کویت، بحرین، اور متحدہ عرب امارات کی سات چھوٹی چھوٹی ریاستیں۔ یہ سب تو نسلاً بھی عرب تھے اور علاقائی طور پر بھی صدیوں سے ایک تھے۔

جس زمانے میں برصغیر کے مسلمان تحریک خلافت کی جدوجہد کر رہے تھے، اُسی دور میں وہ ایک خواب اور بھی دیکھ رہے تھے۔ اس برصغیر میں ہندوؤں سے علیحدہ ہونے کا خواب، تاکہ ہم دنیا پر ثابت کر سکیں کہ ہم ایک رنگ، ایک نسل، ایک علاقہ اور ایک زبان کے باوجود صرف اس لئے علیحدہ ہیں کہ ہم ایک اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمیں ان سے علیحدہ کر دو جو ہمارے رشتے کرشن اور رام چندر سے جوڑتے پھرتے ہیں۔ ہم تو اُس اُمت سے ہیں کہ باپ ابو جہل ہے تو بیٹا عکرمہ کہ اسلام قبول کرتا ہے تو باپ کا نام اُسی نفرت سے لیتا ہے جیسے سارے مسلمان۔ ہم نے یہ مطالبہ کرتے ہوئے کوئی انہونی بات نہیں کی تھی۔ ہم نے دنیا میں موجود تاریخی حقیقت کھول کر رکھ دی تھی کہ مسلمان یورپ کا گورا ہو، افریقہ کا کالا ہو یا مشرق کا زرد رو پوری دنیا کے سامنے علیحدہ ہے۔ اگر دنیا اس دو قومی نظریے کو نہ مانتی تو انڈونیشیا کے ایک رنگ، نسل اور زبان والے مشرقی تیمور کے عیسائیوں کی آزادی کے لئے اکٹھی نہ ہوتی۔ پاکستان اس چھ ارب انسانوں کی دنیا میں اس حقیقت کا پہلا باضابطہ اعلان ہے۔ یہ انگریز جنرل ایڈمنڈ ایلن بائی کی منافقانہ زبان میں جغرافیائی یا سٹریٹجک اہمیت کی جگہ نہیں۔ میرے اللہ کے ساتھ نسبت کی ایک سرزمین ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جس کے ساتھ میرے اللہ کی غیرت وابستہ ہے، اس لئے اس سے محبت اللہ کے نام کی نسبتی سے محبت بنتی ہے۔ یہ وہ مدینہ ہے جو رنگ، نسل، زبان اور علاقے کے بتوں کو توڑ کر وجود میں آیا ہے۔ اسی لئے ان سارے بتوں کو پوجنے والے اس کے خلاف ہیں۔ جن کے دلوں میں وہ سارے بت آباد ہیں وہ ایک قوم ہیں اور جن کے دل اس شرک سے پاک وہ ایک قوم۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

دنیا بھر کے وہ عظیم تاریخ دان، دانشور، ماہرین ثقافت جو اسلام کے اُس عالمی نظریۂ انسانیت کہ پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے آخری خطبے کے ان الفاظ کہ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے، کے مقابلے میں رنگ، نسل، زبان اور خصوصاً دھرتی کا نظریہ اس زور شور سے پیش کرتے ہیں، ان کے لئے گذشتہ دنوں پاکستان میں متعین ملائشیاء کے قونصل جنرل عبدالرزاق کا یہ بیان چونکا دینے والا ہو گا کہ اس مملکت خداداپاکستان کے سات سو کے قریب متمول لوگوں نے ایک سو اسی (180) ارب روپے ملائشیاء منتقل کیے۔ یہ روپے ملائشیا کے ایک پروگرام کے تحت وہاں منتقل کیے گئے ہیں جس کا نام ہے "ملائشیا میرا دوسرا گھر"۔ یہ پروگرام 2001ء میں شروع کیا گیا۔ اب تک اس پروگرام کے تحت تیرہ ہزار لوگ اپنا سرمایہ وہاں منتقل کر کے خود بھی وہاں رہائش پذیر ہو چکے ہیں۔ اس پروگرام کے تحت آپ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ملائشیا منتقل ہو سکتے ہیں۔ آپ کے سرمائے پر کسی قسم کا کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا۔ آپ کو زمین اور جائیداد خریدنے کی مکمل آزادی ہو گی۔ آپ وہاں ایک ٹیکس فری کار منگوا سکیں گے۔ آپ کو وہاں کاروبار کرنے کی آزادی ہو گی۔ آپ کے 21 سال سے کم عمر بچے تعلیم حاصل کر سکیں گے اور 21 سال سے بڑے بچے علیحدہ درخواست دے کر یہ سہولت حاصل کر سکیں گے۔ لیکن ان سب کو یہ مخصوص شناختی کارڈ جاری کیا جائے گا جس پر "ملائشیا میرا دوسرا گھر" درج ہو گا۔ اگر آپ کے پاس ملائشیا کے تین لاکھ پچاس ہزار کے مطابق بچت موجود ہے یعنی آپ کے پاس ایک کروڑ روپیہ ہے تو آپ وہاں جا سکتے ہیں۔

ایک سو اسی ارب روپیہ جو سات سو پاکستانیوں نے وہاں منتقل کیا ہے یہ ہمارے پورے ملک کے سالانہ ترقیاتی بجٹ کے دو تہائی کے برابر ہے۔ اکثر صوبوں کا بجٹ اس سے بھی کم ہے۔ ملک چھوڑ کر کسی دوسری جگہ آباد ہونے کا جنون صرف امراء اور روساء میں ہی نہیں میرے ملک کے ہر طبقے میں پایا جاتا ہے۔ اپنا گھر چھوڑ کر دیارِ غیر میں آباد ہونے والے پاکستانیوں کا مضحکہ اڑاتے ہوئے بی بی سی نے ایک ڈاکومنٹری بنائی تھی جس کا نام تھا "چوہدریاں دے کمی پتر"۔ یہ لوگ جو یہاں چھوٹی موٹی زمینداری کرتے تھے اور ترکھان، لوہار، مستری، جولاہے وغیرہ کو ذلت و تحقیر کے ساتھ "کمی" کہتے تھے، جب وہاں گئے تو کوئی دیارِ غیر میں ٹیکسٹائل مل میں جولاہا ہو گیا، کسی نے لوہار اور ترکھان کا پیشہ اختیار کر لیا تو کوئی ہوٹلوں میں "نائیوں" والا کھانے پکانے کا کام کرنے لگا۔ حتیٰ کہ گھر اور شہر کی صفائی کا کام جو کبھی برصغیر میں شودروں کے ذمے ہوتا تھا، انگریزوں کے آنے کے بعد وہ لوگ جوق در جوق عیسائی ہوئے لیکن یہ کام انہیں سے وابستہ رہا۔ اگر ان میں سے کوئی مسلمان ہوا تو اُسے "مصلی" کے حقارت زدہ نام سے پکارا جاتا۔ چوہدریوں کے یہ عظیم سپوت یہ کام بھی وہاں جا کر کرتے رہے۔ لانچوں میں بیٹھ کر گئے، ریگستانوں میں گم ہوئے، سمندروں میں غرق ہوئے، جیلوں میں سڑتے رہے، جو وہاں پہنچے، پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کبھی نکالے گئے تو پھر واپس جانے کی کوشش کی یا پھر کسی دوسرے ملک میں آباد ہونے کی۔ متحدہ عرب امارات میں جو پاکستانی ہیں وہ ایک خاص عمر کے بعد وہاں نہیں رہ سکتے۔ بڑھاپا آگیا، آخرت کے دن نزدیک ہو گئے، لیکن ان میں سے اکثریت نے کینیڈا کی شہریت حاصل کر لی کہ اب یہ جمع پونجی اُس ملک میں جا کر خرچ کریں گے۔ جو مغرب یا کسی دوسرے ملک میں جا کر آباد ہوئے ان میں سے ایک نسل نے تو پیچھے مڑ کر اپنے گھر بار کو یاد کیا لیکن دوسری نسل نے وہ سارے طوق گلے سے اُتار پھینکے۔ اس عمل کا تعلق پاکستان سے خاص نہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی لوگ جہازوں میں بھر بھر کر جایا کرتے تھے اور وہاں کی کپڑے کی ملیں آباد کیا کرتے تھے۔ یہ کسی ایک قوم کے ساتھ بھی منسلک رویہ نہیں ہے۔ انسانوں نے وہ زمین جسے وہ مادرِ وطن کہتا ہے اسے ہمیشہ بہتر مستقبل کے لئے سب سے پہلے چھوڑا ہے۔ اپنی جمع پونجی اُٹھائی اور اُس دھرتی ماتا پر دو حرف بھیج دیئے۔ ایسا نہ ہوتا تو آج امریکہ جیسی عالمی طاقت کی سرزمین پر صرف اور صرف ریڈ انڈین آباد ہوتے۔ نہ کوئی جرمن، فرانسیسی، برطانوی، روسی اور دنیا بھر کے ملکوں سے وہاں جا کر آباد ہوتے۔ یہ سب اپنی زمین علاقہ اور وطن جسے قومیت کی سب سے بڑی بنیاد سمجھا جاتا ہے اُس کو چھوڑ کر روانہ ہوئے اور پھر ایسے بھولے کہ اگر کوئی ان سے پوچھے کہ آپ کون ہیں تو کہیں گے کہ میں امریکی ہوں، سو فیصد امریکی۔

مادرِ وطن کہ جسے قومیت کی بنیاد کہا جاتا ہے اُس سے مضبوط رشتے کا عالم یہ ہے کہ کوئی بھی قحط، بدحالی، سیلاب اور یہاں تک کہ امن و امان کی بری حالت کے دوران اس کے ساتھ چمٹا نہیں رہا۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ تارکین وطن کی تعداد لبنان کے شہریوں کی ہے۔ کیا صدیوں پرانی تاریخ ہے۔ کنعان کا علاقہ، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام کی سرزمین۔ زیتون کے باغوں کا جنت ارضی، خلیل جبران کے خوابوں کا مرکز لیکن جب اس خطے میں لوگوں نے عیسائی مسلمان اور شیعہ سنی کے نام پر بندوقیں تانیں، ملیشیا بنے، علاقے تقسیم ہوئے تو یہ خوبصورت لبنانی افراد اس خوبصورت خطے کو چھوڑ کر دنیا بھر میں آباد ہونے لگے۔ اس وقت لبنان جس کی کل آبادی 41 لاکھ ہے اُس کے ایک کروڑ بیس لاکھ لوگ ملک سے باہر دوسرے ملکوں میں آباد ہیں جن میں سے ستر لاکھ تو برازیل میں ہیں۔ دنیا کا امیر ترین آدمی کارلوس سلیم جو میکسیکو میں رہتا ہے لیکن لبنان سے ہجرت کر کے وہاں گیا ہے۔ یہ دنیا کا امیر ترین آدمی ہے اور اُس کی مادرِ وطن 52 ارب ڈالر کی مقروض ہے۔ یہ کیسا رشتہ ہے، یہ کیسا تصور ہے جس کی بنیاد پر ہم ایک ایک انچ زمین کے ٹکڑے کے لئے ہزاروں انسانوں کا خون بہا دیتے ہیں۔ کروڑوں بلکہ اربوں روپے ہتھیاروں کو خریدنے میں لگاتے ہیں اور اربوں روپے مادرِ وطن کے تحفظ کے لئے افواج پر خرچ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس دنیا کے مؤرخوں، دانشوروں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے کبھی زبان کی برتری پر کبھی نسل کے تفاخر پر اور کبھی علاقے کے حسن پر اپنے قلم کی سیاہی خرچ کر کے انسانوں کو تقسیم کیا۔ اس ساری تاریخ نگاری میں اس قدر جھوٹ بولا گیا کہ وہ آبائی قومیں جن میں بلوچ، پنجابی، پٹھان اور سندھی شامل ہیں، جنہوں نے قدیم موئن جو داڑو تہذیب کو ملیامیٹ کیا، ان کو نگل لیا اور جو زندہ بچے، ان کو شودر بنایا، ان باہر سے آئے ہوئے حملہ آوروں کو سندھ کی تہذیبی ثقافت کا وارث بتاتے ہیں۔ یہ آرین وہی تھے کہ جب ان کی مادرِ وطن پر قحط کا سایہ ہوا تو اُسے اکیلا چھوڑ کر یہاں آکر آباد ہو گئے۔

وطن، جغرافیے اور علاقے بادشاہوں نے تخلیق کئے، اپنی فتوحات کے بعد، پھر عالمی طاقتوں نے غریبوں کو اپنی غربت میں محدود کرنے اور لوٹے ہوئے وسائل سے اپنے علاقوں میں عیش کرنے کے لئے قومی ریاستوں کو تخلیق کیا، پاسپورٹ جاری کئے، ویزے بنائے، یہ سب صرف 80 سال قبل ہوا۔ لیکن میرا اللہ ان ساری حد بندیوں کا انکار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اس تمام زمین کا مالک اللہ ہے، تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی زمین کی وسعت میں پھیل جانے کی دعوت دیتا ہے۔ البتہ وہ صرف اور صرف ایک مطالبہ کرتا ہے کہ اُس کی زمین پر اُسی کا حکم چلنا چاہیے۔ اُس کے نزدیک انسانوں کی صرف دو تقسیمیں ہیں۔ ایک وہ جو اُس کا حکم نافذ کرنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو اپنا حکم چلانا چاہتے ہیں۔ دنیا میں یہی تقسیم ازلی اور ابدی ہے۔ نمرود سے ابراہیم، فرعون سے موسیٰ اور آج کے مکمل کفر سے مکمل اسلام کی تفریق۔

ایک لاکھ نو مسلم گورے

یہ لوگ شیعہ ہیں نہ سنّی، بریلوی نہ دیوبندی، وہابی نہ اہلِ حدیث، صرف اور صرف مسلمان۔ اسلام کی حقانیت پر صدقِ دل سے ایمان لانے والے اور اُس کی تعلیمات کو پڑھنے کے بعد اُسے قبول کرنے والے۔ ان کے آباء و اجداد نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہ ہوگا۔ گورے، پکے گورے، جو صدیوں تک پاپائے روم، آسٹریا، سپین، روس اور انگلستان کی پاپائیت کے اسیر رہے۔ مدتوں ہماری طرح عیسائیت کے پچاس کے قریب گروہوں میں تقسیم رہے۔ جن کی حکومتوں پر ایک طویل عرصہ پادریوں کی احتساب عدالتوں کا رُعب چلتا رہا۔ جو جب چاہتے، جسے چاہتے مرتد قرار دے کر اُس کے وجود پر شیطانی ارواح کا غلبہ ختم کرنے کے لئے اُسے جلتے ہوئے آگ کے الاؤ میں پھینک دیتے۔ تمام عمر کے لئے قید خانوں میں ڈال دیتے۔ سائنس دان، فلسفی، شاعر، ادیب، افسانہ نگار سب کے سب ان کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے۔ آگ کے الاؤ کا ایندھن صرف انسان ہی نہیں بلکہ کتابیں تک بنتی رہیں۔ ہائیڈل برگ کی مشہورِ زمانہ آگ تو تاریخ کا حصہ ہے جس میں تمام لائبریریوں سے فلسفہ، سائنس اور ادب کی لاکھوں کتابیں جلتی رہیں اور کئی دنوں تک آگ پورے شہر کو روشن کرتی رہی۔ ایک دن تنگ آکر انہوں نے مذہب کو اپنے کاروبارِ زندگی سے ایسے نکالا کہ بس اُس کی رسومات باقی رہ گئیں، اور زندگی سائنسی اخلاقیات، جمہوریت اور انسانی حقوق کے سہارے بسر کرنے لگے۔ اکثریت کہے کہ ہم جنس پرستی جائز تو برحق، لاکھوں نوجوان لڑکیاں بغیر شادی کے ماں بن جائیں تو انسانی حقوق کے تحت جائز۔ مذہب بس کرسمس اور ایسٹر کے دنوں میں کرسمس کا درخت سجانے، سانتا کلاز اور کیک وغیرہ تک محدود ہو گیا۔ یہ وہ بے روح معاشرہ تھا جس کا نوجوان دن بھر دفتری، کاروباری اور معاشی زندگی کا بوجھ اُٹھائے اپنی بے چین روح کو کبھی رقص کے کلب، شراب کی بار اور بگڑ گئے تو نشے کے جھونکوں میں تسکین دیتا۔ اس معاشرے پر تقریباً ڈیڑھ صدی ایسی گذری کہ دنیا کی مادی کامیابی کا تمغہ ہی زندگیوں کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا رہا۔ بے چین اور مضطرب روحیں جن کے پاس نہ گھر بچا تھا، سکون کے لئے اور نہ ازدواجی زندگی۔ ادھر مذہب میں کرسمس کے کیک، سانتا کلاز اور چند رسومات کے سوا کچھ باقی نہ تھا۔ لیکن ان سب لوگوں کے لئے اسلام بھی اتنا ہی اجنبی تھا، بلکہ یہ تو ایک خوفناک اور ہیبت ناک تصور رکھتا تھا۔ خونخوار مرد، پردے میں لپٹی ہوئی عورتیں، زنا پر سنگسار کرنے والے، چوری پر ہاتھ کاٹنے والے، بے رحم سفاک۔

اسلام کا یہی وہ تصور تھا جسے صلیبی جنگوں کے بعد عیسائی پادریوں اور پھر روشن خیال دانشوروں نے اپنی تحریروں سے ان لوگوں کو بتایا۔ ادھر برصغیر پاک و ہند سے جو مزدور پیشہ لوگ انگلستان گئے، ان کے پیچھے پیچھے شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی، اہلِ حدیث سب کے سب مولوی ان کے بلاوے پر وہاں جا پہنچے۔ برمنگھم شہر میں 160 مسجدیں ہیں لیکن کسی ایک کا دین کسی دوسرے سے نہیں ملتا اور کسی ایک کا چاند کسی دوسرے کے ساتھ آسمان پر برآمد نہیں ہوتا۔ ایسے میں گیارہ ستمبر آیا، خوفناک، سفاک اور ظالم مسلمان کی تصویر اور اُجاگر کی گئی، طالبان، دہشت گرد، امن کے دشمن، انسانوں کے قاتل، عورتوں کے لئے بے رحم۔ لیکن میرے اللہ کی تدبیر و حکمت بھی عجیب ہے۔ ادھر سارے کے سارے مسلمان ممالک بے غیرتی کا لبادہ اوڑھ کر اپنے ہی بھائیوں کو دہشت گردی کے "خاتمے" کے نام پر قتل کرنے لگے اور ادھر بے چین اور مضطرب روح رکھنے والے گورے نے اس "خوفناک" اور سفاک "مذہب کی تعلیمات کا رُخ کر لیا۔ اکثر تو یہ دیکھنے چلے تھے کہ مذہب اس قدر غیر انسانی کیوں ہے۔ لیکن اللہ جب ھدایت کے دروازے کھولتا ہے تو قتل کی نیت سے جانے والے عمر ابن خطاب کو پوری اسلامی تاریخ کا وہ انسان بنا دیتا ہے جس کے اصولِ حکمرانی پر مغرب بھی انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

وہی انگلستان جہاں گورے ایسی آبادیوں سے کوچ کر جاتے تھے جہاں برصغیر اور افریقہ کے مسلمان آکر رہتے تھے۔ وہاں گذشتہ سال یعنی 2010ء میں پانچ ہزار دو سو (5200) خالص انگریز نسل کے گوروں نے اسلام قبول کیا، یعنی روزانہ 15 انگریز مسلمان ہوئے۔ مزید شماریات کی زبان استعمال کی جائے تو ہر دو گھنٹے میں ایک گورے نے اسلام قبول کیا۔ یہ اعداد و شمار ایک برطانوی تھنک ٹینک "FaithMatters" نے شائع کئے ہیں۔ یہ حیران کن انکشافات سب سے پہلے سکاٹ لینڈ کے علاقے سے آئے جہاں مردم شماری کے دوران یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آپ بچپن میں کن مذہبی تعلیمات میں پروان چڑھے اور اب کونسے مذہب پر عمل پیرا ہیں۔ وہ حیران رہ گئے کہ 2001ء تک مسلمان ہونے والے 14200 لوگوں میں 8700 پکے انگریز تھے، 700 سکھ، 400 ہندو اور 4400 افریقی اور لاطینی امریکی تھے۔ یہ تو خطرے کی گھنٹی تھی۔ ابھی حیرانی اس بات پر تھی کہ گیارہ ستمبر ہوا ہے اور یہ کیا تماشہ ہے۔ اُس وقت تک یہی تصور تھا کہ برطانیہ میں مسلمان تو باہر سے آتے ہیں، یہاں نوکریاں کرتے اور پھر آباد ہو جاتے ہیں۔ گورے تو گورے ہی رہتے ہیں، آزاد خیال۔ تھا بھی ایسے ہی، 2001 تک صرف 50000 کے قریب گوروں نے اسلام قبول کیا تھا اور صرف دس سال میں ان کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ وہی یعنی روزانہ پندرہ اور ہر دو گھنٹے میں ایک نسلی گورا مسلمان ہو رہا ہے۔

لیکن اس میں سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ مسلمان ہونے والوں میں ستر فیصد خواتین ہیں اور ان کی اوسط عمر 27 سال ہے۔ ان نوجوانوں کی بے چین روحیں اور مضطرب دل انہیں اسلام کے قریب لے آئے۔ لیان علی نے کہا کہ میں ایک عام نوجوان گوری لڑکی کی طرح کلبوں میں جاتی، شراب سے غم غلط کرتی، کسی کو میں چھوڑتی، کوئی مجھے چھوڑتا۔ ہانہ تج یہ جو 23 سالہ فیشن ڈیزائنر ہے، اُس نے کہا میرے پاس دولت، شہرت، بوائے فرینڈ سب کچھ تھا لیکن میری روح بے چین تھی۔ شمالی لندن کی 26 سالہ ڈینی ہورسلے جو ایک ڈانس ٹیچر ہے نے کہا میں نے بے چینی میں ہر مذہب کی کتابیں پڑھ ڈالیں لیکن مجھے اسلام کی تعلیمات نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کہانیاں ہی کہانیاں ہیں۔ جنہیں کبھی انگلستان میں رہنے والے یقین نہیں کرتے تھے۔ پھر ان کے بڑے بڑے لوگ اسلام قبول کرنے لگے۔ سابق وزیر اعظم ایسکوتھ کی پوتی، سابق وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی سالی، ڈائریکٹر جنرل بی بی سی لارڈ برٹ کا بیٹا۔ ایک طویل فہرست ہے ان اعلیٰ خاندانی روساء کی جو سترہ ہزار کے قریب بنتی ہے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ ایک اور اہم بات یہ کہ ان میں دو تہائی لڑکیاں ہیں، وہ کلمۂ طیبہ پڑھتے ہی پہلا کام حجاب پہننے کا کرتی ہیں۔ اس لئے کہ انہیں کوئی روشن خیال، انسانی حقوق کا علمبردار، حدود آرڈیننس کے خلاف آواز بلند کرنے والی این جی او کی سربراہ گمراہ نہیں کر سکتی، اس لئے کہ ان لوگوں نے پڑھ کر اور سمجھ کر اسلام قبول کیا ہے۔ یہ لوگ نہ شیعہ ہیں نہ سنی، وہابی ہیں نہ بریلوی، یہ قرآن خود پڑھتے ہیں، حدیث کا خود مطالعہ کرتے ہیں اور ان کا ہادی برحق سیّد الانبیاء ﷺ ہے۔ انہیں کوئی طالبان کا نام لے کر ڈرا نہیں سکتا، کوئی انہیں دہشت گردوں کا ساتھی کہہ کر خوفزدہ نہیں کر سکتا۔ یہ ساری کہانیاں جانتے ہیں۔ انہیں سب معلوم ہے کس کے منہ میں کس کی زبان ہے کس کے ٹی وی پروگرام میں کس کا پیسہ بول رہا ہے۔

نہ جا اُس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اُس کی

وہ جو تمسخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ سب طاقتیں دنیا پر حکمرانی کرنے والوں کے ہاتھ میں ہیں۔ جن کے خوف کا یہ عالم ہے کہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اگر ہم نے امریکہ کا ساتھ چھوڑا تو ہم کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ ایسے ہی فقرے اور اسی طرح کی دلیلیں پرویز مشرف اور ان کے حواری دیا کرتے تھے کہ اگر ہم امریکہ کا ساتھ نہ دیتے تو ہمارا تورہ بورہ بنا دیا جاتا۔ ٹی وی کیمروں کے سامنے گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ گفتگو کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اتنے لوگ افغان جنگ میں نہیں مرے جتنے ہمارے ہاں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہمارا ایک دفعہ نہیں ہر روز تورہ بورہ بن رہا ہے لیکن ہمیں پھر بھی شرمندگی نہیں ہوتی۔ کاش ہم امریکہ کا ساتھ نہ دیتے، ہمارا تورہ بورہ بن جاتا تو کم از کم مرنے والوں کو موت سے پہلے اس بات کا یقین اور ایمان تو ہوتا کہ انہیں مارنے والے اللہ اکبر کہنے والے نہیں بلکہ اُس سے انکار کرنے والے ہیں۔ اب تو نہ مرنے والوں کو یقین ہے کہ وہ صحیح موت مر رہے ہیں اور نہ ہی مارنے والوں کو اطمینان کہ وہ بے گناہ کو نہیں مار رہے۔ ہمارے گناہوں کی تفصیل طویل ہے اور ہمارے مظالم کی داستان دردناک۔ ہم نے اپنا گھر بچانے کے لئے اپنی سرزمین سے ساٹھ ہزار دفعہ امریکی طیاروں کو پرواز کی اجازت دی کہ وہ ہمارے پڑوس میں رہنے والے انسانوں کے جسموں کے پرخچے اُڑا دیں۔ پڑوسی جس کے بارے میں سیّد الانبیاء ﷺ نے کہا کہ جس نے پڑوسی کے کتے کو مارا اُس نے پڑوسی کو ایذا دی، پھر فرمایا سنو پڑوسی کو ستانے والا دوزخی ہے، اگرچہ تمام رات عبادت کرے اور تمام دن روزہ دار ہو۔ جس کے شر سے پڑوسی بے خوف نہ ہو، وہ مسلمان نہیں، خواہ وہ پڑوسی کافر ہو یا مومن۔ لیکن یہاں تو پڑوسی مسلمان تھے، ان کی کبھی ہم سے جنگ نہ رہی تھی، ہم اپنے خوبصورت گھروں اور نرم بستروں میں بیٹھے یہ ظلم و ستم کا منظر دیکھتے رہے، تبصرے کرتے رہے، ایسے جیسے جنگ عظیم پر بنائے جانے والی کسی فیچر فلم کو دیکھ کر گفتگو کی جاتی ہے۔ ہم نے اپنے اقتدار کو طول دینے، خود کو عالمی طاقتوں کے سامنے روشن خیال ثابت کرنے کے لئے اپنے دارالحکومت میں ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کی گھن گرج میں جامعہ حفصہ کی طالبات کا خون بہایا۔ پوری قوم اپنے محفوظ گھروں میں اپنی اولادوں کا ماتھا چوم کر مزے کی نیند سوتی رہی۔

پھر ہمارا گھر اُجڑنا شروع ہوا۔ وہ جو میرے رب نے فرمایا ہے کہ میں قادر ہوں اس بات پر کہ تم کو ایک دوسرے کی گردنیں کٹوا کر عذاب کا مزہ چکھاؤں۔ گردنیں ایسی کٹیں کہ گھر گھر ماتم ہونے لگا۔ خودکش حملے، آپریشن، آج سوات میں تو کل باجوڑ میں، پرسوں درہ آدم خیل میں تو اگلے دن جنوبی وزیرستان میں۔ نہ کوئی بازار خودکش حملوں سے محفوظ رہا اور نہ کوئی ادارہ، دونوں جانب کے مرنے والے جنازہ اُٹھا کر کلمۂ شہادت کا ورد کرتے اور مسنون نمازِ جنازہ ادا کرتے۔ سیّد الانبیاء ﷺ کی اُسی حدیث کے مطابق کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ نہ مرنے والے کو اس کا پتہ ہو گا کہ وہ کیوں مارا گیا اور نہ مارنے والے کو اس بات کی خبر کہ وہ کیوں مار رہا ہے۔ دونوں جانب اللہ اکبر کی صدائیں، دونوں جانب شہید کا لقب اختیار کرنے پر زور۔ ہم نے پھر تمسخر اُڑایا، یہ سب تو مذہب کی دیوانگی ہے۔ میرے اللہ نے سب سے بڑے شہر کراچی میں اسی طرح انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کے قتل کا عذاب مسلط کیا۔ مارنے والا بھی سیکولر اور مرنے والا بھی سیکولر۔ مارنے والا بھی مولوی کو گالی دینے والا، مرنے والا بھی مولوی کی تضحیک کرنے والا۔ ہم طاقتور ہیں، ہم کچلنا، کمر توڑنا جانتے ہیں، ہم ہر قیمت پر امن قائم کریں گے۔ کیسے کیسے دعوے تھے۔ حالانکہ امن دینے کی اور بھوک میں کھانا دینے کی ذمہ داری کو تو اللہ نے خود لے رکھی ہے۔ سورہ القریش میں فرمایا کہ اُس گھر کے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف میں امان دی۔ لیکن ہم تو دنیا کی سب بڑی طاقتوں کے کاسہ لیس ہیں۔ بلوچستان میں ہم نے ہر قیمت پر امن قائم کرنا شروع کیا، لاشوں کے انبار لگنے لگے۔ تین بلوچ مارے گئے تو بدلے میں تین پنجابیوں کے بھی لاشے تڑپائے گئے۔ نہ مرنے والے کو پتہ کہ کیوں مارا گیا، نہ مارنے والے کو علم کہ کیوں مار رہا ہے۔ وہی سیّد الانبیاء ﷺ کی بشارتِ عذاب۔ اللہ نے اسی آیت میں اپنے دو اور عذابوں کے اشارے دیئے ہیں۔ اُس نے فرمایا ہے کہ وہ قادر ہے پاؤں کے نیچے سے عذاب لے آئے یا آسمان یعنی سروں کے اوپر سے۔ پہلے زلزلہ آیا، ہم ذرا سنبھلے، اُس کو راضی کرنے کے لئے بھائیوں کی مدد کو نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن پھر بھی ہم نے اس آفت اور عذاب کا سہارا لے کر اللہ سے نہیں بلکہ ہر دنیاوی بڑی طاقت کے سامنے کشکولِ گدائی پھیلا دیا۔ ہماری بددیانتی کی داستانیں رقم ہوئیں۔ ہم پر آسمانوں سے سیلاب نازل ہوا۔ لوگوں نے ہماری بددیانتی کی وجہ سے ہمارے کشکول میں تھوکنا بھی گوارا نہ کیا۔ یہ تو سب اشارے تھے، ہلکے ہلکے جھٹکے تھے کہ ہم سنبھل جائیں، لیکن ہم اپنے حال میں مست اور دنیا کی لذتوں میں گم روز ظلم دیکھتے اور خاموش و پرسکون نیند سوتے رہے۔

جس ملک میں ڈرون حملوں میں تین ہزار کے قریب بے گناہ اور بے نام و نشان لوگ مارے گئے ہوں اور وہاں ایسے بھی دانشور موجود ہوں جو کہیں کہ دہشت گرد ان معصوم لوگوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اس لئے یہ مارے جاتے ہیں، یہ دانشور اللہ کا شکر ادا کریں کہ ان کے نوجوان بیٹے کسی ڈرون حملے میں نہیں مارے گئے، ایسا ہوتا تو میں دیکھتا کہ کس مزے سے وہ یہ منطق برآمد کرتے ہیں۔ اللہ قرآن پاک میں ایک بہت بڑا دعویٰ کرتا ہے کہ "کون ہے جو مضطرب دلوں کی فریاد سنتا ہے" ہم نے سرِعام کتنے مضطرب دلوں کو پیدا کیا ان کے پیاروں کو موت کی نیند سلا کر۔ خروٹ آباد میں نہتے بچے اور عورتیں ماری گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب غیر قانونی طور پر یہاں آئے تھے۔ اگر یہ منطق ہے تو پھر کیا اٹلی، سپین، یونان، برطانیہ، امریکہ اور یورپ میں ہزاروں غیر قانونی پاکستانیوں کو بھی اسی طرح مار دیا جانا چاہیے۔ وہ بھی تو ایک دہشت گردوں کی پناہ گاہ ملک سے آئے ہیں اور مغرب اُس کا اعلان بھی کرتا ہے۔ سیالکوٹ میں لاٹھیاں مار مار کر دو نوجوان مار دیئے گئے، چند دن واویلا پھر خاموشی، کل کا رینجرز کے ہاتھوں نہتے نوجوان کا قتل اور پوری قوم کی بدترین خاموشی دل دہلا دینے کے لئے کافی ہے۔

لوگ پوچھتے ہیں ظالموں کا انجام کیوں نہیں ہوتا، اللہ لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ معاشرے سے فتنہ، فساد اور ظلم کو ختم کرو، برائی سے روکو، ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا افضل ترین جہاد قرار دیا اُس نے۔ جب بستیوں کی بستیاں خاموش رہیں پھر اللہ کا قہر ظلم کرنے والے اور ظلم پر خاموش رہنے والے دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اگر انجام میں تاخیر ہو رہی ہے، اللہ کے فیصلے میں دیر ہو رہی ہے تو ڈرو اس لئے کہ تم سب روز اپنی فردِ جرم میں ایک نیا اضافہ کرتے جا رہے ہو۔ سب کے سب جن پر غضب کی بارش ہونی ہے کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ صاحبانِ نظر کا خوف دیدنی ہے۔ وہ جو کل تک ڈراتے تھے کہ شاید لوگ اللہ کی طرف مائل ہو جائیں، استغفار کر لیں، خود خوف سے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ کوئی زمین کی ایسی جنبش دیکھ رہا ہے کہ بستیوں کا نشان باقی نہ رہے تو کوئی سمندر کو غضب ناک ہوتے ہوئے بپھرتا دیکھ رہا ہے۔ جتنے دن گذرتے جا رہے ہیں ہم اپنی فردِ عمل میں ایک اور ناراضگی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں اللہ خاموش تماشائی ہے، ہرگز نہیں، بقول مولانا ظفر علی خان۔

نہ جا اُس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اُسکی
ڈر اُسکی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اُسکا

نروس بریک ڈاؤن

ذہنی مریضوں کے ساتھ کام کرنے والے ماہرین دماغی امراض یا ماہرین نفسیات سے امراض کی وجوہات کے بارے میں سوال کریں، شیزوفرینیا یا جسے عرفِ عام میں پاگل پن کہتے ہیں اُس کے عوامل پر بحث کریں تو وہ کوئی ایک جواب نہیں دے پاتے۔ اکثر تو یہاں تک کہہ اُٹھتے ہیں کہ جتنے انسان مختلف ہوتے ہیں ذہنی مرض کی وجوہات بھی اتنی ہی مختلف ہوتی ہیں۔ اپنی پہلی نوکری میں نے لاہور میں ذہنی امراض کے مشہور ادارے فاؤنٹین ہاؤس سے شروع کی جبکہ دورانِ تعلیم میں نے دو سال کے لئے لاہور کے مینٹل ہسپتال جسے عام لوگ پاگل خانہ کہتے ہیں، وہاں تحقیقی سرگرمیوں میں گذارے۔ اس دوران میں نے کئی سو ذہنی مریضوں کے حالات اور امراض کی کیفیات کا مطالعہ کیا۔ ماہرین دماغی امراض اسے کیس ہسٹری کہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی مریض کی سوانح عمری ہی ہوتی ہے لیکن چونکہ اس کے لکھنے کا مقصد ان معلومات کو ایک جگہ مرتب کرنا ہوتا ہے جن سے مرض کی نوعیت اور وجوہات کا علم ہو سکے، اس لئے اس میں غیر ضروری واقعات نہیں لکھے جاتے۔ نہ زبان کی چاشنی ہوتی ہے اور نہ ہی رنگینی پیدا کرنے کے لئے عشق و محبت کی داستانیں اور ان داستانوں میں محبوبہ کے حسن کی دلآویزی اور عاشق کی وارفتگی کا تذکرہ ہوتا ہے۔ البتہ اگر عشق میں ناکامی کے بعد کوئی شخص دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائے، اُسے اپنے اردگرد کا ہوش تک نہ رہے، اُلٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگے تو پھر اس عشق، ناکامی اور موصوف کی تمام حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مریضوں کی یہ کیس ہسٹریاں ایک ترتیب کے ساتھ معلومات کا ایک ذخیرہ جمع کرنے کے لئے مرتب کی جاتی ہیں۔ میں نے اپنے ایم اے کے تحقیقی کام کے لئے اسی طرح کی کوئی پانچ سو کیس ہسٹریاں جمع کیں اور پھر ان کی معلومات کی بنیاد پر ذہنی امراض کی وجوہات کو مرتب کیا۔ لیکن ان سب معلومات کے باوجود بھی اگر کوئی مجھ سے یہ سوال کرے کہ ذہنی امراض کی چیدہ چیدہ وجوہات کونسی ہیں تو میں شاید ایک سانس میں کیا، کئی منٹ تک پورا جواب نہ دے پاؤں۔ کیونکہ جتنے انسان ایک دوسرے سے مختلف ہیں ویسے ہی وجوہات بھی مختلف۔ لیکن کسی بڑے مرض یعنی شیزوفرینیا میں ایک چیز مشترک ہے کہ یہ ایک دم دھماکے کے ساتھ ہوتا ہے۔ عام زبان میں اسے نروس بریک ڈاؤن کہتے ہیں، یعنی دماغ کی گاڑی چلتے چلتے اچانک رک جائے۔ لیکن اس رُک جانے کی کوئی نہ کوئی فوری وجہ ضرور ہوتی ہے۔ کوئی امتحان میں فیل ہو گیا، کسی نے اپنے سامنے کسی کو قتل ہوتے دیکھ لیا، کوئی عشق میں بری طرح ناکام ہو گیا، کسی کا کاروبار تباہ ہو گیا۔ غرض ایک فوری واقعہ کسی شخص کو ایسی کیفیت میں لے جاتا ہے کہ وہ اچانک پژمردگی یا ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر ایک دم اس قدر خونخوار ہو جاتا ہے کہ ہر شے اُلٹ پلٹ دیتا ہے۔ ایسے مریض کو سنبھالنے کے لئے کبھی کبھی پانچ چھ افراد بھی کم پڑتے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ گاڑی مضبوط ہو تو کھڈے یا سپیڈ بریکر پر اچانک ٹکرانے سے تھوڑی دیر بعد سنبھل جاتی ہے لیکن مسلسل خرابیوں کی وجہ سے اگر کمزور ہو تو پھر ذرا سی بے توجہی سے اگر کسی رکاوٹ سے ٹکرا جائے تو اس کا وہیں بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔

انسانوں کا معاملہ بھی ایسے ہی ہے، روز روز کی اُلجھنیں، مسائل، پریشانیاں، بے روزگاریاں، غربت اور ناکامیاں ان کے ذہن کی مشینری کو کمزور کرتی جاتی ہیں، لیکن جیسے تیسے یہ کھٹارا گاڑی چلتی رہتی ہے، اُس کا ڈھانچہ سلامت ہوتا ہے لیکن وہ اندر سے اس قدر نازک ہو چکی ہوتی ہے کہ بس ایک بڑا جھٹکا اسے بریک ڈاؤن کی سطح پر لے آتا ہے۔ یہ جھٹکا انفرادی بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی نوعیت کا بھی۔ مثلاً 1977ء میں جب میں مینٹل ہسپتال میں بحیثیت طالب علم جاتا تھا تو اُس وقت وہاں موجود ہر کسی نے ایک اہم بات محسوس کی کہ نو اپریل کو جب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک اپنے عروج پر تھی تو مال روڈ پر نہتے عوام پر گولی چلائی گئی تھی۔ اُس دن کے بعد اچانک ذہنی مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ ایسا ہی کچھ مجھے گذشتہ دنوں فاؤنٹین ہاؤس کے عملے نے بتایا، جب کافی عرصے بعد میرا وہاں جانا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ اسامہ بن لادن کی ہلاکت کے بعد اچانک ہمارے ہاں ذہنی مریضوں کا بہت زیادہ اضافہ ہونے لگا ہے۔ ان لوگوں کا اس واقعہ کے ساتھ کوئی جذباتی لگاؤ تک نہیں لیکن یہ ایک فوری وجہ بن گئی ان سب کے لئے جو مدتوں پریشانیوں، غربت، افلاس، بیماری اور ناکامی کی چکی میں پس رہے تھے۔

جس طرح ہر فرد کا ایک ذہنی دفاعی نظام ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ کمزور ہوتا ہے اور پھر ایک دم تڑاخ کر کے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس طرح قوموں کا بھی ایک نفسیاتی دفاعی نظام ہوتا ہے، اس لئے کہ قومیں انہی افراد سے مل کر بنتی ہیں۔ اسے قومی نفسیات یا National Psyche کہتے ہیں۔ جس طرح انسانوں کا اچانک نروس بریک ڈاؤن ہوتا ہے ویسے ہی قوموں کا بھی اچانک نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کمزور، ناتواں اور بے بس لوگ اُس شیزوفرینیا کے مریض کی طرح نظر آنے لگتے ہیں جو اس قدر بپھرا ہوتا ہے کہ اُسے پانچ چھ لوگ مل کر بھی قابو نہیں کر سکتے۔ پاکستانی قوم نروس بریک ڈاؤن کے قریب ہے، یہ فقرہ ذوالفقار علی بھٹو کی ہونہار پوتی فاطمہ بھٹو نے سڈنی رائٹرز فورم میں تقریر کرتے ہوئے استعمال کیا ہے۔ تقریر اس قدر سحر انگیز ہے اور اس میں پاکستان اور مسلم اُمہ کا مقدمہ اس نوجوان خاتون نے اس بلا سے لڑا ہے کہ شاید ہی کسی مرد کو اس قدر جرأت نصیب ہوئی ہو۔ امریکہ کے جرائم کی داستانیں اور مظالم کی روداد سے اُس نے قوموں خصوصاً مسلم اُمہ میں پاگل پن کی طرح اُٹھنے والے طوفان کا تذکرہ کیا ہے۔

کس قدر بے وقوف اور جاہل ہوتے ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ مظلوموں کے بیدار ہونے، یا اُٹھنے کے لئے کسی نظریے یا لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں ابھی تک عرب دنیا میں کھولتے ہوئے ہجوموں سے اندازہ ہو جانا چاہئے تھا۔ جس طرح کسی شخص کے نروس بریک ڈاؤن کے لئے کسی نظریے یا لیڈر کی ضرورت نہیں ہوتی، بس ایک واقعہ ہی کافی ہوتا ہے۔ اسی طرح قوموں کے نروس بریک ڈاؤن کے لئے بھی کسی ایک واقعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں صرف اس بات کا اندازہ ہونا چاہیے کہ قوموں کی ذہنی حالت کس حد تک کمزور ہو چکی ہے اور وہ اب اگر کسی غیر معمولی کیفیت سے ٹکرائے تو آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑیں گے۔ کیا کبھی کسی نے سوچا ہے کہ جس قوم کے افراد کے پاس اتنے پیسے نہ ہوں کہ وہ آٹے کی بوری اُٹھا کر لا سکیں، لیکن وہ بوریوں میں اپنے پیاروں کی لاشوں کے ٹکڑے جمع کرتے ہیں، ڈرون حملوں سے مریں یا خودکش حملوں سے، جن کے ذہن کی مشینری کے پرزے، غربت، بیماری، بے روزگاری کے تھپیڑوں سے ڈھیلے ہو چکے ہوں، جو روز آنسوؤں سے تکیے بھگوئیں اور ٹھنڈی آہوں سے شکم کی آگ بجھائیں۔ جن کو جینے کے لئے نہ ذاتی سطح پر عزت میسر ہو اور نہ قومی سطح پر غیرت کہ یہ دونوں دماغ کی مشینری کا ٹانک ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ جب نروس بریک ڈاؤن کے قریب ہوتے ہیں تو انہیں کسی نعرے، نظریے اور لیڈر کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اس وحشی پاگل کی طرح ہوتے ہیں جس کے وجود پر وحشت اتر آتی ہے۔ اُسے کچھ نظر نہیں آتا، نہ طاقت کے ایوان اور نہ صاحبِ عزت لوگ۔

یورپی یونین کا دو قومی نظریہ

فرانس سے بیلجیم کے شہر برسلز کی طرف سفر کرتے ہوئے جب اس طرف ملک کی سرحد پر پہنچا تو احساس تک نہ ہوا کہ میں ایک دوسرے ملک میں داخل ہو رہا ہوں۔ وسیع و عریض موٹروے کے درمیان میں ایک چھوٹا سا نیلے رنگ کا بورڈ جس پر یورپی یونین کا ستاروں والا گول دائرہ اور اُس کے بیچ میں بیلجیم لکھا ہوا تھا۔ یہی حال بیلجیم سے ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈیم جاتے ہوئے تھا۔ اچانک تمام کے تمام بورڈ ولندیزی زبان میں آنے لگے۔ ایک اور فرق تھا کہ سڑک کے دونوں جانب تیز ہوا سے چلنے والی پن چکیاں نظر آنے لگیں۔ کیا یہ وہی ملک ہیں جنہوں نے کئی سال آپس میں نسل اور زبان کی بنیاد پر ایک دوسرے کا خون بہایا۔ چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں اور نسل کی برتری انہیں اس قدر لڑاتی رہی کہ ایک جنگ تو ایسی تھی جو پوری ایک صدی تک چلتی رہی۔ آج اس پورے یورپ میں آپس میں سرحد نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ ان تمام ملکوں میں علیحدہ نسلیں آباد ہیں، علیحدہ زبانیں بولتے ہیں۔ صدیوں کی آپس کی دشمنیاں ہیں۔ انہوں نے دنیا کی دو عالمی جنگیں لڑی ہیں اور کروڑوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ شہر کے شہر ایسے ویران ہوئے تھے کہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ لیکن آج یہ سب ملک ایک کرنسی، ایک جھنڈا اور ایک پارلیمنٹ کے طور پر متحد ہو چکے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ان کے درمیان ایسی کونسی بنیاد ہے جو انہیں متحد رکھتی ہے۔ کوئی اسے یورپ کی سرزمین کہتا ہے تو یہ ایک ایسی بے بنیاد تاریخی حقیقت ہے کہ جس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ یہ الگ بات ہے کہ روم کی قدیم بادشاہت تھی جس کی حدود پھیلتی اور سکڑتی رہتی تھیں، یا پھر آسٹرو ہنگرین سلطنت تھی، کچھ عرصہ سپین یا ہسپانیہ کی متحدہ حکومت تھی۔ لیکن یہ سب کے سب ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ یورپ تو وہ جغرافیائی تقسیم تھی جسے کبھی مغرب کے نام پر اور کبھی روم کے نام پر مؤرخین لکھتے رہے لیکن جب یہ سب کے سب ملک صلیبی جنگوں کے لئے مسلمانوں کے خلاف متحد ہوئے اور ہر علاقے سے جنگجو اکٹھے ہو کر یروشلم کو فتح کرنے نکلے تو اس پورے علاقے کو براعظم یورپ کہا جانے لگا۔ زبان کوئی بھی ہو نسل اور علاقہ کوئی بھی، سب کے سب گاؤں، شہر اور قصبوں سے عیسائیت کے نام پر اکٹھے ہو کر مسلمانوں کے خلاف لڑائی کے لئے نکلے۔ یہ مذہبی جنونیت اس قدر تھی کہ بیلجیم کے ایک بارہ سالہ لڑکے نے ایک گدھا گاڑی بنائی جس پر حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت مریم علیہ السلام کی تصاویر اور صلیبوں کے نشان بنائے اور اپنے ہم عمر بچوں کو مسلمانوں کے خلاف جہاد کے لئے اکٹھا کرنے لگا۔ ہزاروں بچوں کی فوج لے کر مالٹا کے جزیرے پر جا پہنچا۔ کتنے ایسے تھے جو راستے کے خراب موسم میں مرگئے اور بہت سے ایسے تھے جو غلام بنا کر منڈیوں میں فروخت کر دیئے گئے۔ لیکن یورپ صرف اس ایک مقصد کے لئے تاریخ میں متحد نظر آتا ہے اور وہ ہے عیسائیت کی بالادستی۔ یہی ایک بنیادی وجہ تھی جس نے تاریخ میں پہلی دفعہ یہ حدود قائم کیں۔ آج بھی یورپی یونین کے اتحاد کی کوئی بھی وجہ بتائی جائے، علاقہ، سرمایہ دارانہ نظام، گورا رنگ لیکن سب اتنا بے بنیاد تصور لگتا ہے کہ اب بھی کسی فرانسیسی سے بیلجیم والوں کے بارے میں اور سپین والوں سے پرتگال والوں کے بارے میں سوال کریں تو دل میں چھپا تعصب نظر آ جائے گا۔ خواہ اسے تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ یورپی یونین کے اتحاد کی بنیادی کڑی عیسائی مذہب ہے۔ ورنہ مدتوں ترکی نیٹو کا رکن رہا۔ اُس کے اتاترک نے عربی رسم الخط کو ختم کیا۔ قدیم ترکی لباس کو جلا کر یورپ کی طرح پینٹ کوٹ اور سکرٹ کو رواج دیا۔ ملک کا قانون لامذہبیت کی بنیاد پر استوار کیا۔ اپنے آپ کو واپس یورپی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی اور سو سال تک ان کی طرح زندگی بھی گذار کر دکھائی، لیکن اسے یورپی یونین کا حصہ نہ بنایا گیا، حالانکہ وہ قدیم ترین رومن سلطنت کا پایۂ تخت رہا تھا۔ یوم پیائی اور ٹرائے کی سرزمین کا امین۔ لیکن ترکی کا صرف اور صرف ایک قصور تھا کہ اُس کی عوام نے سلطان محمد فاتح کے زمانے میں کلمۂ طیبہ پڑھ لیا تھا۔ اس لئے شکل سے، رنگ سے، لباس اور بودوباش سے اپنے آپ کو یورپ کے رنگ میں رنگنے کے باوجود بھی یورپی یونین کا حصہ نہ بن سکا۔ یہ ہے یورپ کا دو قومی نظریہ۔ یہی وہ دو قومی نظریہ تھا کہ جب یوگوسلاویہ ٹوٹا اور سرب مظالم بوسنیا کے مسلمانوں پر شروع ہوئے تو موجودہ تاریخ کے بدترین مظالم پر پورا یورپ خاموش رہا، نسلوں کی نسلیں قتل ہو کر اجتماعی قبروں کی نذر ہوتی رہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سربیا کے صدر سلابیڈوں ملاسووچ نے کہا تھا کہ یورپ کو فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ عین یورپ کے مرکز میں ایک مسلمان ملک بوسنیا کو دیکھنا چاہتے ہیں یا نہیں۔

یوں تو پوری یورپی یونین میں زندگی کا رنگ ڈھنگ ایک آزاد اور آج کے موجودہ الفاظ میں روشن خیال قسم کا ہو چکا ہے۔ وہ امراض جو کسی بھی معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ لیتیں ہیں وہ سب وہاں بنیادوں تک سرایت کر گئیں ہیں۔ خاندانی نظام اس قدر ختم ہو چکا ہے کہ اکثریت بوڑھے مردوں اور عورتوں کی نظر آنے لگی ہے اور وہ بھی بے یار و مددگار۔ نوجوان جس قسم کی زندگی کے عادی ہو چکے ہیں، انہیں بالکل اس بات کی پرواہ نہیں کہ کل ان کی نسل قائم رہتی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی زندگی عیاشی میں گذار کر مرنا چاہتے ہیں۔ فرانس کی حکومت نے بچہ پیدا کرنے کے لئے خاوند کو بھی میٹرنٹی کی چھٹیاں دینے کا اعلان کیا ہے۔ چھٹیاں جو یورپ میں ایک نعمت ہیں۔ اس کے باوجود بھی کوئی اس طرف مائل نہیں ہوتا۔ ایمسٹرڈیم کے سیاحتی شہر سے گذرو تو ایک جانب دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاح ہوٹلوں اور دکانوں پر مصروف نظر آتے ہیں اور سڑک کی دوسری جانب وہاں کا ریڈ لائٹ ڈسٹرکٹ ہے جہاں دنیا بھر سے آئی ہوئی نوجوان لڑکیاں شیشے کے دروازوں کے پیچھے نیم عریاں لباس میں دعوت گناہ دے رہی ہوتی ہیں اور مرد و زن اس نظارے کو یورپی کلچر کے طور پر دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ پورے یورپ میں کوئی چرچ جائے نہ جائے، مذہب پر عمل کرے یا نہ کرے، جنسی آزادی اور معاشرتی بے راہ روی پر ایمان رکھتا ہو لیکن اگر وہ عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا، اُس کے ملک میں اکثریت عیسائیوں والے ناموں کی ہے تو وہ ملک یورپی یونین کا حصہ ہیں۔ لیکن اگر یہ سب خصائص ترکوں میں نظر آئیں، لیکن وہ ایسے ترک گھرانے میں پیدا ہوں جو کلمۂ طیبہ پڑھتا ہے اور ان میں اکثریت کے نام مسلمانوں جیسے ہیں تو وہ یورپ کے لئے ملیچھ اور شودر۔ یہ ہے وہ دو قومی نظریہ جس کا اعلان میرے اللہ نے پہلے دن سے کر دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا دنیا میں صرف دو قومیں آباد ہیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیاطین۔ اللہ کے گروہ والے اور شیاطین کے گروہ والے۔

عبرت کے مقام

پیرس کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے تین مقام ایسے تھے جن کے پاس کھڑے ہو کر میں نے سوچا کہ میرے ملک کے حکمران اور صاحبِ حیثیت افراد کا اکثر یہاں سے گذر ہوا ہو گا۔ شاید وہ ان خوبصورت عمارات اور یادگاروں کی پر شکوہ عظمت میں اس قدر کھو گئے ہوں کہ انہیں یاد تک نہ رہا ہو کہ یہ مقامِ عبرت ہیں۔ وہ جگہیں جہاں ایسے حکمرانوں کا بدترین انجام تحریر کیا گیا تھا جنہوں نے لوگوں کی غربت وافلاس اور مجبوری ولاچاری کا تمسخر اڑایا تھا۔ ان میں دو مقام تو قدیم فرانس اور اُس کے مشہورِ عام انقلاب سے متعلق ہیں جبکہ ایک موجودہ دور کے ان حکمرانوں کے لئے مقامِ عبرت ہے جنہوں نے اپنے ملک کی دولت لوٹ کر بیرونِ ملک جائیدادیں بنائیں۔ پیرس سے کچھ کلومیٹر کے فاصلے پر ورسائی پیلس ہے۔ اس کے ارد گرد جنگلے پر اس قدر سونے کا پانی پھیرا گیا ہے کہ آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ سولہویں صدی میں اسے لوئی چودہ نے عوام سے الگ تھلگ رہنے کے لئے تعمیر کیا تھا۔ جب بادشاہ اپنے محل میں منتقل ہوا تو وزراء اور امراء نے بھی اُس کے ارد گرد رہائشیں تعمیر کر لیں۔ یوں اس پورے علاقے میں صرف عالیشان محلات ہی نظر آتے ہیں اور غریب لوگوں کا کوئی آشیانہ دکھائی نہیں دیتا۔ محل کے اندر داخل ہوں تو اس کی چھتوں پر وقت کے بہترین مصوروں نے خوبصورت تصاویر اور نقش و نگار بنائے ہیں۔ چاروں جانب سونے کا استعمال بیش بہا ہے۔ محل کے اندر ایک گرجا گھر بھی ہے تاکہ معلوم ہو کہ بادشاہ مذہب کا احترام کرتا ہے۔ کھانے کا وسیع و عریض کمرہ جس کا مرصع فرنیچر، سونے اور چاندی کے برتن، خوبصورت نقش و نگار والی کرسیاں، خوابگاہ کا تو عالم غضب کا ہے۔ محل کے عقب میں بہت بڑا باغ جس میں فواروں کی قطار اور پھر ایکڑوں پر پھیلے ہوئے درخت۔ یہ وہ مقام ہے جس کے ارد گرد ایک دن فرانس کے بھوکے ننگوں کا ہجوم جمع ہوا تھا۔ بادشاہ نے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا تو اتنا کہا کہ ورسائی تو ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ اتنی مختصر آبادی کے علاقے میں اتنے لوگ کہاں سے جمع ہو گئے۔ اسی محل میں ملکہ میری کا وہ تاریخی فقرہ گونجا تھا کہ جب اسے کسی نے بتایا کہ لوگ روٹی کو ترس رہے ہیں تو اس نے کہا تھا اگر لوگوں کو روٹی میسر نہیں تو وہ کیک کیوں نہیں کھاتے۔ اس سے بھی تکبر بھرا فقرہ فوج کے سربراہ کا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ لوگوں کو روٹی میسر نہیں ہے تو کیا پورے فرانس میں اس قدر گھاس لگی ہوئی ہے، یہ لوگ گھاس کیوں نہیں کھاتے۔ لیکن عوام کے ہجوم نے اس شان و شوکت سے بھرپور محل کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ اس کے باوجود بادشاہ کو مہلت دی گئی تھی کہ وہ حالات ٹھیک کرے۔ اُس نے وہی کیا جو آج کے میرے ملک کے حکمران کر رہے ہیں۔ پارلیمنٹ بنائی، پورے ملک کے امیر، زمیندار اور پادری اس کے ممبر بن گئے۔ وہاں کچھ لوگوں نے دولت اور جائیداد عوام کے لئے دینے اور ان کو سہولیات فراہم کرنے کی بات کی لیکن لوگوں کے خون پسینے سے جائیدادیں بنانے والے متحد ہو گئے۔ انہوں نے کہا یہ ہمارا استحقاق ہے۔ ہم عوام کے نمائندے ہیں۔ ہم اس لوٹ مار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتے۔ تاریخ کا یہ وہ لمحہ تھا جو بادشاہوں، آمروں اور عوام کی دولت لوٹنے والوں کے خون سے تحریر کیا گیا۔ یہ دوسرا مقام ہے جو پیرس شہر کے بیچوں بیچ ہے جسے بیسٹائل کہتے ہیں۔ کبھی یہاں ایک بہت بڑا جیل خانہ ہوتا تھا۔ اب وہاں ایک خوبصورت بازار ہے جس کے ایک طرف ایک چوک میں جمہوریہ کی یادگار ہے اور دوسری جانب ایک بلند و بالا مینار ہے جو بیسٹائل کے زوال کی کہانی سناتا ہے۔ اس قید خانے میں حکومت کے مخالفین کو جیل میں لامحدود سزا دے کر بند کیا گیا تھا۔ عوام کے بپھرے ہوئے ہجوم نے اس قید خانے کے دروازے نہتے ہاتھوں سے توڑ ڈالے تھے اور اپنے مظلوم ساتھیوں کو رہا کروا لیا تھا۔ اس کے بعد جو ہوا، اگر وہاں کھڑے ہو کر میرے ملک کا بے حس حکمران طبقہ ایک منٹ کے لئے خیال بھی کر لے تو اُس کی راتوں کی نیند حرام ہو جائے۔ ایک بلند و بالا جگہ پر چھرا نصب کر دیا گیا جسے گیلوٹین کہتے ہیں۔ نیچے ایک مقام پر کسی شخص کی گردن رکھی جاتی، چھرا لہراتا ہوا آتا اور اُس کا سر تن سے جدا ہو جاتا۔ جس کا ہاتھ نرم تھا، جس کا کالر میلا نہ تھا، جو حکومت کے قریب تھا، سب کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے۔ بادشاہ کا سر تن سے علیحدہ ہوا، خون کا فوارہ چھوٹا تو ایک شخص نے انگلی خون میں ڈبو کر ذائقہ چکھتے ہوئے زور کا نعرہ لگایا۔ بادشاہ کا خون بھی ہماری طرح نمکین ہے۔ جس جرنیل نے لوگوں کو گھاس کھانے کا مشورہ دیا تھا، اُس کا منہ گھاس سے بھرا گیا اور پھر چھرے کے نیچے لٹا دیا گیا۔ عبرت کے طور پر ایک شخص بادشاہ کا سر اُٹھا کر گھر لے گیا اور ایک صندوق میں بند کر دیا۔ آج سے تین ماہ قبل یہ سر اُس گھر سے برآمد ہوا ۔

تیسرا مقام فرانس کے شہر پیرس کی سب سے بلند 58 منزلہ عمارت ہے۔ یہ عمارت شاہِ ایران نے اپنے ملک کی دولت لوٹ کر بنائی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اگر ملک سے بھاگا تو یہ عمارت اور دولت اُس کے کام آئے گی۔ لیکن فرانس کی حکومت نے نہ اسے شاہِ ایران کو دیا اور نہ ہی اُس کی اولاد کو۔ بلکہ یہ کہہ کر حکومتی قبضے میں لے لی کہ اُس کی نہیں بلکہ عوام کے پیسے کی لوٹ مار سے بنی ہے۔ آج اُس عمارت کی چھت پر ایک ہوٹل ہے اور عمارت کے اُس مقام پر جانے کے لئے ٹکٹ لگتا ہے۔ شاہِ ایران کے قصے کو بیتے تو تیس سال ہو گئے۔ یہ تو کل کی بات ہے تیونس کے صدر زین بن علی نے عوام کی دولت لوٹ کر ارجنٹائن کے پاس سمندر میں ایک جزیرہ خریدا تاکہ وہاں بقیہ زندگی کے دن گذاروں گا۔ ادھر اُس ملک میں انقلاب آیا اور ادھر اُس جزیرے کو حکومتی ملکیت میں لے لیا گیا۔ پیرس کے ان تین مقامات کے قریب سے میرے ملک کے سیاست دان، جرنیل اور بیوروکریٹ کئی دفعہ گذرے ہوں گے۔ ان میں سے اکثر کی اولادیں جو باہر رہتی یا پڑھتی ہیں، انہوں نے بھی ان کے قریب کھڑے ہو کر تصویریں بنوائی ہوں گی۔ شاہِ ایران کا 58 منزلہ پلازہ بھی دیکھا ہو گا اور پھر اپنی جائیدادوں پر بھی غور کیا ہو گا۔ وہ لوگ جو آج امریکہ کے سامنے صرف اس لئے جھکے ہوئے ہیں کہ اگر خلاف ہوئے تو بیرونِ ملک ان کے اثاثے منجمد کر دیئے جائیں گے۔ ان کے بچوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ انہیں اندازہ نہیں کہ ان کا مستقبل تاریک ہی ہے، جو دولت انہوں نے لوٹی ہے کوئی انہیں استعمال نہیں کرنے دے گا۔ اور اگر عوام کا غیظ و غضب اُٹھا تو ذلت و رسوائی سے بھرپور انجام۔

حضرت یونسؑ، حضرت ایوب اور ابراہیم بن ادھمؒ کے دیس میں

عرب دنیا میں آئے دن عوامی طوفان کے زمانے میں مجھے ایک ملک میں آنے کا موقع ملا ہے جسے عالمی طاقتوں نے جنگ عظیم اوّل اور دوئم کے زمانوں میں مسلمانوں کی ترک خلافت کی مرکزیت کو تباہ و برباد کرنے کے لئے اس طرح تخلیق کیا تھا کہ یہاں فرقہ واریت اور تشدد کو جب چاہے ہوا دی جاسکے۔ یہ ملک مدتوں مغربی سیاحوں کی عیاشی کا مرکز رہا ہے۔ لبنان، جو کبھی بلادِ شام کا ایک حصہ ہوتا تھا، سیّدنا عمر فاروقؓ کے زمانے سے یہ علاقہ تمام مذاہب کے افراد سے بھرا ہونے کے باوجود کبھی بھی نسلی تشدد اور مذہبی منافرت کی بنیاد پر تقسیم نہیں ہوا۔
لیکن آج اس کا سب سے بڑا شہر بیروت یوں علاقائی طور پر تقسیم ہے کہ عیسائی، سُنی مسلمان اور شیعہ مسلمان علیحدہ علیحدہ علاقوں میں بستے ہیں۔ تیس سال کی خانہ جنگی نے ان پر ایسے خوف کے سائے پھیلائے کہ کوئی کسی دوسرے کے علاقے میں قدم رکھنے کی جرأت تک نہیں کرتا تھا کہ کہیں بے موت نہ مارا جائے۔ ہر علاقے کی سرحد پر مسلح جنگجو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے موجود ہوتے۔ قتل و غارت کا بازار اس قدر گرم تھا کہ روز جنازے اُٹھتے اور گھروں سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہوتیں۔ یہاں کے عیسائی قدیم ترین عیسائیت کے پیروکار ہیں جو روم کے پوپ کو بھی نہیں مانتے، انہیں Maronite کرسچین کہا جاتا ہے۔ چونکہ انقلاب فرانس کے بعد سب سے زیادہ نفرت پوپ کے نمائندہ پادریوں کے ساتھ تھی۔ اسی لئے فرانس کے حکمران لبنان کے عیسائیوں سے ایک محبت کا رشتہ رکھتے تھے۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد یہ علاقہ فرانس کے حصے میں آیا تھا۔ لیکن جب جنگ عظیم دوم کے بعد عالمی طاقتوں کا سورج زوال کی طرف جانے لگا تو وہ اپنے زیر نگیں علاقوں کو چھوڑ کر اپنے ملکوں تک محدود ہوتے گئے۔ برطانیہ جس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا ایسے سمٹا کہ اب وہاں کئی کئی دن سورج نکلتا تک نہیں۔ فرانس اپنے ملک تک محدود ہونے لگا تو لبنان کے عیسائیوں نے عرب دنیا میں اپنے لئے ایک ملک کی خواہش کی جسے ایسے بندوبست کے ساتھ پورا کیا گیا کہ لبنان کی سلطنت تخلیق کر دی گئی ۔اس ملک میں عیسائی یوں تو 30 فیصد ہیں لیکن ان کے آئین میں یہ انتظام کیا گیا کہ یہاں کا صدر ہمیشہ ایک عیسائی ہوگا۔ مسلح افواج کا سربراہ بھی عیسائی اور وزارتِ خارجہ بھی انہیں کے پاس۔ اسمبلی کا سپیکر جو دوسرا بڑا عہدہ ہے وہ شیعہ مسلمانوں کے پاس اور وزیراعظم سُنی ہوگا جو چالیس فیصد تعمیر کی گئی عمارتوں اور ترک زمانے کی چند مساجد کے ساتھ ساتھ بہت سے گرجا گھروں کی وجہ سے باہر سے آنے والے سیاحوں کے لئے مرکز حیرت ہے ۔اس لئے کہ اسے موجودہ عرب اسرائیل بلکہ صرف اسرائیل اور لبنان کی جنگ میں اسرائیلی گولہ باری نے تباہ و برباد کر دیا تھا لیکن اس قوم نے اسے دوبارہ اُسی قدیم شان و شوکت سے آراستہ کر دیا۔ اسرائیل کے طیاروں کے نشانے اس قدر نپے تلے تھے کہ بیروت کے شمال کی جانب مسلمان اور جنوب میں پہاڑ کے دوسرے حصے پر عیسائی رہتے ہیں، لیکن کبھی کوئی گولہ بھول کر بھی اُس علاقے پر نہیں گرا۔ قدیم شہر جس کی ایک سڑک کو ہمارے لاہور کی فوڈ سٹریٹ کی طرح رات کو بند کر کے کھانے کی دکانوں کا بازار بنا دیا جاتا ہے وہاں سے گذرتے ہوئے اذان کی آواز نے حیرت میں ڈال دیا۔ گذشتہ چوبیس گھنٹوں میں اذان کی آواز کان میں نہیں پڑی تھی۔ ایسا ہی عالم مجھ پر تہران میں قیام کے دوران گذرا کہ کبھی کسی مسجد کے قریب سے، جو کہ تعداد میں بہت کم ہیں، گذرو تو اذان کی آواز کان میں پڑ جائے۔ بیروت کی اس مصروف سڑک پر جہاں نوجوان جوڑے ایک دوسرے سے لپٹے رات کے وقت سرد ہواؤں میں جھومتے پھر رہے ہیں یہ آواز یقیناً حیران کر دینے والی ہے۔ اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ اذان مسجد سے پچاس یا سو گز دور تک ہی سنائی دے۔ یہ مسجد سیّدنا عمرؓ ابن خطابؓ نے اپنے فلسطین کے سفر کے دوران تعمیر کروائی تھی۔ یہ سفر بھی تاریخ کا سنہری سفر ہے۔ اس پورے علاقے کا مرکز یروشلم تھا۔ محاصرے کے بعد عیسائیوں نے کہا، ہم خلیفہ کے یہاں آنے پر شہر اُس کے حوالے کریں گے۔ سیّدنا عمرؓ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ایک اونٹ اور غلام ساتھ، کچھ راستہ غلام سواری کرتا اور کچھ راستہ حضرت عمرؓ۔ جب شہر قریب آیا تو باری غلام کی تھی۔ غلام نے کہا آپؓ سوار ہو جائیں، لیکن شاید اللہ اپنے فیصلے کر چکا تھا۔ عیسائی راہبوں نے اور ان کے ستارہ شناسوں نے جو علامتیں ڈھونڈ نکالی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ اس شہر کی فتح ایسے شخص کے ہاتھ پر ہوگی جو خود پیدل اور غلام اونٹ پر سوار ہوگا اور شہر میں داخل ہوگا۔ ایسے ہی شخص کے استقبال کے لئے تاریخ جھک جایا کرتی ہے۔ پہلے مسجد میں داخل ہوا، اس قدر عظیم الشان مسجد اور ہماری لاہور کی بادشاہی مسجد کی طرح چند نمازی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کی کچی اینٹوں کی مسجد کو ترکوں نے دوبارہ تعمیر کیا۔ صلیبی جنگوں میں فتح کے بعد اسے عیسائیوں نے گرجا بنا دیا، پھر صلاح الدین ایوبی نے اس مسجد کو بحال کیا اور آج جو مسجد ہے وہ مسلمانوں کے اتحاد کی آخری یادگار سلطان عبدالحمید کے زمانے کی ہے۔ اسی کے زمانے میں عالمی طاقتوں نے مسلمانوں کے ملک کو کیک کی طرح کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک زبان، ایک علاقہ، ایک مذہب لیکن قطر اور بحرین جیسے چھوٹے چھوٹے ملک بنائے گئے تاکہ اس پوری اُمت کے ہاتھ میں اجتماعی طور پر تیل کی دولت نہ آجائے۔ سیّدنا عمرؓ کی اس مسجد کے نزدیک کھڑے مجھے وہ عالمی معاہدہ یاد آرہا تھا جس میں یہ طے ہوا تھا کہ ہم یروشلم کے عیسائی مسلمانوں کے خلیفہ کو یہ شہر ایک شرط پر دے رہے ہیں کہ یہاں پر یہودیوں کو اس شہر میں نہیں رہنے دیں گے۔
چودہ سو سال پہلے تحریر کردہ اس عالمی معاہدے کی جتنی دھجیاں عیسائی دنیا نے بکھیریں شاید کسی اور معاہدے کے ساتھ یہ ہوا ہو۔ میں آج صبح اسرائیل اور لبنان کی سرحد پر کھڑا خاردار تار کی دوسری جانب نہتے فلسطینیوں کو اسرائیل کے یومِ قیام پر احتجاج کرتے دیکھ رہا تھا اور پھر اچانک آنسو گیس، گولے، اور پھر فائرنگ شروع ہوئی۔ فلسطینی اپنے زخمی ساتھی کو اُٹھاتے، ایک طرف لے جاتے اور پھر نعرہ زن ہو جاتے۔ اس دن بارہ کے قریب نہتے اور معصوم شہید ہوئے۔ لبنان کی گلیوں، بازاروں میں گھومتے ہوئے دو چیزوں نے حیرت میں ڈالا، ایک ان کا بچہ بھی اسرائیل کو فلسطین کہتا ہے۔ یہ وہ ملک ہے جس نے اپنے سامنے صابرہ اور شطیلہ کی بمباری دیکھی ہے اور فلسطینی بچوں اور عورتوں کی لاشیں اُٹھائی ہیں۔ دوسرا جو بھی ملتا، اسے پتہ چلتا کہ میں پاکستانی ہوں تو ایک دم سوال کرتا کہ کیا اُسامہ بن لادن کو واقعی شہید کر دیا گیا۔ میں جواب گومگو میں دیتا۔ اکثر کا جواب صرف ایک ہوتا، امریکہ اور اسرائیل کے مظالم کے سامنے صرف وہی ایک شخص سینہ سپر تھا۔ جس قوم نے روز امریکی اور اسرائیلی بمباروں کے ہاتھوں لاشیں اُٹھائی ہوں، جن کے گھر برباد ہوئے ہوں، جن کے ہاں ہزاروں نہیں لاکھوں مہاجر فلسطینی غربت و افلاس میں ڈوبے ہوں انہیں اُسامہ بن لادن کی آواز میں بھی کشش محسوس ہوگی اور انہیں اُس کی موت کا دُکھ بھی ہوگا۔

"مرتبان میں بچھو"

بعض محاورے کسی صورت حال پر ایسے صادق آتے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے آج ہی کے حالات کو دیکھ کر خلق خدا کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہوں گے۔ آج جو محاورہ یاد آرہا ہے وہ ہے تو انگریزی کا لیکن چونکہ وہ ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا ہے جن کی سوچ، فکر، محبتیں، طرزِ زندگی، گھریلو ماحول یہاں تک کہ مفادات تک انگریزی اور انگریز سے وابستہ ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جسے اس برصغیر میں انگریز نے تخلیق کیا۔ ان میں تین طرح کے لوگ شامل ہیں، بیوروکریٹ، فوجی افسران اور سیاسی قیادت جو ان خاندانوں تک محدود ہے جسے برطانوی نوازشات نے امیر اور صاحبِ حیثیت بنا دیا۔ ایک زمانے تک یہ سب کے سب لاہور کی مال روڈ پر واقع ایک وسیع و عریض عمارت میں واقع ایچیسن کالج میں انگریزی تعلیم، برطانوی آداب معاشرت اور ویسی ہی اقدار و روایات کا درس حاصل کرتے تھے۔ اسے پہلے چیف کالج بھی کہا جاتا تھا۔ نوابوں، سرداروں، وڈیروں کی اولادیں لفظ لکھنا شروع کرتیں تو ان کے دل و دماغ میں تاجِ برطانیہ اور اُس سے وابستہ ہیرو ہی بسے ہوتے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کوئی سول سروس کا امتحان پاس کر کے بیوروکریٹ بن جاتا تو کوئی ملٹری اکیڈمی میں فوجی افسر بننے کی مشق شروع کر دیتا۔ چند ایک ایسے بھی ہوتے جو ان دونوں کی جانب نہ جانا چاہتے تو ان کے لئے برطانوی قانون کی بنائی ہوئی لیجی سلیٹو کونسلز، اسمبلیاں اور بنیادی جمہوریت کے ادارے موجود تھے جن میں یہ لوگ عوام کی نام نہاد نمائندگی کرتے ہوئے برطانوی آقاؤں کے مفاد کا تحفظ کرتے۔ گذشتہ سو سالہ تاریخ میں ان لوگوں کے شجرۂ نسب نکال کر دیکھ لیں، ان کی آپس میں رشتے داریوں کی تفصیل ملاحظہ کر لیں۔ یوں لگتا ہے ایک ہی خاندان کی تین لڑیاں ہیں جو آپس کی رشتے داریوں میں یوں پیوست ہیں کہ جیسے ہڈی کے ساتھ گوشت جڑا ہوتا ہے۔ یہ سب جن اداروں میں تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے اور آج بھی کرتے چلے آرہے ہیں ان میں آج بھی شدید گرمی کے عالم میں سوٹ اور ٹائی جسے ClosedColler کہا جاتا ہے، لازمی ہے۔ اس لئے کہ اسے مہذب لوگوں کا لباس سمجھا جاتا ہے۔ دورانِ تربیت اگر آپ فارغ اوقات میں کوئی لباس پہننا چاہیں تو وہ آدھی آستینوں کا نہیں ہونا چاہئے، کہ یہ بدتہذیبی ہے۔ اس طرح کے لباس کو SmartCasual کہا جاتا ہے۔ شام کی سرگرمیوں کے لئے کسی علاقائی کھیل کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔ ایسے کھیل جن سے افسرانہ شان و شوکت جھلکتی ہو، چاہے لان ٹینس ہو یا بیل بُرڈ، اور گالف کھیلنا تو افسری کی معراج ہے۔ یہ تمام ماحول آپ کو بیوروکریسی کی سول سروسز اکیڈمی سے لے کر سٹاف کالج تک اور فوج کی ملٹری اکیڈمی سے لے کر نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی تک ملے گا۔ لیکن اس سب سے بڑھ کر ناقابلِ فہم بات یہ ہے کہ ان تمام مقامات پر طوعاً کرہاً اور جبراً آپ کو انگریزی بولنا ہو گی۔ سوال انگریزی میں پوچھو، جواب انگریزی میں دو، کوئی اسائنمنٹ یا ٹرم پیپر ہے تو انگریزی میں لکھو، کوئی پالیسی بنانی ہے تو انگریزی میں بناؤ، اور اس انگریزی بول چال کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ہر کوئی مشکل سے، تردّد کے ساتھ انگریزی بولنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ پہلے ذہن میں فقرے سوچتا ہے، کبھی کاغذ پر لکھتا ہے اور پھر اسے بیان کرتا ہے۔ اگر کوئی انگریز یہاں گھس آئے تو اسے یہ سب ایک مزاحیہ ڈرامہ لگے۔ یوں لگتا ہے ان اداروں سے نکلنے کے بعد یہ افسران کسی برطانیہ کی کاؤنٹی میں جا کر نوکری کریں گے یا امریکہ کے کسی علاقے میں۔ چیف کالج تو ختم ہو گیا لیکن یہ تین نسلیں یا تین وسیع تر خاندان ابھی تک اُسی رنگ ڈھنگ اور چال ڈھال پر زندگی گذارتے ہیں اور عام آدمی سے اتنے ہی دور ہیں جتنے یہاں انگریز حاکم ہوا کرتے تھے۔ ان طبقات میں نووارد بھی آگئے، عام خاندانوں کے لوگ آگئے، لیکن ان کو ایسا اس بھٹی میں ڈال کر نکالا گیا کہ وہ باہر نکلے تو اپنے اردگرد بسنے والوں کو ہی انسان نہیں بلکہ حقیر قسم کے کیڑے مکوڑے سمجھنے لگے۔ سیاست میں بھی نووارد آئے لیکن انہوں نے ان لوگوں کے رنگ میں رنگتے ہوئے اپنا تمام مفاد اس ملک سے باہر وابستہ کر لیا۔ اولادیں ہیں تو باہر، جائیدادیں ہیں تو باہر، سرمایہ ہے تو انہی غیر ملکی آقاؤں کے ملک میں جن کے رنگ میں یہ لوگ رنگے ہوئے ہیں۔ گذشتہ دنوں مجھے یہ تحریر پڑھ کر اس قدر دکھ ہوا جس میں اُس تحقیق کرنے والے نے کہا تھا کہ پاکستان کے سیاستدانوں، فوجی اور سول افسران کے بچے مغرب میں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں اور پاکستان کے خلاف ہی نفرت اور غصے کا اظہار سب سے زیادہ وہی کرتے ہیں۔ پاکستان میں تو ہماری جان بھی محفوظ نہیں، وہ کوئی ملک ہے جہاں آدمی آزادانہ طور پر اپنی مرضی کی زندگی بھی نہیں گذار سکتا، یہ ملک بنا ہی غلط تھا، جاہلوں کی طرح رہنے والوں کا دیس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اولادیں وہاں جاتی ہیں تو پھر واپس نہیں آتیں، وہیں کسی بڑے عالمی ادارے یا حسبِ توفیق جگہ پر نوکری کرتی ہیں۔

البتہ سیاست کرنے، ووٹ مانگنے اور اقتدار میں آنے کے لئے پاکستان کا رُخ ضرور کرتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کے مفاد کا تحفظ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے عیب چھپاتے ہیں۔ اسی لئے میرے ملک میں کبھی کسی بڑے سانحے کی انکوائری سامنے نہیں آئی، اگر آئی بھی تو بے نتیجہ، کسی بڑی سازش، کسی بڑی کرپشن پر کوئی ایکشن نہ لیا گیا۔ بس عوام کے سامنے بیان بازی، نعرہ بازی اور غل غپاڑے کے سوا کچھ نہ ہو سکا۔

ان سب کے بارے میں جو انگریزی کا محاورہ آج یاد آرہا ہے وہ ہے "ScorpionsinaJar" یعنی ایک مرتبان میں بچھو۔ اگر مرتبان میں بہت سارے بچھوؤں کو جمع کر دیا جائے تو کوئی ایک دوسرے کو ڈنگ نہیں مارے گا کیونکہ اُس کو دوسرے کے ڈنگ اور زہر کا خطرہ ہوتا ہے۔ مرتبان میں بچھو دراصل اداروں میں ہم آہنگی کا دوسرا نام ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے خوفزدہ بھی ہے اور ایک دوسرے کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لئے اس ملک میں تیس ہزار لوگ دھماکوں سے مر جائیں، ڈرون حملوں سے انسانوں کے جسموں کے پرخچے اُڑ جائیں، ملک کی دولت لوٹ کر باہر پہنچا دی جائے، لوٹ مار اور کرپشن سے آدمی کا جینا بھر کر دیا جائے، امریکی فوجی آئیں، آپریشن کریں اور جس کو چاہیں اٹھا لے جائیں۔ کوئی بچھو اپنے مرتبان کے دوسرے بچھو کو نہیں کاٹے گا، کوئی انکوائری، تحقیق، کارروائی نتیجہ خیز نہیں ہو گی۔ یہ کل بھی ایسا تھا اور آج بھی ایسا ہے۔ لیکن انہیں شاید علم نہیں کہ ایک ایسا سیلاب ان کی زد میں ہے جس میں یہ مرتبان ڈوبا تو بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔ ایک ایسا آتش فشاں لاوا اُگلنے والا ہے جس میں نہ بچھو رہیں گے اور نہ ان کا زہر۔

زنجیریں ٹوٹنے والی ہیں

یہ سب لوگ ہمیں ڈراتے کیوں ہیں۔ انہیں خوف دلانے کے سوا آتا ہی کیا ہے۔ پیش گوئیوں کا ایک سلسلہ ہے جو چلا آرہا ہے۔ سب کی سب عذابوں کی۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے سیلاب آرہے ہیں، کوئی کہتا ہے لوگ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ کر عذاب کا شکار ہوں گے، ان لوگوں کی باتیں پوری بھی ہو جاتی ہیں، لوگ اور ڈر جاتے ہیں۔ یہ کیسے بزرگ ہیں۔ اللہ کے حضور دعا کیوں نہیں کرتے، گڑ گڑا کر ہمارے لئے بہتری کی درخواست کیوں نہیں کرتے۔ جن کو اللہ آنے والے حالات کے بارے میں تھوڑی بہت خبر دے دیتا ہے، وہ اتنے مقرب ہیں تو اللہ سے درخواست کریں کہ یہ ملک، عوام اور حکومت، سب ٹھیک ہو جائے۔ ہمیں امن سکون اور اطمینان میسر ہو جائے، ہمارے حکمران بہتر ہو جائیں۔ اگر انہیں ڈرانا ہی ہے، خوف ہی دلانا ہے تو پھر رہنے دیں، جو بزرگ دعا سے ہماری حالت تبدیل نہیں کروا سکتا ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔

ایسے سوالات کا سامنا مجھے روز کرنا پڑتا ہے۔ عام لوگوں سے ملتے ہوئے بھی، اپنے خطوط دیکھتے ہوئے بھی اور ای میل پڑھتے ہوئے بھی۔ بلکہ اب تو میرے بہت ہی عزیز کالم نگار دوستوں نے بھی لکھنا شروع کر دیا ہے کہ یہ ڈرانا بند کرو اور درخواست کرو ان بزرگوں سے کہ ہمارے لئے دعا کریں۔ یہ قوم تو ٹھیک ہوتی نہیں، اب دعا ہی ان کے حالات بدل سکتی ہے۔ یہ سب مجھے اس لئے سننا پڑتا ہے کہ میرے ذمے جو ایک ڈیوٹی لگائی جاتی ہے کہ دیکھو لوگ ایک ایسے راستے پر چل نکلے ہیں جس کے آگے ایک بہت بڑی کھائی ہے۔ انہیں خبر دار کر دو، اور میں ان احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے ان چند سطور میں بیان کر دیتا ہوں۔ ورنہ اللہ گواہ ہے کہ نہ تو میری نگاہ میں کوئی کمال ہے اور نہ ہی میں بصیرت کے ادنٰی ترین مقام کے قریب بھی ہوں۔ میں تو ہر لمحے اس فکر میں لگا رہتا ہوں کہ میرے اعمال کے خزانے کا حصہ بالکل خالی ہے، گناہوں اور نافرمانیوں کی ایک طویل فہرست اس بوجھ میں اضافہ کرتی ہے۔ معلوم نہیں کہ میں اپنے اللہ کے غیظ و غضب سے کیسے بچ سکوں گا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے اس رحمٰن اور رحیم کے دامن کو آج تک نہیں چھوڑا اسی لئے میری اُمید کا باب بھی روشن ہے۔ اُس عربی شاعر کی طرح جس نے ایک شعر میں کہا تھا۔ " مجھے قیامت میں اپنی بخشش کا مکمل یقین ہے کہ میرے جیسے گناہگار کو بخشنے سے ہی تو پتا چلے گا کہ اللہ کتنا بڑا رحمٰن و رحیم ہے " اس لئے نہ مجھ میں کوئی کمال ہے، نہ ہنر اور نہ ہی کسی بزرگی کا دعویٰ۔ بس ایک کرم ہے کہ جو میرے مالک کی جانب سے مجھ پر بیش بہا ہے کہ اتنے سارے لکھنے والوں میں سے اُس کے برگزیدہ صاحبانِ حال جو کبھی بھی اپنے آپ کو دنیا کے سامنے نہیں لاتے۔ اکثر کہتے ہیں کہ اگر ہمارا راز کھل گیا تو ہماری نااہلی تو پکی ہو گئی۔ ایسے لوگ جب کسی خبر کو لوگوں کی بہتری کے لئے کھولنا چاہتے ہیں تو مجھے حکم کر دیتے ہیں اور میری حیثیت اُس ہرکارے یا ڈاکیے کی طرح ہے جسے نہ اعلان کی حکمت کا پتہ ہوتا ہے نہ خط میں لکھی گئی تحریر کا علم، بس اُس کا کام بات یا تحریر کو پہنچا دینا ہوتا ہے۔

اس لئے مجھے ان سوالوں کا جواب دینے یا ان لوگوں کے خدشات دور کرنے کی نہ تو حیثیت ہے اور نہ ہی میں اس کا ذمہ دار۔ لیکن کبھی کبھی اعلان کرنے والے کو لوگ غصے میں آکر پیغامات پہنچا دینے کے لئے بھی کہتے ہیں۔ ہرکارہ پیغام پہنچا دیتا ہے اور اگر غصہ زیادہ ہو تو کہہ دیتا ہے، بس اب میں اعلان نہیں کروں گا، لوگوں نے اس کا مذاق بنا لیا ہے۔ میں نے بھی ایسے ہی جا کر بتا دیا۔ کہ اب یہ سب مذاق بن گیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر آپ اتنے ہی بزرگ ہو تو دعاؤں سے اس ملک کو ظالموں سے نجات کیوں نہیں دلاتے۔ مسکرا دیئے، کہنے لگے ایسے سوال پتہ ہے کس قوم نے کئے تھے۔ میں نے سوچا اور بتایا کہ ہاں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے۔ وہ جن پر اللہ نے من و سلویٰ اُتارا۔ جنہیں عالمین میں فضیلت دی۔ جن پر ہمیشہ بادل سایہ کئے رہتا تھا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا، اگر ان لوگوں سے لڑنا ہے تو تم اور تمہارا اللہ جا کر لڑے، اگر جیت گئے تو ہم تمہارے ساتھ ہوں گے " اس کے بعد اتنا بولے کہ اس کے بعد بنی اسرائیل پر جو بیتی بتا دیں، میں خوف سے کانپ اُٹھا۔

حیرت کی بات ہے کہ دعاؤں سے اس ملک کی تقدیر بدلنے کے لئے وہ لوگ کہتے ہیں کہ جو بیٹوں کو امتحانات کی تیاری کے لئے ہزاروں روپے کی ٹیوشن رکھ کر دیتے ہیں، اچھے سکولوں میں داخل کراتے ہیں، پھر رات کو ان کے لئے دعا کرتے ہیں یا انہیں امتحان سے پہلے کوئی دعا پڑھنے کے لئے دیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی نہیں ایسا کیا کہ بچے کو کہہ دیں کہ کتاب بند کر کے سو جاؤ، میں دعا کروں گا، اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔ دوسرا سوال ایسے لوگوں کی جانب سے ہوتا ہے جو معجزات کی تلاش میں رہتے ہیں اور اللہ نے ہمیشہ ایسے لوگوں کو ڈرایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات طلب مت کرو، ورنہ تم پر عذاب لازم ہو جائے گا، اگر تم پھر بھی ایمان نہ لاؤ گے۔ ایک اور سوال ہوتا ہے کہ اگر محنت کر کے ہی آگے بڑھنا ہے تو پھر دعا کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں شاید اندازہ نہیں، اپنے ارد گرد دیکھ لیں۔ ایک ہی کاروبار کئی سو لوگ کر رہے ہوتے ہیں اور چند کے کاموں میں برکت ہوتی ہے۔ کتنے لوگ ہیں، جو ذہین بھی ہوتے ہیں، اعلیٰ صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں لیکن کامیابیاں ایک عام سے علم رکھنے والے کے مقدر میں آتی ہیں۔ یہاں سے تقدیر اور قسمت کا کھیل شروع ہوتا ہے جسے صرف اور صرف دعا بدل سکتی ہے۔ لیکن ایسے میں اللہ کا وہ کلیہ نہیں بدلتا کہ " اللہ نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی جسے خود اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو " اور اللہ کے کلیے، قاعدے کے خلاف نہ دعا قبول ہوتی ہے اور نہ کوئی صاحبِ نظر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتا ہے۔

کتنے خوش قسمت ہیں ہم لوگ کہ ہم کھائی میں گرنے جا رہے ہیں اور ہمیں خبر دار کیا جاتا ہے، لیکن ہم ہیں کہ مسلسل گرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم خوش قسمت اس لئے بھی ہیں کہ ہم میں کچھ گروہ ایسے بھی موجود ہیں جن کے چہرے اللہ کی غیرت کے نام پر سُرخ ہو جاتے ہیں اور اللہ کو ان کی قربانیوں اور ان کے جذبات کی حیاء ہے۔ اس لئے اس مملکت خداداد پاکستان جو میرے پیارے رسول ﷺ کی محبتوں کی امین ہے اور جس کے خلاف آج پوری دنیا متحد ہو رہی ہے اور وقت اُس خطے کو ایک ایسی جنگ کی طرف لے کر بڑھ رہا ہے جہاں شاید میرے نبی ﷺ کے ارشاد کے مطابق " کفر ایک واحد ملت ہے " کے مطابق اکٹھی ہو رہی ہے۔ ایسے میں اس قوم کو جس قسم کی قیادت کی ضرورت ہے، جس قسم کے ایمان اور اتحاد کی ضرورت ہے، وہ اتحاد صرف میدان میں اُترنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ دعائیں کرنے والے ہاتھ اور گڑ گڑا کر رونے والی آنکھیں دست بہ دُعا ہیں۔ نعمت شاہ ولی کی پیش گوئیوں کے دن قریب ہیں۔ یہ جنگ جو ہم پر مسلط ہونے والی ہے، صاحبانِ نظر کی نگاہیں ایک ایسے آدمی کو دیکھ رہی ہیں جو بہت جلد اس قوم کی اُمیدوں، دعاؤں اور خواہشوں کا مرکز بننے والا ہے۔ اس لئے کہ آئندہ معرکے میں ایسے ہی سپہ سالار کی ضرورت ہے، ایسے ہی قائد کا انتظار ہے، خوشخبری کے دن آنے والے ہیں۔

اقبال نے بہت پہلے اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔

می رسد مردے کہ زنجیرِ غلاماں ب سکند

دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

(وہ آدمی آرہا ہے جو غلاموں کی زنجیریں توڑ دے گا۔ میں اُسے قید خانے کی دیواروں کے روشن دان سے دیکھ رہا ہوں) زنجیریں ٹوٹنے والی ہیں، امریکی غلامی کی، عالمی دجّالی نظام سے مقابلے کے دن آرہے ہیں۔ رسول اللہ کی حدیث کے مطابق مسلمان تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ جو میدان سے بھاگ جائیں گے، اللہ ان کی توبہ کبھی قبول نہیں کرے گا۔ ایک گروہ شہادت پائے گا اور ایک گروہ فتح حاصل کرے گا۔ اللہ ہمیں اس گروہ کا ساتھ نصیب کرے جو اُس کے ہاں مقبول ہوں۔

اُسامہ بن لادن کا خوف

وہ جب تک زندہ رہا، برطانوی افواج کے دلوں میں اُس کا خوف تھر تھراتا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلم اُمہ کے علاقوں پر یورپی اقوام بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں تھیں۔ برصغیر پران کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا اور سیّد احمد شہید کی تحریک ابھی عہد طفولیت میں تھی۔ برطانوی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس تاج برطانیہ کو للکار نے والا ایک شخص سوڈان کی سنگلاخ سرزمین میں ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکا تھا۔ اُس نے اپنی سرزمین پر اللہ کی حاکمیت اور خلافت الٰہیہ کا نعرہ بلند کیا۔ سب سے پہلے اُسے بادشاہوں کی طرح حکومت کرنے والے اور نام کے مسلمان مصری حکمرانوں سے لڑنا پڑا۔ یہ وہ حکمران تھے جو عالمی طاقتوں کے سامنے سربسجود ہو چکے تھے۔ ان پر فتح نے برطانوی طاقتوں کو تیخ پا کر دیا۔ پہلے تو انہوں نے وہاں پر محصور مصری افواج کو نکالا اور پھر فروری 1884ء میں جنرل گورڈن کو اس شخص کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔ یہ عجیب شخص تھا، صحرا میں رہتا تھا، نہ محل نہ سکریٹریٹ، لیکن انگریزی استعمار کے خلاف جہاد اُس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ مارچ 1884ء میں پہلی ہی جنگ میں برطانوی افواج کے شانہ بہ شانہ اُس کے ساتھ لڑنے والی مصری افواج نے آہستہ آہستہ اپنے کمانڈروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ بمشکل تمام وہ اس سوڈان میں موجود پچیس سو برطانوی باشندوں کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ گورڈن کی مدد کے لئے وولزلی کو بھیجا گیا۔ وہ اس وقت مصر میں موجود برطانوی افواج کا سربراہ تھا۔ صحراؤں اور میدانوں میں جنگیں ہوئیں۔ وہ خرطوم تک جا پہنچے لیکن 28 جنوری 1885ء میں اُس صحرا نشین شخص کی افواج جب شہر میں داخل ہوئیں تو برطانوی افواج کے پورے گیرژن کی لاشیں سڑکوں اور محل کی سیڑھیوں پر بکھری پڑی تھیں۔ جنرل گورڈن کا کٹا ہوا سر فٹ بال کی طرح لڑھک رہا تھا۔ وولزلی کی افواج نے بھاگ کر سمندری جہازوں میں پناہ لی تو آگ کے گولے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس ذلت آمیز شکست کے بعد اس صحرائی مجاہد محمد احمد مہدی سوڈانی نے شرعی قوانین نافذ کیے اور شرعی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورے عالم اسلام میں مرعوب اور شکست خوردہ مسلمان مغربی تعلیم اور مغربی لباس میں اپنی شناخت گم کرنے کو عافیت سمجھتے تھے۔ مہدی سوڈانی کو بدنام کرنے کے لئے برطانوی آقاؤں کے وفادار مولویوں نے کفر کے فتوے لگائے۔ ان فتووں میں ایک فتویٰ یہ بھی شامل تھا کہ جہاد صرف حکومت وقت ہی کر سکتی ہے کسی ایک شخص کو تنظیم بنا کر جہاد کرنے کا کوئی حق نہیں، خواہ حکمران مغربی آقاؤں کی غلامی میں اپنے آقاؤں سے بھی سو قدم آگے نکل چکے ہوں۔ یہ شخص جس کو اس زمانے کی سب سے بڑی عالمی طاقت برطانیہ شکست دینے کا خواب دیکھتی تھی، 22 جون 1885ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ اس کے انتقال کے چار سال بعد مارچ 1889ء میں لارڈ کچنر کی سربراہی میں برطانوی افواج نے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن مہدی سوڈانی کا خوف اس قدر تھا کہ سب سے پہلے اُس کی قبر کھودی گئی۔ اُس کی لاش کو نکال کر جلایا گیا اور راکھ دریائے نیل میں بہادی گئی تاکہ کل کو لوگ اس شخص کے مزار کو عقیدت کے طور پر اپنا مرکز نہ بنالیں اور پھر وہاں سے سوڈان کے لوگ ایک دفعہ پھر شرعی نظام کے نفاذ کے لئے متحد نہ ہو جائیں۔ مہدی سوڈانی کا خوف آج بھی مغرب کے دلوں میں ویسے ہی بسا ہوا ہے۔ اسی لئے جب امریکہ نے پوری دنیا میں آبادی کے کنٹرول کا پروگرام شروع کیا اور اُس کے لئے مسلمانوں کو مفت مانع حمل ادویات فراہم کرنا شروع کیں تو جارج مارشل کے پلان کے مطابق سی آئی اے کی پالیسی اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی قومی سلامتی کی یادداشت نمبر NSSN200 میں تحریر ہے کہ "سیاہ فام افریقیوں میں اسلام کی اپیل قدرتی ہے۔ اسلام بھائی چارے کا مذہب ہے اور مغربی افریقہ میں محمڈن ازم کا ایک بہت بڑا جتھا بھی موجود ہے اور ساحلی علاقوں کے نیگروں کی روز افزوں تعداد اسلام قبول کر رہی ہے۔ ہمیں ایک اور سیاہ فام مہدی کے ظہور سے چوکنا رہنا چاہئے۔ یہ سب لوگ مل کر ایک قومی حکومت بنا سکتے ہیں اور یہ 25، 30 ملین جنگجو لوگ سارے سیاسی ڈھانچے کو اتھل پتھل کر دیں گے" مہدی سوڈانی کا یہ خوف تھا کہ جب اُس کی قبر کھودی گئی، لاش جلا کر دریا کے سپرد کر دی گئی اور اُس کی کھوپڑی کو لارڈ کچنر نے دوات کے طور پر استعمال کیا تو اپنے زیر نگیں علاقوں میں اپنے کاسہ لیس علماء اور بکاؤ لکھنے والوں کے ذریعے اُسے تخریب کار، کافر، مرتد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ بہت کم ایسے تھے جو مہدی سوڈانی کی لاش کی بے حرمتی پر سراپا احتجاج ہوئے، سوائے ان لوگوں کے جو اُسے برطانوی استعمار کے خلاف اللہ کی حاکمیت کے نفاذ کا علمبردار سمجھتے تھے۔ اسی لئے جب لارڈ کچنر سمندر میں ڈوب کر مرا تو ظفر علی خان نے زمیندار میں تحریر کیا۔

حضرتِ مہدی کی تھیں جس نے جلائی ہڈیاں
حق نے آبِ شور میں اُس کی جلائی ہڈیاں

آج مہدی سوڈانی کو انتقال کیے 126 سال ہو چکے ہیں اور خوف ہے کہ دلوں سے جاتا ہی نہیں۔ لیکن اُسامہ بن لادن کو اللہ کے حضور اپنی جان کا نذرانہ پیش کیے چند دن بیتے ہیں۔ یہی دلیل ہے کہ ہم دفن اس لئے نہیں کر رہے کہ اُس کے مزار سے کوئی تحریک جنم نہ لے لے۔ جس شخص کی میت دکھانا امریکہ کی سلامتی اور سیکورٹی کے لئے خطرے کا باعث ہو، اُس کا خوف کتنی دیر تک امریکہ کے دلوں میں بستا رہے گا۔ شاید کئی نسلیں اس خوف سے کانپتی رہیں۔

مہدی سوڈانی ہو یا جنوبی امریکہ کا چی گویرا، دونوں کی لاشوں کی بے حرمتی کی گئی۔ چی گویرا کی لاش کو ہیلی کاپٹر سے لٹکا کر دکھایا گیا۔ اس وقت ان لوگوں کو خوف کے عالم میں شہید نہیں کہا جاتا تھا لیکن آج چی گویرا کی تصاویر دنیا کے ہر خطے میں محبت سے آویزاں ملیں گی اور مہدی سوڈانی کا نام جس عزت و تکریم سے لیا جاتا ہے اُس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ تاریخ بتاتی ہے کہ کون عزت کی موت مرا، کس نے ظلم اور زیادتی کے خلاف لڑتے ہوئے شہادت حاصل کی اور کون تھا جو ظالموں کے ساتھ تھا، کس نے فتوے دیئے اور کس نے ظلم کو جائز قرار دیا۔ اس وقت بھی برطانیہ کے ظلم کو جائز قرار دینے والے دانشور موجود تھے اور آج عراق، افغانستان اور فلسطین پر ظلم و بربریت اور درندگی کا جواز دینے والے اہل علم کی بھی کمی نہیں۔ ایسے لوگوں کے نام تاریخ نے پہلے بھی ردّی کی غلیظ ٹوکری میں پھینک دیئے اور زندہ اُن کا نام رکھا جو استعمار کے خلاف کھڑے تھے، جن کا خوف آج بھی مغرب میں آباد ظالموں کی نیند حرام کر دیتا ہے۔ تف ہے ہم پر کہ لاشوں اور قبروں میں سوئے ہوئے لوگوں سے خوفزدہ اقوام کے سامنے ہم ایسے جھک جاتے ہیں جیسے اس کائنات کا فرمانروا اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نہیں بلکہ یہی طاقتیں ہوں۔

کندن بننے کے دن آرہے ہیں

صرف تین دن قبل مجھے ایک صاحبِ حال نے فون کیا، بہت پریشان تھے، کہنے لگے ایک ایسے صاحب کے پاس بیٹھا ہوں جو بہت کم اخفائے راز کرتے ہیں۔ بس اپنی روز مرہ کی زندگی میں مصروف رہتے ہیں۔ اپنی عبادات بھی ایسے وقت اور اس طریقے سے ادا کرتے ہیں کہ لوگوں پر ان کے زہد و تقویٰ کا رعب نہ پڑے اور مخلوق کے سامنے کہیں ان کا پردہ نہ کھل جائے۔ اس لئے ان کی زبان پر کبھی ایسے لفظ ادا نہیں ہوئے جن سے معلوم ہو کہ ان کی آنکھ عالمِ حیرت میں کیا کچھ دیکھتی ہے۔ البتہ اگر وہ ایسے لوگوں کے درمیان ہوں جو ان کے مقام اور مرتبہ سے واقف اور رازوں اور بھیدوں کے امین ہیں تو کبھی کبھی ان کے منہ سے عالمِ پریشانی میں کوئی فقرہ ضرور نکل جاتا ہے۔ فون کرنے والے صاحب نے مجھے کہا کہ آج انہوں نے ایک ایسا جملہ بولا ہے کہ خوف کے عالم میں میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ میں نے سوال کیا تو آواز رندھ گئی اور بولے، کہہ رہے تھے پاکستان کے ساتھ وہی کچھ ہونے والا ہے جو بغداد میں ہوا تھا۔ پھر کہا کہ وہ اُس سے اسے لکھ دے۔ ان صاحب کی بات سن کر میں حیرت میں تھا کہ وہ التجاء پر اتر آئے۔ خدا کے لئے لکھیے کہ لوگ اللہ کی طرف پلٹ آئیں، ایک دوسرے کا گلہ نہ کاٹیں۔ میرے کالم کا دن ابھی دور تھا اور دوسرا میں ایک دنیا پرست شخص کی طرح اسباب و علل پر غور کرنے لگ پڑا۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ امریکہ خود افغانستان میں شکست سے دوچار ہو رہا ہے۔ اُس کو وہاں سے بھاگنے کی جلدی ہے۔ بھارت اپنے اندر کی تحریکوں سے نبرد آزما ہے۔ ایک ایٹمی طاقت دوسری سے کیسے لڑائی کا خطرہ مول لے سکتی ہے۔ پھر صرف پندرہ دن پہلے گوجر خان میں پروفیسر احمد رفیق اختر کے ہاں رات گئے حاضری پر گفتگو چل نکلی تو ان کی زبان سے ادا لفظ بھی ذہن میں گونجنے لگے۔ کہتے تھے یوں لگتا ہے وہ آخری جنگ جس میں دجال کی آمد اور پھر سیّدنا مہدی اور حضرت عیسیٰ کے ظہور کی بات ہے، قریب آچکی ہے۔ عرب دنیا کے ہر ملک میں اُٹھنے والی تحریکیں، وہاں پر حکومتوں کا زوال اور امریکہ سے نفرت، یوں لگتا ہے ان سارے حالات کو دیکھتے ہوئے، جس دن سعودی عرب میں حالات ابتری کی طرف گئے، امریکہ دنیا کے تیل اور توانائی کے تحفظ کے لئے مقاماتِ مقدسہ پر حملہ کر دے گا۔ یہاں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث سنائی کہ دجال مدینے کی طرف بڑھے گا لیکن اُس میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ مدینہ کے سات دروازوں پر فرشتے پہرہ دے رہے ہوں گے۔ پھر کہا دیکھو اس وقت مسجد نبوی اس قدر وسیع کر دی گئی ہے جتنا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مدینہ تھا اور آج اس مسجد نبوی کے سات دروازے ہیں۔ میں نے سوال کیا کب تک، کہنے لگے کہ وقت تو صرف اللہ کو معلوم ہے لیکن اندازہ کہتا ہے کہ یہ سب دو سالوں کے اندر ہو جائے گا۔ پھر مکاشفاتِ دانیال کے حوالے سے گفتگو کرتے رہے کہ یہ حصہ بائیبل میں اس لئے نہیں چھیڑا گیا کہ اس میں آنے والے دنوں کے بارے میں حضرتِ دانیال کی پیشین گوئیاں تھیں۔ میں نے واپسی پر مکاشفاتِ دانیال کھولے، شاہِ شمال کی جنوب کے ممالک سے جنگ اور اُس کی گردباد کی طرح حملہ آور ہونے کی باتیں پڑھیں، مجھے اصفہان میں وہ یہودی بھی یاد آگئے جو حضرتِ دانیال کے مزار کے پاس آج بھی آباد ہیں۔ سیّد الانبیاء ﷺ کی وہ حدیث بھی ذہن میں گونجی کہ دجال اپنے مقام سے نکل کر اصفہان آئے گا اور وہاں سے ستر ہزار یہودی اُس کا ساتھ دیں گے۔

کیا یہ سب کچھ اتنا قریب ہے۔ ہم بغداد کیسے بن سکتے ہیں۔ میں کیا لکھوں۔ لوگ اسے دیوانے کی بڑ سمجھیں گے۔ دور کی کوڑیاں ملانے والا کہیں گے۔ لیکن میں اس لمحے تحیر کے سمندر میں ڈوب گیا جب اسامہ بن لادن کے ایبٹ آباد میں جاں بحق ہونے کی خبر اور امریکی ہیلی کاپٹروں اور کمانڈوز کے ایکشن کے ساتھ اوباما کی غرور اور نخوت میں ڈوبی ہوئی تقریر سامنے آئی۔ نیویارک کے ٹائمز اسکوائر میں جشن مناتے ہوئے لوگ، دنیا بھر میں خوشی کی لہر، پاکستان کے کاسہ لیس حکمرانوں کی طرف سے فتح کا اعلان۔ پھر اُسامہ کی لاش کو سمندر کے سپرد کرنے کی خبر۔ سب کچھ واضح ہوتا گیا۔ کسی ملک پر حملے یا کسی جنگ کے آغاز سے پہلے یہ امریکہ کی میڈیا مہم کا آغاز تھا۔ یہ دس سال بعد ایک اور گیارہ ستمبر ہے، ایک اور نائن الیون۔

آپ حیران ہوں گے کہ پوری دنیا کا میڈیا صرف ایک شخص کی زبان پر یقین کر کے خبر کو مصدقہ بنا کر یا تو جشن دکھا رہا ہے، یا گیارہ ستمبر میں مرنے والوں کے اہلِ خانہ کے تاثرات۔ کوئی سوال نہیں کرتا، اسامہ کی لاش کہاں ہے، کس مقام پر پڑی تھی۔ صدام کے بیٹوں کی لاشیں تو پوری دنیا کو دکھائی گئیں، اُس کے ڈی این اے لینے کی کاروائی بھی کیمروں کے ذریعے براہِ راست ٹیلی ویژن سکرین پر آرہی تھی۔ لیکن کسی اسامہ کے بارے میں کسی مغربی ٹی وی نے یہ سوال نہیں اُٹھایا۔ یہ سوال اُس وقت بھی نہیں اُٹھائے گئے تھے جب کولن پاول نے اقوامِ متحدہ میں دو سو ملکوں کے نمائندوں کے سامنے جھوٹ بولا تھا کہ عراق کے پاس کیمیائی ہتھیار ہیں۔ یہ سوال اُس وقت بھی نہیں پوچھے گئے تھے کہ افغانستان جہاں نہ ٹیلی فون کا نظام ہے نہ بجلی اور انٹرنیٹ وہاں سے بیٹھ کر ایک شخص نیو یارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کیسے منظم کر سکتا ہے۔ ان سوالوں کو صرف کمزور لوگ اُٹھاتے ہیں۔ چیختے چلاتے ہیں اور پھر ایک دن انہی کی سرزمین پر حملہ کر دیا جاتا ہے اور وہ کچھ نہیں کر پاتے۔

یہ سوال اب ہم سے بھی کریں گے لیکن کوئی نہیں سنے گا۔ ہم چیختے رہیں گے۔ دنیا بھر کا میڈیا صرف ایک ہی کہانی بیان کرے گا۔ کہ پاکستان کے ہر بڑے شہر سے القاعدہ کا کوئی بڑا رہنما گرفتار ہوتا ہے۔ اُس کا سربراہ تو ایسے شہر سے ملتا ہے جو ایک سو سال سے ایک آرمی گیریژن کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسامہ کی موت سے کئی ہفتے پہلے تجزیہ نگار یہ خبریں شائع کرنا شروع کر چکے تھے کہ دہشت گردوں کے خلاف اگلا معرکہ پاکستان ہی ہوگا اور جنرل پیٹریاس کی یہ خواہش ہے۔ ہیلری کلنٹن کا بیان کہ ہم دہشت گردوں کے خلاف ان کے خاتمے تک جنگ جاری رکھیں گے۔ بس چند دن کی بات ہے، حالات کھل کر سامنے آنے لگیں گے۔

میں اوبامہ کی تقریر سن رہا تھا اور مجھ پر تین دن پہلے بتائے گئے اُس درویش کے فقرے کی حقیقت واضح ہو رہی تھی کہ پاکستان بغداد بننے والا ہے۔ آنے والا منظر نامہ ہمیں اُس بڑی جنگ کی طرف لے کر جا رہا ہے جس کے بارے میں اس خطے سے لوگ اللہ کے دین کے غلبے کے لئے اُٹھیں گے۔ سوچتا تھا کیسے ممکن ہوگا۔ یہ بکھری ہوئی قوم کیسے متحد ہوگی۔ قومیں اُسی وقت متحد ہوتی ہیں۔ ایک ساتھ کھڑی ہوتیں ہیں جب ان پر کوئی بڑی قوت حملہ آور ہو یا بڑی آفت آن پڑے۔ صف بندیاں ہو چکیں ہیں۔ قوم کو کٹھالی میں ڈال کر کندن بنانے کا وقت آگیا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس نے کٹھالی میں پڑ کر اور افتاد برداشت کئے بغیر ترقی کی ہو، ایک قوم بن کر نہ اُبھری ہو۔ معرکے کی گھڑی ہے، بشارتوں کے دن ہیں۔ اگر ہم اگلا بغداد ہیں تو پھر کسی بے غیرت سے بے غیرت شخص میں بھی یہ کہنے کی جرأت نہ ہوگی کہ امریکہ جو ہم پر حملہ آور ہے وہ حق پر ہے، دہشت گردوں کو مار رہا ہے۔

ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

ایسے گمنام لوگوں کے لئے کون قلم اُٹھاتا ہے۔ یہ لوگ تو وہ بنیادی اینٹیں ہوتے ہیں جن پر ساری عمارت تعمیر ہوتی ہے لیکن وہ لوگوں کی آنکھ سے اوجھل رہتی ہیں۔ لیکن یہ شخص تو اتنا گمنام بھی نہیں تھا۔ وہ لوگ جو میری نسل سے تعلق رکھتے ہیں یا مجھ سے پہلے والی نسل سے، انہوں نے اسے پاک ٹی ہاؤس، لاہور کے ایک کونے میں اپنی ایک مخصوص نشست پر بیٹھے ضرور دیکھا ہوگا۔ لیکن اب لاہور کی اس خوبصورت ٹھنڈی سڑک جسے مال روڈ کہتے ہیں، اس پر گذرنے والے کسی شخص کو روک کر پوچھیں کہ پاک ٹی ہاؤس کہاں ہے تو وہ حیرت سے آپ کا منہ دیکھنے لگے گا۔ ہم دنیا کے ان چند بدنصیب ملکوں میں سے ایک ہیں جہاں کتابوں کی جگہ جوتوں کی دکانیں، لائبریریوں کی جگہ کھانے پینے کے بازار، اور پاک ٹی ہاؤس کی جگہ گاڑیوں کے ٹائروں کی دکان کھل جاتی ہے۔ ابھی تک اس عمارت کے اوپر پاک ٹی ہاؤس وہ پرانا بورڈ آویزاں ہے جس پر بڑے بڑے انگریزی حروف میں اس کا نام لکھا ہے۔ لیکن شاید ہی کسی نے غور کیا ہو کہ اس بند دروازے پر یہ اتنا بڑا بورڈ اور تھڑے پر گاڑی کے ٹائروں کا ڈھیر، یہ سب کیا ہے۔ لیکن شاید ہمیں فرصت نہیں۔ نیلا گنبد اور وائی ایم سی اے والے اس چوراہے پر ہر کسی کو جلد از جلد اشارہ کھلنے پر سفر طے کرنے کی جلدی ہوتی ہے۔

لیکن وہ جواب اس سڑک پر گذرتے ہوئے بیتے ہوئے ایام کو یاد کر کے ایک سرد آہ سی بھر کر رہ جاتے ہیں، انہیں اس جگہ پر آباد شام کی یاد بہت ستاتی ہوگی۔ یہ 70 کی دہائی کا آغاز تھا جب میں نے گجرات کے ایک پُرسکون سے قصباتی شہر میں شاعری اور افسانہ لکھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں اس ملک میں اتنے ادبی رسائل شائع ہوتے تھے کہ شاید اتنے اخبار بھی نہ ہوں۔ کوئی بڑا اخبار ایسا نہ تھا جس میں ادبی ایڈیشن موجود نہ ہو۔ شہروں کی کوئی گلی محلّہ ایسا نہ تھا جس میں ناولوں، رسالوں اور کتابوں کی کرائے پر دینے والی دکانیں جنہیں لائبریری کہا جاتا تھا، موجود نہ ہوں۔ ہر کوئی اپنی پسند اور شوق کے مطابق وہاں سے ایک رات یا دو رات کے لئے کتاب کرائے پر لے جاتا۔ نسیم حجازی سے لے کر رضیہ بٹ اور سلمیٰ کنول سے لے کر ابن صفی کے جاسوسی ناولوں تک ہر قسم کا ناول و افسانہ وہاں مل جاتا۔ ذرا سنجیدہ قسم کے پڑھنے والوں کے لئے منٹو، کرشن چندر، بیدی اور عصمت چغتائی کی کتابیں بھی ان کرائے والی لائبریریوں میں موجود ہوتیں۔ گجرات جیسا شہر بھی اپنے خاموش ماحول میں ایک سو سے زیادہ لائبریریوں کا وجود رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ میونسپل کمیٹی کے سبزہ زار میں ایک بہت بڑی لائبریری بھی تھی جسے انگریز ڈپٹی کمشنر کنگ نے بنایا تھا۔ اسی لئے اُسے کنگ لائبریری کہتے تھے۔ چھوٹے شہروں کے لوگ جن کا لکھنے پڑھنے سے تعلق ہوتا وہ لاہور کے ادبی ماحول کو ایک حسرت بھری نگاہ سے دیکھتے اور اپنے ہی شہر میں بیٹھے دل ہی دل میں مرعوب ہو جاتے۔ اسی کنگ لائبریری میں گجرات کے حلقۂ اربابِ ذوق کے اجلاس ہوتے۔ کونسا ایسا بڑا ادیب ہے جو لاہور سے ان اجلاسوں میں شریک ہونے نہیں آیا۔ کیا سادگی اور خوبصورتی کا زمانہ تھا کہ احمد ندیم قاسمی کے ساتھ خالد احمد، امجد اسلام امجد اجلاس کے لئے گجرات آئے تو ہم ان کو جی ٹی روڈ پر لاہور کی بس میں چڑھانے کے لئے آئے، وہاں مرحوم گلزار وفا چوہدری کی فقرہ بازی کی زد میں کتنی بسیں گذر گئیں تو قاسمی صاحب نے یاد دلایا کہ ہمیں لاہور بھی جانا ہے۔

لاہور کے اس ادبی مرکز سے رشتہ یک طرفہ نہ تھا۔ کبھی کبھی حلقۂ اربابِ ذوق کے اجلاس میں چھوٹے شہر کے ادیبوں کو بھی اپنی تخلیقات پیش کرنے کا موقع مل جاتا۔ جہاں پر موجود سراج منیر اور افتخار جالب جیسے افراد کی حوالہ جاتی تنقید اس کے پرخچے اُڑا دیتی۔ پاک ٹی ہاؤس، حلقۂ اربابِ ذوق اور اس شخصیت جس کا ذکر میں نے کیا، جو آج ہم میں نہیں، سے میرا تعارف 1973ء کی ایک شام ہوا۔ مجھے حلقۂ اربابِ ذوق میں پہلی دفعہ اپنا افسانہ پڑھنا تھا۔ صدارت مرحوم اشفاق احمد کی تھی۔ گجرات سے بس میں سوار ہو کر لاہور آنا، پھر لاہور میں بس پہ سوار ہو کر مال روڈ پر پاک ٹی ہاؤس اور پھر میرا تعارف پاک ٹی ہاؤس کی اس مخصوص نشست پر بیٹھے اسرار زیدی سے ہوا۔ ٹی ہاؤس کا ہال جہاں ختم ہوتا وہاں سے ایک سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جاتیں، ان سیڑھیوں کے ساتھ زیدی صاحب کی کرسی ہوتی۔ یہ وہ واحد میز تھی جس پر ہر کسی نووارد کو خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ ورنہ سب لوگوں کی کرسیاں اور میزیں الگ الگ تھیں۔ یہ انتظار حسین، زاہد ڈار، احمد مشتاق کی میز ہے تو یہ افتخار جالب، شاہد محمود، ندیم اور فہیم جوزی کی میز۔ کشور ناہید اور یوسف کامران اپنا حلقۂ اثر خود بنا لیتے۔ ٹی ہاؤس کے باہر بھی ایک ہجوم ہوتا۔ جہاں کبھی کبھی چائنیز لنچ ہوم سے حبیب جالب اپنے ساتھیوں کے ساتھ آ کھڑا ہوتا۔ اسی فٹ پاتھ پر کھڑے ادیبوں سے میں نے آج کے دور کے سب سے بھرپور شاعر اقبال ساجد کو اپنی شام کی ضروریات کے لئے متاعِ عزیز جمع کرتے دیکھا ہے۔ ہر کسی کا اپنا اپنا حلقۂ اثر ہوتا اور کوئی اس مخصوص گفتگو کے دائرے میں مشکل ہی سے داخل ہوتا۔ لیکن اسرار زیدی صاحب کی میز وہ واحد جگہ تھی جہاں دور دراز کے مضافاتی علاقوں کے ادیب آ بیٹھتے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس ٹی ہاؤس کا حصہ بن جاتے۔ میں لاہور پڑھنے آیا تو پھر میری شام اسرار زیدی صاحب کی اسی میز کے آس پاس گذرنے لگی۔ زیدی صاحب غزل کے دلدادہ تھے اور میں کبھی افسانہ لکھتا، نظم اور کبھی غزل، لیکن زیدی صاحب مجھے شاعری کرنے اور خصوصاً غزل لکھنے کو کہتے۔ یہ وہ دن تھے جب نثری نظم کا شہرہ تھا اور مبارک احمد جس سے میری یاد اللہ گجرات سے چلی آ رہی تھی اس تحریک کا سرخیل تھا۔ دوسری جانب استعاراتی افسانے نے ایسا زور پکڑا کہ کوئی کہانی لکھتا ہی نہ تھا۔ زیدی صاحب کو اس بات کا بہت قلق تھا لیکن مجال ہے ان کی میز پر بیٹھنے والے کسی استعاراتی افسانہ یا نثری نظم لکھنے والے کے ساتھ تعلقات کی گرمجوشی میں کمی آئے۔ مبارک احمد کی تو جائے پناہ ہی وہ میز تھی۔ زیدی صاحب ایک اور کام کرتے۔ ہر ہفتے کو لاہور کا ادبی منظر نامہ اخبارِ جہاں میں لکھتے۔ یہ منظر نامہ میرے کوئٹے کے زمانے میں میرا لاہور سے سب سے اہم رابطہ تھا۔ انہیں میری شاعری کرنے کی اتنی خوشی تھی کہ جب 88 میں میری شاعری کی پہلی کتاب "قامت" آئی تو انہوں نے اخبارِ جہاں میں ایک طویل مضمون لکھ ڈالا۔ یہ الگ بات کہ میں نوکری، ٹی وی ڈرامہ نگاری اور پھر کالم نگاری میں ایسا اُلجھا "کہ شاعری کی دوسری کتاب نہ آ سکی۔ وہ جب ملتے ایک ہی سوال کرتے، اب چھپوا بھی لو کتاب، کافی تو لکھ لیا ہے قامت" کے بعد۔

تہذیبیں اُجڑتی ہیں تو سب سے پہلے ادارے ویران ہوتے ہیں، پھر ایک ایک کر کے بڑے لوگ ان اداروں کا رونا روتے، آہیں بھرتے قبر میں جا سوتے ہیں۔ کس کو یاد ہوگا کہ لاہور کی مال روڈ پر ٹولنٹن مارکیٹ کے سامنے اخباروں کے کھوکھے پر کھڑے رسالے پڑھتے لوگ، پنجاب پبلک لائبریری کا ہجوم، چائنیز لنچ ہوم پر سیاسی ادیبوں کی محفلیں، پاک ٹی ہاؤس کا ادبی ہائیڈ پارک، وائی ایم سی اے کی بلڈنگ میں حلقۂ اربابِ ذوق، لارڈز ہوٹل جہاں آج کل تقی مارکیٹ ہے وہاں شام ڈھلے اس شہر کے ماڈرن پڑھے لکھے لوگوں کا ہجوم، انڈس ہوٹل کی صحافتی سرگرمیاں جہاں میں پہلی دفعہ عباس اطہر کو ملا جنہیں میں صرف شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ انارکلی سے لے کر واپڈا ہاؤس تک اتنی کتابوں کی دکانیں تھیں مگر اب ان کی جگہ کھانوں کپڑوں اور جوتوں کی دکانوں نے لے لی ہے۔ یہ سب کا سب ویران ہو چکا ہے۔ یہ منظر نامہ جن لوگوں کی آنکھوں میں محفوظ تھا وہ بھی اُٹھتے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کل جب اس شہر کی تزئین و آرائش کرنے والے یہاں آئیں، ٹائروں کی دکان پر پاک ٹی ہاؤس کا بورڈ دیکھیں۔ حیرت سے کہیں کہ یہ بورڈ یہاں کس نے لگا دیا۔ بورڈ اترے، کسی کباڑیے کی دکان کی زینت بنے اور شہر کے چہرے سے یہ بدنما داغ بھی مٹا دیا جائے۔

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی

تم اپنی تاریخ محمد بن قاسم سے کیوں شروع کرتے ہو۔ تمہارے ہیرو محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کیوں ہیں۔ یہ سب اس دھرتی پر لوٹ مار کرنے آئے تھے۔ ہماری تہذیب کو تباہ کرنے۔ یہ تغلق، خلجی، لودھی، سوری اور مغل سب باہر سے آئے ہوئے تھے جن کے ناپاک قدموں سے یہ دھرتی تباہ و برباد ہوئی۔ امن کا گہوارہ یہ علاقہ غلام ہو گیا۔ تم سب جھوٹ بولتے ہو کہ یہاں مسلمان رہتے ہیں۔ یہ صدیوں سے بلوچوں، سندھیوں، پنجابیوں کا وطن ہے۔ یہ ہماری دھرتی ماں ہے۔ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ کئی ہزار سال پرانی، مہر گڑھ، موئن جوڈاڑو اور ٹیکسلا کے کھنڈر اس کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ جب پوری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اس دھرتی پر خوبصورت شہر آباد تھے۔ جن میں اپنے زمانے کی جدید ترین سہولیات میسر تھیں۔ ان تہذیبوں کے کھنڈر بتاتے ہیں کہ وہ کس قدر شاندار اور عظیم تھیں۔ ہم سب اُس دریائے سندھ کی تہذیب کے بیٹے ہیں۔ ہم ان فاتحین اور لٹیروں کی تاریخ کو نہیں مانتے۔

یہ اور ایسے کئی سوالات اس سرزمین پاکستان پر اُس وقت سے پوچھے جا رہے ہیں جس دن سے یہاں کے رہنے والوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مسلمان راجپوت اور ہندو راجپوت، سکھ جاٹ اور مسلمان جاٹ، بدھ گورکھا اور مسلمان گورکھا الگ الگ ہیں، خواہ ان کی رگوں میں ایک ہی خون دوڑتا ہو، وہ ایک ہی زبان بولتے ہوں، ایک ہی طرح کا لباس پہنتے ہوں اور ایک ہی طرح کے کھانے کھاتے ہوں بس زبان سے ادا کیے گئے چند الفاظ جنہیں کلمۂ طیبہ کہتے ہیں، چچازاد، ماموں زاد، خالہ زاد حتیٰ کہ سگے بھائی کو بھی ایک دوسری قوم میں لا بٹھاتے ہیں۔ جس دن اس بنیاد پر یہ ہندوستان کی دھرتی ماتا تقسیم ہوئی اور میرے ملک پر اللہ کے نام کی تختی لٹکا دی گئی، اسی دن سے ایسے سوالات کرنے والے دانشوروں نے ہڑپہ، مہر گڑھ اور موئن جوڈاڑو کے کھنڈرات تک اپنے شجرہ ہائے نسب پہنچا دیئے۔

لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو اس دھرتی ماتا سے پانچ ہزار سال پر انا رشتہ استوار کرتے ہیں اور محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کو لٹیرا ثابت کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے آباء و اجداد کا کوئی تعلق اس دریائے سندھ کی تہذیب سے رہا ہو۔ سب کے سب خواہ راجپوت ہوں، آرائیں ہوں، بلوچ ہوں، سندھی ہوں، جاٹ ہوں، پنجابی ہوں، پشتون ہوں، اس سرزمین پر لٹیروں کی طرح وارد ہوئے، یہاں پر آباد ہڑپہ اور موئن جوڈاڑو کی تہذیب کو انہوں نے تباہ و برباد کیا، بلکہ یہاں کے پُر امن باشندوں کو اس علاقے سے "دھکیل کر جنوب کی وندھیا پہاڑوں کے سلسلے سے بھی پیچھے پھینک دیا اور خود اس دھرتی کے مالک بن گئے اور اس دھرتی ماں" کے بیٹے۔

آئیں ذرا تاریخ کے جھروکے میں جھانک کر دیکھیں کس نے سب سے پہلے سندھ کی تہذیب کو برباد کیا اور اُس نسل سے کون کون ہے جو سندھ، پنجاب، بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں آباد ہے۔ دریائے سندھ کے آغاز یعنی شمالی علاقہ جات سے سمندر تک جو خوبصورت تہذیب یہاں آباد تھی جس کے آثار بھارت کے گجرات تک جا ملتے ہیں، اسے تہس نہس کرنے کے لئے سب سے پہلے آریائی اقوام وسط ایشیاء سے دندناتی یہاں وارد ہوئیں۔ ان کا اپنی دھرتی ماتا یعنی وسط ایشیا سے اتنا ہی مضبوط رشتہ تھا کہ جب اُس نے جانوروں کے لئے گھاس اور انسانوں کے لئے پانی دینا چھوڑ دیا، وہ اُس ماتا پر لعنت بھیج کر اس ماتا یعنی سندھ دھرتی کو فتح کرنے آ گئے۔ کتنا بودا اور کچا ہوتا ہے یہ زمین اور وطنیت کا رشتہ۔ یہی وہ آریائی اقوام ہیں جن کی نسل سے اس وقت اس سرزمین پر اکثریت برادریاں اور قبیلے آباد ہیں۔ سب نسل، زبان، اور خون کے حوالے سے آریائی اثرات رکھتے ہیں۔ یہ آریائی اقوام 517 قبل مسیح میں یہاں آباد ہوئیں اور انہوں نے یہاں کے رہنے والوں، اس دھرتی کے بیٹوں کو مار بھگایا یا شودر بنا کر ذلت کی زندگی پر مجبور کر دیا۔ اُس کے بعد 326 قبل مسیح میں آتش پرست ایرانی آئے، آج ان کی بھی نسلیں یہاں آباد ہیں اور اس دھرتی کی وارث ہیں۔ پھر سکندر کی افواج آئیں اور ان کی ان پرانے فاتحین سے جنگ ہوئی اور یونانی تہذیب کی گونج۔ اس کے بعد 120 سال تک یہاں موریا حکومت کرتے رہے جو ایرانیوں اور یونانیوں کے اختلاط سے جنم لینے والی قوم تھی۔ یہ 185 قبل مسیح تک آباد رہے۔ ان کی نسلیں بھی یہاں موجود ہیں۔ اسی طرح بہت سے ایسے قبائل جو یونانی ہندی میل جول سے بنے تھے وہ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے 405 عیسوی تک یہاں راج کیا اور اپنی نسلیں بھی چھوڑیں۔ پھر باکتریا سے کشان آئے۔ اپنے ملک سے دھکیلے گئے لیکن یہاں راج کرنے لگے۔ ان کے زمانے میں اس دھرتی پر ایران اور وسطی یورپ سے ہزاروں قبیلے آ کر آباد ہوئے۔

یہ تاریخ بہت طویل ہے اور یہاں پر آباد نسلوں کے شجرہ ہائے نسب اگر نکالے جائیں تو وہ کسی نہ کسی لٹیرے، فاتح یا بیرونی حملہ آور سے جا ملتے ہیں۔ پہلے والے نے کہا یہ میری دھرتی ماں ہے، دوسرے والے نے اُس پر قبضہ کیا اور پھر اسے اپنی ماں بنا کر یہاں آباد ہو گیا۔ بلوچ شام کے شہر حلب سے آ کر آباد ہوئے اور یہ کوئی زیادہ دُور کی بات نہیں، آریاؤں سے بعد کی بات ہے، لیکن سب کو اپنا رشتہ مہر گڑھ سے جوڑنا ہے، سیّد ہو، مرزا ہو، افغان ہو، راجپوت ہو، آرائیں ہو، جاٹ یا کوئی اور سارے کے سارے اس دھرتی پر یا تو فاتحین کی اولاد ہیں یا پھر بہت سے فاتحین کے میل ملاپ سے جنم لینے والی نسلیں ہیں۔ اس کے باوجود بھی سب یہی کہتے ہیں کہ ایک محمد بن قاسم ہی لٹیرا تھا۔ ہم تو اس دھرتی ماں کے بیٹے ہیں۔ سب کو محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی جنگیں یاد آتی ہیں۔ آریاؤں کا وہ ظلم یاد نہیں کہ یہاں پر آباد نسلوں کی نسلوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ سب کو اورنگ زیب کا بھائیوں کو قتل کرنا یاد ہے لیکن اشوک کے نوے بھائی قتل کر کے بادشاہ بننا اور کلنگا کی جنگ میں دس لاکھ انسانوں کی لاشوں کے پہاڑ بنانا یاد نہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس علاقے پر قبضہ کوئی چین سے آ کر کرے، وسطی ایشیاء سے، یونان سے یا ایران سے تو تہذیب کا حصہ اور اگر کوئی کلمۂ طیبہ پڑھتا ہوا آئے تو لٹیرا، بیرونی حملہ آور۔

جس کو اپنی نسل، رنگ اور زبان پر فخر ہو اُسے بھی اپنے ہیرو منتخب کرنے کا حق ہے اور جس کو اپنے عقیدے پر فخر ہو اُسے بھی اپنے ہیرو دل میں بسانے کا اختیار۔ لیکن جو مسلمان آباء و اجداد کی اولاد ہیں، کلمۂ طیبہ پڑھتے ہیں اور رشتہ اُس تہذیب سے جوڑتے ہیں جس کو ان کے آباء و اجداد نے تباہ و برباد کیا تھا تو حیرت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنے آپ کو کسی دوسری قوم کا بتائے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے (بخاری، کتاب المناقب) اور قوم کی تعریف میرے رسول ﷺ نے کر دی۔ ابو لہب سگا چچا، بنو ہاشم کا فرد لیکن اُس کا نہ میرے رسول ﷺ سے کوئی تعلق اور نہ ہی اُس کی اُمت سے۔

کرپشن کے جیون ساتھی

اس مملکت خداداد پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ایک علاقہ ایسا ضرور ملے گا جہاں اُس شہر، صوبے یا ملک پر حکومت کرنے والے افسران کے عالی شان دفاتر ہوں گے۔ یہ دفاتر کبھی سہولیات کے اعتبار سے اس ملک کی عام آبادی سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے تھے۔ دھوپ میں جھلستا ہوا شخص جس کسی اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت، کسی ایس پی یا ڈی سی کے کمرے یا سیکریٹریٹ میں کسی بڑے افسر کے حضور حاضر ہوتا تو زیادہ سے زیادہ ایک بڑے سائز کے پنکھے کی ہوا اُسے ایک دم تھوڑا سا سکون دیتی۔ ایک قدیم قسم کی میز جس پر سبز رنگ کا ایک اونی سا کپڑا پڑا ہوتا اور معمولی سا قلمدان۔ صاحب کی کرسی بھی کوئی زیادہ مختلف نہ ہوتی۔ ارد گرد یا تو سادہ سی کرسیاں ہوتیں یا پھر اُسی طرح کے بید کی چھال سے بنے ہوئے صوفے۔ دربان ہوتے لیکن کمروں کے دروازے اکثر کھلے ہی رہتے، کھڑکیاں ہوا کی آمدورفت کے لئے عموماً کھول دی جاتیں۔ لیکن آج یہ سب کچھ بدل چکا ہے۔ آج سب کچھ دبیز قالینوں، خوبصورت پردوں، ایئر کنڈیشنوں، غیر ملکی فرنیچر اور شاندار ماحول میں تبدیل ہو چکا ہے۔ آج اگر کوئی سائل اپنے گاؤں سے بس پر بیٹھ کر شہر آئے، پھر شہر میں آکر کسی رکشا، تانگہ یا پھر شہر کی بس میں سوار ہو کر افسر کے دربار میں پہنچے تو پہلے تو بند دروازوں اور دبیز پردوں والی کھڑکیوں کے پیچھے سے اُسے کچھ نظر ہی نہیں آئے گا کہ اندر صاحب موجود ہے یا نہیں، اس لئے اُسے دربان کی زبان پر یقین کرنا پڑے گا۔ اگر وہ کہہ دے کہ اندر بہت اہم میٹنگ چل رہی ہے، صاحب کام کر رہا ہے یا پھر صاحب کمرے میں نہیں ہے تو پھر اُس کے ارمانوں پر اوس پڑ جائے گی۔ ایسے میں اس ماحول نے اُسے ایک راستہ دکھایا ہے۔ دربان کی مٹھی گرم کرو اور اندر داخل ہو جاؤ۔ جتنا بڑا افسر ہو گا اتنی ہی زیادہ بڑی سطح کی مٹھی گرم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی دربان کی سطح پر کام چل پڑتا ہے تو کبھی صاحب کا پی اے یہ کام کروا دیتا ہے۔ لیکن بعض اوقات بڑے صاحب تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کتنے اور لوگوں کے گھروں کے طواف کرنے پڑتے ہیں۔ جتنا بڑا صاحب اتنی بڑی تگ و دو۔ یہ لوگ صاحب کے عزیز ترین دوست کہلاتے ہیں۔ اکثر اوقات تو وہ ان کے بچپن کے جگری یار ہوتے ہیں، کوئی ان کی بیوی کا بھائی بنا ہوتا ہے تو کوئی ان کا یارِ غار۔ ایسے لوگ اکثر بڑے افسروں کی زندگی میں ایک بار داخل ہوتے ہیں اور پھر وفادار "جیون ساتھی" کی طرح عمر بھر ساتھ رہتے ہیں۔ صاحب نے گھر بنانا ہے، پلاٹ کا بندوبست کیسے ہو، نقشہ کیسے بنے، آرکیٹکٹ کہاں سے آئے، ٹھیکیدار کون ہو، صاحب کی بیوی کی فرمائش کے مطابق گھر کی تزئین و آرائش کس طرح کی جائے۔ صاحب ان سب چیزوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ "جیون ساتھی" سینے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں آپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح صاحب کے بچوں نے اسکول میں داخلہ لینا ہو، اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر جانا، ان کی شادی یا منگنی ہو، صاحب کے گھر والوں کو ملک سے باہر چھٹیاں گذارنی ہوں، انہیں کسی قسم کے تردّد کی ضرورت نہیں۔ کبھی کبھی صاحب اس کو ان ضروریات کے بارے میں بتا دیتا ہے لیکن اکثر یہ جیون ساتھی اتنا مزاج آشنا ہوتا ہے کہ صاحب کی بیوی، بیٹوں، بیٹیوں کے منہ سے بات نکلنے سے پہلے ان کی خواہشیں پوری کر دیتا ہے۔

کرپشن کے یہ "جیون ساتھی" وہ لوگ ہوتے ہیں جو اِس ملک کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے عہدیدار سے وابستہ ہوتے ہیں۔ آپ نے کوئی صحیح یا غلط کام کروانا ہے۔ آپ روز دفتروں کے چکر لگائیں گے۔ آپ کی فائل ایک دفتر سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں گھومتی رہے گی۔ آپ کبھی ایک کمرے میں فریاد لے کر جائیں گے اور کبھی دوسرے۔ اور یوں آپ عمر کا ایک حصہ اسی ایک کام میں صرف کر دیں گے۔ آپ کو طرح طرح کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بعض اوقات تو آپ نے ایک طرح کے اعتراضات کے جواب میں کچھ کاغذات جمع کروائے ہوں گے اور معاملہ یوں لگے گا کہ اب ٹھیک ہو چکا ہے لیکن اسی افسر کے دماغ سے دوسری طرح کے اعتراضات برآمد ہونا شروع ہو جائیں گے۔ لیکن اگر آپ کو اپنے اس کام کے سلسلے میں صحیح آدمی کا علم ہو جائے، آپ اُس کے حضور حاضر ہوں اور اُس کے دربار میں نذرانے کے روپے نچھاور کریں تو کام صرف چند لمحوں میں ہو جائے گا اور آپ کو اِس "مرشد" کی کرامت پر یقین آ جائے گا۔

ایک زمانہ تھا کہ کرپشن کے یہ "جیون ساتھی" صرف بڑے افسروں تک محدود ہوتے تھے اور باقی افسران یا اہل کار یا تو براہِ راست اپنی قسمت آزمائی کرتے یا پھر ان کے دفاتر کے باہر بہت سے "خدائی خدمتگار" گھوم رہے ہوتے جو یہ کام چند سو روپوں کے عوض بخوبی سرانجام دیتے۔ آپ نے لائسنس بنوانا ہے، زمین کی فرد نکلوانی ہے، گاڑی کے کاغذات رجسٹرڈ کروانے ہیں، پاسپورٹ بنوانا ہے، یہاں تک کہ یونیورسٹی یا بورڈ سے اپنا رزلٹ کارڈ یا سند حاصل کرنی ہے، آپ کو ان خدائی خدمتگاروں کی خدمات میسر ہو جاتی تھیں۔ یہ لوگ آپ کو بار بار دفتروں کے چکر، ایک دفتر سے دوسرے دفتر اور ایک میز سے دوسری میز پر فائل کے گھومنے سے بچاتے، افسروں کی ڈانٹ اور دربان کی پھٹکار سے محفوظ رکھتے۔ لیکن اب ان خدائی خدمتگاروں کا رزق بھی ان "جیون ساتھیوں" نے چھین لیا ہے۔ اب اہلکار خواہ پٹواری ہو یا تھانیدار، ہر کسی کا کوئی عزیز ترین دوست یا منہ بولا بھائی ضرور موجود ہوتا ہے جو لوگوں کے مسائل کا علاج تیر بہدف طریقے سے کر دیتا ہے۔ اسی لئے یہ سب افسران جب محفلوں میں بیٹھتے ہیں، لوگوں کے سامنے معاشرے میں بددیانتی کا رونا روتے ہیں تو کتنے آرام سے اللہ کی قسم اُٹھا کر کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے آج تک اپنے ہاتھوں کسی سے ایک پیسہ رشوت نہیں لی، اب ہم بھی اسی معاشرے میں رہتے ہیں، لوگ ہمیں تنگ کرتے ہیں، خاندان کا دباؤ ہوتا ہے، سیاسی پریشر بھی ہوتا ہے، اس لئے جائز ناجائز کام تو کرنے پڑتے ہیں۔ یہ تو ہماری نوکری کی مجبوری ہے۔

ان کے اس سارے گورکھ دھندے سے الگ کوئی شخص اگر آزادانہ طور پر اور ایماندارانہ طور پر کام کرنا چاہے تو یہ اُس کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔ اس کی زندگی حرام کر دیتے ہیں۔ ایک شخص نے ایک ہوٹل بنانے کا ارادہ کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس ملک میں ہر کام ایمانداری سے کروں گا۔ لیکن اُسے نقشہ پاس کرانے، بجلی کا کنکشن لینے، پانی اور سیوریج کی لائن وغیرہ، ایکسائز کی طرف سے سرٹیفکیٹ، سب جگہ رشوت دینی پڑی۔ اس نے سکھ کا سانس لیا کہ اب کوئی نہیں آئے گا۔ اتنے میں ایک شخص آیا، کہا میں ماحولیات کا افسر ہوں۔ اپنے چولہے چیک کراؤ۔ اور ماحولیات خراب کرنے کے جرم میں انہیں بند کر دیا۔ پیسے دیئے پھر سوچا اب کون آئے گا۔ ٹریفک والا ان کے ہوٹل کے سامنے کھڑا ہو گیا اور ذرا سی پارکنگ پر چالان کرنے لگا۔ آخر میں بس ایک "جیون ساتھی" کو تلاش کیا جو ایک وزیر سے لے کر ایک پٹواری تک سب کا منہ بولا بھائی تھا۔ معاملہ درست ہو گیا۔ لیکن اس کرپشن کے بازار میں ان لوگوں نے ایک بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ پہلے صرف ان کے دفاتر الگ ہوتے تھے۔ یہ رہتے عام گلی محلوں میں تھے۔ اب گذشتہ تیس سالوں میں انہوں نے اپنے علاقے، اپنی کالونیاں اور اپنے ڈیفنس علیحدہ کر لئے ہیں۔ ایسا دنیا کے بہت کم ممالک میں ہوتا ہے۔ لیکن انہیں اندازہ نہیں کہ جب اس ساری بددیانت کرپشن اور ظلم سے تنگ آئی ہوئی مخلوق ایک طوفان کا رخ اختیار کرے گی تو ان کو اپنی منزل کتنی آسان لگے گی۔ ان کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر کہاں جا کر غیظ و غضب میں آئے گا۔ وہ جو سب سے الگ، سب سے جُدا روشن گھروں اور روشن علاقوں کے مکین ہیں۔

تاریخ کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں

کیا حیرت انگیز اور عجیب و غریب آدمی تھا۔ ایسا لگتا ہے اُس کی بے چین طبیعت نے اُسے دنیا کے ہر میدان میں طبع آزمائی پر مجبور کیا۔ کوئی اُسے مورّخ کے طور پر جانتا ہے تو کوئی ڈرامہ نگار کی حیثیت سے، کوئی اُسے مفکر اور فلسفی کہتا ہے تو کوئی اُس کی وجۂ شہرت سفارت کار کے طور پر بیان کرتا ہے۔ لیکن اُس کے یہ تمام کارنامے اور شخصیت کے تمام پہلو تاریخ کے بہت بڑے ذخیرے میں یوں گم ہو چکے ہیں جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ لیکن اگر کوئی اُس کو یاد کرتا ہے یا اگر اُس کا نام زندہ ہے تو ایک ایسی کتاب کے خالق کے طور پر زندہ ہے جو بنیادی طور پر ایک غیر اخلاقی اور بے لاگ کتاب ہے۔ غیر اخلاقی اس لئے کہ اُس نے ہوسِ اقتدار اور حکومت کرنے، اُسے قائم رکھنے اور عوام الناس کو بے وقوف بنانے کے تمام گُر اس کتاب میں درج کر دیئے ہیں۔ اس کتاب کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اقتدار کسی قسم کی اخلاقی حدود و قیود کا پابند نہیں ہوتا۔ اسے قائم رکھنے کے لئے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے اور یہ اقتدار کی اخلاقیات کے لئے جائز ہے۔

دنیا کو یہ کریہہ اور غیر اخلاقی نظریہ دینے والے کا نام نکولو میکاولی ہے جسے عموماً میکاولی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ اٹلی کے خوبصورت شہر فلورنس میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ ایک معمولی وکیل تھا۔ آمدنی کے اعتبار سے ان کا گھرانہ درمیانے درجے کا تھا۔ وہ خود بھی ایک سرکاری ادارے میں نچلے عہدے پر تعینات تھا اور اُس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ فلورنس میں گھر لے سکے۔ اس لئے وہ شہر سے دس میل دور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ لیکن اُسے تاریخ سے اس قدر دلچسپی تھی اور اُس کی ذہانت اس بلا کی تھی کہ وہ چند برسوں میں ایک بہترین تاریخ دان کے طور پر جانا جانے لگا۔ اُس کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنے عہد کے ہر واقعے اور ہر سیاسی ادارے کی تشبیہ کسی قدیم تاریخی واقعے میں ڈھونڈ نکالتا اور لوگ اس حیرت انگیز مماثلت پر حیران رہ جاتے۔ اُس نے قانون پڑھنا شروع کیا لیکن اسے اپنے لئے بہتر خیال نہ کیا کیونکہ اس کی نظر سیاست کے میدان پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ 1498ء میں صرف 29 سال کی عمر میں مجلس برائے جنگ کا سیکرٹری ہوا اور پھر وہ چودہ برس تک اسی عہدے سے منسلک رہا۔ اس عہدے نے اُس پر دنیا کے بہت سے دروازے کھول دیئے۔ وہ 1500ء میں ایک سفارتی مشن کا رکن تھا جس نے فرانس کے بادشاہ سے ملاقات کی۔ پھر وہ کچھ عرصے بعد وہیں سفیر مقرر ہو گیا۔ اُس نے فرانسیسی زبان سیکھی اور بادشاہ کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ اس سفارت کاری کی وجہ سے اُس کی شہرت اس قدر بڑھی کہ جب وہ واپس فلورنس لوٹا تو اُس کا ڈنکا ایک بہترین سفارت کار کے طور پر ہر طرف بج رہا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اٹلی پر بورجیا کی حکومت تھی جو اپنے مخالفین کو گھیر کر مارتے یا انہیں قید میں اذیتیں دینے پر خوش ہوتا تھا۔ بلکہ اس خوشی پر جشن منایا کرتا تھا۔ میکاولی کو بورجیا کی صورت میں ایک ہیرو مل گیا۔ ورجن بھر آمروں کا تختہ اُلٹنے والا، ظلم و جبر سے امن و امان قائم کرنے والا، ایک ایسا شخص جس کے سامنے صرف اور صرف اقتدار تھا۔ نہ خیر و شر کا کوئی تصور اور نہ نیکی اور بدی۔ یہی وہ دور تھا جب اُس کے اپنے ملک میں اقتدار تبدیل ہوا۔ میکاولی کو سفارت کاری سے ہٹا کر قید کر دیا گیا۔ تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اُسے رہ رہ کر اپنے شہر فلورنس کے جمہوری بادشاہ پر غصہ آتا کہ اُس نے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے لوگوں کو دبا کر کیوں نہ رکھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو آج بھی اقتدار میں ہوتا۔ یہی سوچ تھی جس نے میکاولی کو ایک ایسی کتاب لکھنے پر مائل کیا جس نے اُس کے بعد آنے والے ڈکٹیٹروں اور جمہوری آمروں سب کے لئے رہنمائی فراہم کی۔

اُس کا فلسفہ حیران کن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عوام کو دھوکے بازی، چوری، ظلم اور قتل پر سزا دو۔ لیکن حکومت قائم رکھنے کے لئے یہ سب کام جائز ہیں۔ آپ دھوکہ اور فراڈ بھی کریں، روپیہ اور خزانہ بھی لوٹیں اور ظلم بھی روا رکھیں۔ کیونکہ اصل مقصد تو حکومت کو قائم رکھنا ہے۔ اس نے کہا کہ امن و امان اور سکون شہریوں کو بزدل اور ناکارہ بنا دیتا ہے۔ بلکہ وہ انہیں حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی جنگ اور بدامنی کو ایک قومی ٹانک کے طور پر جاری رکھنا چاہیے۔ اس سے قوم متحد اور منظم ہوتی ہے۔ میکاولی کا یہ وہ فلسفہ ہے جس کے تحت دنیا کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کا بنیادی اصول بدل دیا گیا۔ دنیا اس سے پہلے حکومت کا ایک مقصد اور ایک اصول متعین کرتی تھی۔ اور وہ یہ کہ حکومت کا اوّلین کام انصاف کی حکمرانی یعنی (writofjustice) قائم کرنا ہوتا ہے جس سے لوگ امن و سکون سے رہیں۔ ان کے درمیان انصاف سے فیصلے ہوں۔ صرف مجرم کو سزا ملے۔ لیکن میکاولی کے بعد اصول بدل دیا گیا۔ اب اصول یہ ہو گیا کہ (writofgovernment) یعنی حکومت کی حکمرانی قائم کی جائے۔ اس کے لئے بے گناہوں کا خون بہانا پڑے، کمزوروں کو مارنا پڑے، انسانوں کو غائب کرنا پڑے، امن قائم کرنے کے لئے شہروں کے شہر برباد کرنا پڑیں، سب جائز ہے۔

یہ آج کے دور کا قانون ہے اور یہی میرے ملک پر 60 سال سے راج کر رہا ہے۔ اس لئے مجھے بالکل حیرت نہ ہوئی جب آریانہ فلاچی نے لکھا کہ مجھے ذوالفقار علی بھٹو کی لائبریری میں میکاولی کی کتاب سب سے نمایاں اور سب سے قیمتی جلد میں نظر آئی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب بلوچستان کے علاقوں میں عام انسانوں کا خون بہا کر حکومت کی رِٹ قائم کی جا رہی تھی۔ آپ جامعہ حفصہ میں گھن گرج سے گولے برسائیں یا اکبر بگٹی کی غار پر، شمالی وزیرستان میں گھس جائیں یا سوات اور باجوڑ میں۔ میکاولی کے اصولوں کے مطابق سب جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش اور بلوچستان میں فوجی آپریشن کا نگران جنرل ٹکا خان جب ریٹائر ہوتا ہے تو اس ملک کی سب سے بڑی سیاسی جمہوری پارٹی اُسے سب سے بڑے صوبے کا گورنر لگا دیتی ہے۔ آخر حکومت کی رِٹ قائم کرنے کا کچھ تو انعام ملنا چاہیے تھا۔ لیکن شاید اب دنیا انصاف کی رِٹ سے ناآشنا ہو گئی ہے۔ بڑے ملک چھوٹے ملکوں پر رِٹ قائم کرتے ہیں اور حکمران عوام پر۔ تاریخ کا اپنا انداز ہوتا ہے یاد رکھنے کا۔ جس نے جو بویا ہو، وہی کاٹتا ہے۔

فالِ بد راتست ہر جامی روی

بدترین حاکم، ظالم بادشاہ، فرعون صفت حکمران یا علاقے فتح کر کے لوگوں کا مال لوٹنے والے فاتحین اگر اپنی افواج کو ترتیب دیتے، اپنے ہراول دستے مرتب کرتے تو ہمیشہ ایک بات ان کے مد نظر ہوتی۔ وہ یہ کہ ہمارا وفادار کون ہے، ہم پر جان چھڑکنا کون جانتا ہے، کونسا ایسا مردِ میدان ہے جو ہماری حفاظت پر اپنی جان کی بازی لگا دے۔ وفاداری کے اس اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ سب سے پہلے اپنی برادری، قوم اور قبیلے کے افراد کو بھرتی کرتے، پھر اپنی زبان بولنے والوں کو فوج میں شامل کرتے اور پھر اپنے علاقے کے لوگوں کو جن کے ساتھ ان کا مفاد وابستہ ہوتا۔ اس کے بعد مفتوحہ علاقوں کے ایسے لوگ ان کی سپاہ میں شامل ہوتے جن کے بارے میں انہیں یقین ہوتا کہ صدیوں کی غلامی نے ان کے اندر خودداری کی ساری صفات ختم کر دی ہیں۔ پہلے غلام بنائے جاتے پھر محاذِ جنگ کے کارندے۔ اصولِ حکمرانی میں بھی اپنے ہی قبیلے، علاقے، برادری اور ہم زبان لوگوں کو علاقوں کا حاکم یا گورنر مقرر کیا جاتا۔ عموماً اپنے قریب ترین عزیزوں کو اہم مناصب سونپے جاتے۔ یہ سب کے سب فاتح یا حاکم سیاسی طور پر شادیاں بھی کرتے اور پھر اس رشتے کے حوالے سے جب کچھ لوگوں کی وفاداریاں مستحکم ہو جاتیں تو پھر کہیں انہیں سپہ سالار بنا دیا جاتا تو کہیں وزیرِ خاص۔ یہ سب عنانِ حکومت کے رموز تھے جو صدیوں سے چلے آ رہے تھے اور آج بھی ویسے ہی قائم ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اب قبیلوں، قوم، برادری اور علاقے کی جگہ سیاسی پارٹیوں اور گروہوں نے لے لی ہے یا پھر آج کہیں فوج اپنے ملک کو خود ہی فتح کر لے تو اُس کے سپاہی ایک قبیلہ، ایک قوم اور ایک برادری کی طرح پورے ملک کے اہم مناصب پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اپنے گورنر، اپنے وزیر، اپنے کارپوریشنوں کے سربراہ۔ حکمران سیاسی ہو یا فوجی، آمر ہو یا جمہوری، اُس کا رویہ ہمیشہ ایک جیسا ہی رہتا ہے۔ وفاداریوں کی تلاش، انہیں نوازنا اور دشمنوں کو اقتدار کی راہداریوں سے دور رکھنا۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے رومن بادشاہ بھی علاقوں کے علاقے فتح کرتے لیکن حقِ حکمرانی صرف اصل روم کے باشندوں کو حاصل تھا۔ یوں تو مصر ان کے زیرِ نگیں تھا، اُس کے افراد ان کی فوج میں سپاہی تھے لیکن وہ لباس بھی رومن لوگوں جیسا نہیں پہن سکتے تھے۔ رومن باشندوں کو پھول بوٹوں والی ٹائی پہننے کی اجازت تھی جبکہ مصر اور فلسطین وغیرہ کے افراد صرف سادہ ٹائی پہن سکتے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں مغل دربار اور اُس کے انتظام کو دیکھ لیں۔ بادشاہ کے بھائی، بھتیجے، بیٹے، داماد اور برادر نسبتی ہی حکمران تھے۔ منگول جو کہ آندھی کی طرح اُٹھے اور پوری دنیا کو تاخت و تاراج کر دیا وہاں بھی حقِ حکمرانی صرف اور صرف چنگیز خان کے مغل خون کے رشتے میں بندھے ہوئے لوگوں کو حاصل تھا۔ جاپانی، ہسپانوی، ولندیزی، پرتگیز اور انگریز سب کے سب غاصب تھے، قابض تھے، علاقے زیرِ نگیں کرتے تھے اور پھر ان علاقوں پر حکمرانی کے لئے وفادار، قابلِ اعتماد اور بھروسے کے لوگوں کا انتخاب اپنے خاندان، علاقے، ہم نسل اور ہم زبان لوگوں میں سے کرتے۔

لیکن بدترین، ظالم اور فرعون صفت لوگوں میں بھی ایک خوبی موجود تھی۔ وہ جب بھی اپنی اولاد کے لئے اتالیق مقرر کرتے، اپنے مدرسوں کے لئے استاد ڈھونڈتے، اپنے لوگوں کے لئے تعلیم کی سہولیات مرتب کرتے تو بھول جاتے کہ ان کے اندر رنگ، نسل، یا عقیدے کا کوئی تعصب بھی موجود ہے۔ ایک قابل اُستاد خواہ افریقہ کے حبشیوں میں ملتا یا ترکی کے جوانانِ رعنا سے، ہندوستان کی سرسبز سرزمین سے ہوتا یا وسطِ ایشیاء کے پہاڑوں سے، وہ اُس کو ڈھونڈ کر لاتے اور اُسے اپنے بچوں کا استاد مقرر کرتے۔ کبھی کسی منگول نے یہ نہ کہا کہ کوئی منگول استاد ڈھونڈ کر لاؤ، کسی عباسی خلیفہ نے عرب اُستاد کی خواہش ظاہر نہ کی۔ کسی مغل بادشاہ نے فرغانہ کی وادیوں سے اُستاد برآمد نہیں کروائے۔ جس کو علم آتا تھا اُسے استاد مقرر کر دیا گیا۔ اس لئے اگر وہ نسل، رنگ، عقیدے اور علاقے کے تعصب میں پڑ جاتے تو ان بادشاہوں کی اولادوں کا مستقبل خطرے میں پڑ جاتا اور شاید ان کی حکومت ایک نسل بھی نہ چل پاتی۔

لیکن شاید ہم وہ بد قسمت قوم ہیں جنہوں نے گذشتہ پچاس سالوں میں نسل، رنگ، علاقے اور عقیدے کا تعصب سکھ اپنے تعلیمی اداروں سے پروان چڑھایا۔ وہ تعلیمی ادارے جنہیں انگریز حکمرانوں، مسلمانوں معلمین اور ہندو اور فلاحی کارکنوں نے بنائے تھے، جن میں دنیا بھر سے بہترین استاد یہاں لائے گئے تھے، ان لوگوں کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ پنجاب یونیورسٹی میں سنسکرت کا عالم ایک انگریز الفریڈ ولنر تھا جو اس یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی رہا۔ خود علامہ اقبال کے استاد پروفیسر آرنلڈ اپنا وطن چھوڑ کر یہاں درس و تدریس کے لئے آئے تھے۔ سر سیّد کی علی گڑھ یونیورسٹی اور کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج سب کے سب صرف ایک کلیے پر عمل کرتے تھے کہ جو علم جانتا ہے وہی اُستاد ہے خواہ کسی نسل یا عقیدے سے کیوں نہ ہو۔ وہاں ہم نے اپنے علاقے، اپنی پارٹی، اپنے نظریے اور اپنی زبان بولنے والے جاہلوں اور کم علم افراد کو بھرتی کرنا شروع کیا۔ بلوچوں کی یونیورسٹی میں بلوچ، سندھیوں کی یونیورسٹیوں میں سندھی، اردو بولنے والوں کو اپنی زبان بولنے والے، پشتونوں کے لئے پشتو اور پنجابیوں کے لئے پنجابی۔ اس سے بھی زیادہ بدترین نظریاتی تنظیموں اور سیاسی پارٹیوں نے اپنی اپنی وفاداریوں کے استاد ان تعلیمی اداروں میں بھرتی کیے اور صرف تیس سال کے اندر اس ملک کا تعلیمی نظام تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ لیکن شاید ابھی اس کمزور عمارت پر ایک نئی خوبصورت منزل تعمیر کی جا سکتی تھی جس کی کوشش ہائر ایجوکیشن کمیشن نے گذشتہ چند سالوں میں کی۔ اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا کہ سب اخباریں اور ٹیلی ویژن پروگرام یہ داستان بیان کر رہے ہیں۔ مجھے تو اس تباہی کے پیچھے اس تعصب اور بد دیانتی کا رونا رونا ہے۔ جس اٹھارہویں ترمیم میں پارٹیوں میں الیکشن شجرِ ممنوعہ ہو وہاں تعلیم کے تابوت میں آخری کیل ایسے ہی ٹھونکا جا سکتا تھا کہ اسے صوبوں، علاقوں، قبیلوں اور برادریوں کے حوالے کر دو۔ ایسا تو بدترین ظالم اور فرعون صفت حکمرانوں نے بھی نہیں کیا۔ جاہل تھے، ان پڑھ تھے، گنوار تھے، فوج اور انتظامیہ میں اپنے وفاداروں کی بھرتی کرتے تھے لیکن اتالیق اور استاد اُس کو مقرر کرتے جس کو علم آتا تھا جو ان کی اولادوں کا مستقبل سنوار سکتا تھا۔ ایک درویش کے پاس بیٹھا اس المیے کا نوحہ بیان کر رہا تھا۔ مسکرائے اور کہا جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ سب اپنی اُس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں تقدیر خود فیصلے صادر فرما دیتی ہے۔ مولانا روم کی مثنوی اُٹھائی، آنکھیں بند کیں اور صفحہ کھول کر سامنے رکھ دیا۔ اشعار آنے والے دنوں کا خاکہ بیان کر رہے تھے۔

اے کہ ن صح ناصحاں رانہ شوی
فالِ بد راتست ہر جامی روی
چوں زندافعی دہاں بر گردنت
تلخ گردد جملہ شادی کردنت

تو ناصحوں کی نصیحت پر کان نہیں دھرتا۔ لیکن تو جہاں جائے گا بد شگونی تیرے ساتھ رہے گی۔ جب اژدھا تیری" گردن پر منہ مارے گا تو تیری سب خوشیاں تلخ ہو جائیں گی۔" سزا کا فیصلہ ہو جائے تو عقل زائل ہو جاتی ہے اور جرم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

تکبر اور توبہ

عقل کے اندھے اور سائنسی علوم سے بے بہرہ ہیں یہ لوگ۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ انسان کس عظیم بلا کا نام ہے۔ اس نے اب آفتوں اور مصیبتوں پر قابو پانا سیکھ لیا ہے۔ یہ دریاؤں کے رخ موڑ لیتا ہے، ایسی عمارتیں تعمیر کرتا ہے کہ زلزلے میں جھولے کی طرح جھولتی رہتی ہیں لیکن گرتی نہیں۔ موذی امراض میں لوگ مرتے تھے، طاعون، چیچک، ہیضہ، اس نے کیسا قابو پایا۔ ہم چونکہ ترقی یافتہ نہیں ہیں اس لیے ہم پر زلزلے، سیلاب اور بیماریاں آتی ہیں۔ مریض ہوتے ہیں تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں اللہ سے گڑ گڑا کر توبہ نہیں کرنے لگتے۔ جب زلزلہ آیا تھا تو قوم کیسے نکلی تھی۔ انہوں نے اپنے بھائیوں کی مدد کر کے اس آفت پر قابو پا لیا تھا۔ اگر وہ اس وقت گڑ گڑا کر استغفار کر رہے ہوتے تو ان کی مدد کو کون جاتا۔ میرے ملک کے عظیم دانشوروں نے استغفار کا مضحکہ اڑایا، تمسخر کیا اور میں خوف سے کانپتا رہا، میں جن لوگوں کو جانتا تھا، انہیں فون کر کے میں نے کہا کہ میں آپ کے لیے اپنے اللہ سے دعا کرتا رہا ہوں کہ آپ پر اس تمسخر کا عذاب نازل نہ ہو اور اس استہزا کی وجہ سے ہم کسی سخت گرفت میں نہ آجائیں۔ اس لیے کہ جو لوگ استغفار کا تمسخر اڑا رہے تھے انہیں علم ہی نہیں کہ توبہ اور استغفار صرف رو رو کر اور گڑ گڑا کر اللہ سے معافی مانگنے کا نام نہیں بلکہ اس عمل کی طرف لوٹنے کا نام ہے جس کا اللہ حکم دیتا ہے۔ اللہ سورۂ ماعون میں اس شخص کی نشانیاں بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "یہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا"۔ سورۂ الہمزہ میں فرمایا "بربادی اور تباہی ہر اس شخص کے لیے "جو طعنے دیتا اور پیٹھ پیچھے برائی کرنے کا خوگر ہے" اور پھر کیا خوب اصول وضع کیا کہ تباہی اور بربادی اس کے لیے جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا"۔ زلزلے اور قدرتی آفات میں لوگوں کا دیوانہ وار اپنے بھائیوں کی جانب دوڑ پڑنا دراصل توبہ ہی کی ایک شکل تھی کہ وہ اپنی آخرت کی بھلائی کے لیے اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہوئے اس نیک عمل کی طرف راغب ہو گئے تھے تاکہ ان کا شمار دین کو جھٹلانے والوں میں سے نہ ہو جائے۔ تو یہ کہ اس عمل کی توفیق بھی میرا اللہ دیتا ہے۔ اور جب کسی قوم سے وہ ناراض ہو جاتا ہے تو پھر قوم کو یہ عملی توفیق بھی حاصل نہیں ہوتی۔ میرا خوف شاید ان دانشوروں کی سمجھ میں نہ آئے لیکن اپنے شہر کی سڑکوں پر لگے مختلف رفاہی تنظیموں کے امدادی کیمپ دیکھ لیں۔ میں نے پچاس سالہ زندگی میں مدد کے لیے پکارنے والوں کے کیمپوں میں اتنی ویرانی نہیں دیکھی۔ اتنی بے حسی نہیں دیکھی۔ یوں لگتا ہے اللہ نے ہم سے اس عملی توبہ کی توفیق بھی چھین لی ہے۔ مجھے سورۂ توبہ کی 126 ویں آیت یاد آرہی ہے۔ اللہ سبحان و تعالیٰ فرماتے ہیں "اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ بے شک وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں پھر بھی وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں۔ اللہ بیماری دیتا ہے پھر صحت عطا کرتا ہے، قحط آتا ہے، مفلسی آتی ہے، پھر خوشحالی میسر ہو جاتی ہے۔ یہ سب اس لیے ہوتا ہے تاکہ ہم اللہ کی جانب رجوع کریں۔ اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور اللہ کے ہاں سب سے بڑا گناہ جو ہلاک کرنے والا ہے وہ ہے اس کی صفاتِ ربوبیت میں شریک ہونے کا دعویدار ہونا اور اس شرکت کا عکس تکبر ہے۔ اللہ فرماتے ہیں "تکبر میری چادر ہے"۔ ذرا سوچئے ہم میں سے کتنے لوگوں نے اللہ کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔ ہم قابو پالیں گے، ہم کچل کر رکھ دیں گے، ہم سائنس کی دولت سے زلزلے اور طوفان روک سکتے ہیں، بیماری پر قابو پا سکتے ہیں۔ طاعون اور ہیضے پر قابو پایا تو اللہ نے وہ بیماریاں اتار دیں جو گذشتہ صدیوں میں انسان نے دیکھی تک نہ تھیں، جن کے کوئی جرثومے یا وائرس بھی نہیں ہیں۔ بلڈ پریشر، ہارٹ اٹیک، کینسر، شوگر، کہا اے انسان جاؤ مجھ سے دور ہو کر پریشان اور غیر مطمئن زندگی گزارو اور ان بیماریوں میں موت کو گلے لگاؤ۔ میں نئے نئے وائرس کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا نام نہیں لینا چاہتا۔ دنیا کی تاریخ میں انسان شاید ہی کسی بیماری سے اتنا مرا ہو جتنا اپنی خوبصورت ایجادوں، ہوائی جہاز، بس، ٹرین، کار اور موٹر سائیکل کے حادثات سے مرا ہے۔ تکبر اور حب دنیا کی بیماری وہ ہے جس نے جنگوں کو جنم دیا۔ کروڑوں لوگ ایک بادشاہ، صدر یا حکمران کے تکبر کی نذر ہو گئے۔ ایک طاقت کے غرور پر قربان کر دیئے گئے۔ اس لیے کہ یہ میرے اللہ کا دعویٰ ہے کہ "دلوں میں الفت تو میں پیدا کرتا ہوں"۔ ہم سیاسی رہنماؤں، عالمی طاقتوں اور انتظامی عہدیداروں کی چابکدستیوں سے امن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چال ڈھال میں، آنکھوں میں، دلوں میں تکبر رچا ہوا ہے، دلوں کی میل کیسے دور ہو۔ استغفار اس تکبر کے ٹوٹنے کا نام ہے۔ ہم یہ گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ میں اتنا بڑا سیاسی لیڈر، اتنا بڑا بیوروکریٹ، عظیم دانشور، بہترین صحافی، ریسکیو اور ڈیزاسٹر مینجمنٹ میں ڈگری یافتہ ان سیلابوں، طوفانوں اور زلزلوں کی وجہ سے رونے لگ جاؤں، اللہ کے حضور رحم کی درخواست کروں، اپنا تکبر اور غرور چھوڑ دوں۔ کہہ دوں کہ ہم ناکام ہو گئے ہیں۔ یہ ہے وہ عذاب جو ہم پر مسلط ہے۔ ہم عوام کے سامنے، وزیر اعظم یا صدر کے سامنے، گورنر یا وزیر اعلیٰ کے سامنے، یہاں تک کہ اپنے افسر کے سامنے اس کے غصے سے بچنے کے لیے بار بار اپنی کوتاہی کا اقرار کرتے ہیں، اس سے معافی طلب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم سے غلطی ہو گئی۔ یہ کام ہمارے بس کا نہیں۔ لیکن ہم اللہ کے سامنے نہ اپنی بے بسی کا اظہار کرنے کو تیار ہیں اور نہ ہی اپنی غلطی اور کوتاہی کا اعتراف۔ ہم سیلاب زدگان کی امداد کرنے کے قابل ہوں نہ ہوں، ہم شہر میں ٹارگٹ کلنگ روکنے اور دہشت گردی پر قابو پانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ ہم یہ سارے اعتراف اپنی میٹنگز میں، میڈیا پر، لوگوں کے سامنے کہیں گے لیکن رات کی تنہائی میں ہی سہی، اللہ کے سامنے اس بے بسی، کمزوری، کم مائیگی کا اعتراف نہیں کرتے۔ اس سے مدد نہیں مانگتے۔ ہمارا تکبر ہمیں جھکنے نہیں دیتا۔ یہ ہے عذاب اور یہ ہوتا ہے اللہ کی ناراضگی کا سبب۔ یقین مانیئے امتحان ان لوگوں کا نہیں جن کے گھر سیلاب میں تباہ ہو گئے بلکہ امتحان تو ان لوگوں کا شروع ہوا ہے جو حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی مدد کی جانب نہیں دوڑتے کہ اللہ ان سے خوش ہو جائے کہ یہ میرے بندے مجھے خوش کرنے کے لیے، منانے کے لئے اپنا مال خرچ کرنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ صاحبانِ نظر اور اہلِ بصیرت کہتے ہیں کہ یہ بارشیں اب بھی رحمت میں بدل سکتی ہیں اگر ہم اپنے اللہ کو منانے نکل کھڑے ہوں اور اس کا برملا اظہار کریں کہ ہم بے بس ہیں، مجبور ہیں، یہ مصیبت ہمارے بس سے باہر ہے۔ ہم پر رحم فرما، ہم ان آفت زدوں کی مدد کو نکل رہے ہیں۔ رمضان کا چاند دیکھتے ہی توبہ اور استغفار کرتے ہوئے اس مہینے کو اللہ کے راستے میں مال و متاع خرچ کر کے اسے راضی کرنے کا مہینہ بنا لیں ورنہ جو دیدۂ بینا دیکھ رہی ہے وہ اس قدر خوفناک ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ پھر میرا اللہ ان لوگوں سے اس مملکت کو پاک کر دے گا جو اس کی چادرِ تکبر پہن کر ظلم کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو اس سرزمین کا وارث بنا دے گا جو یہاں امن، سلامتی اور سکون لے کر آئیں گے۔

بد سے بدترین

زمین پر جتنے بھی بچے جننے اور دودھ دینے والے جانداروں کی اقسام ہیں ان میں سب سے ظالم، پُر تشدد اور سفاک جانور کا نام SHREW ہے۔ یہ بہت ہی مختصر چوہے کی شکل کا ہوتا ہے لیکن اس کی تھوتھنی سور کی طرح لمبی لیکن نوک دار ہوتی ہے۔ اس کا سائز ایک عام موٹے تازے چوہے سے بہت کم ہوتا ہے۔ عموماً یہ ایک اونس کے پانچویں حصے کے وزن کے برابر ہوتا ہے لیکن اس کی سننے اور سُونگھنے کی حس بے انتہا تیز ہوتی ہے۔ اس کے ظلم، تشدد اور بربریت کی دو وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی بھوک اور کھانے کی ہوس اسقدر ہوتی ہے کہ یہ اپنے جسم کے نوے فیصد وزن کے برابر خوراک کھا جاتا ہے اور دوسری یہ کہ اپنے رہنے کے لئے جو کھوہ، زیرِ زمین گڑھا یا کوئی اور مقام یہ تلاش کرتا ہے وہ اس کی ضروریات سے کئی سو گنا زیادہ ہوتا ہے اور وہ اس قبضے کو قائم رکھنے کے لئے اپنے سے بڑے سائز کے جانداروں اور تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود ان پر حملہ آور ہو کر انہیں ختم کر دیتا ہے۔ اپنے سائز کے برابر جانوروں کو تو یہ بلا خوف موت کے گھاٹ اُتار سکتا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس کے دودھ کے دانت پیدائش سے پہلے ہی گر جاتے ہیں اور زندگی بھر اُسے ایک ہی دانتوں کے سیٹ پر گذارا کرنا ہوتا ہے جو بہت تیز اور کسی بھالے کی طرح تراشے ہوتے ہیں۔ اس جانور میں دو اور اہم خصوصیات ہیں یہ اپنے علاقے کا جارحانہ حد تک تحفظ کرتا ہے اور دوسری یہ کہ اپنی نسل یا قوم کی بنیاد پر اکٹھا ہو کر دوسرے جانوروں پر بلاوجہ حملہ آور ہوتا ہے اور انہیں اُس علاقے سے دربدر کر دیتا ہے جس پر اُس نے قبضہ کیا ہوتا ہے۔ یہ زمین یا نرم پہاڑوں میں غار نما پناہ گاہیں بھی بناتا ہے جس میں یہ اپنے شکار کو لے جاتا ہے۔ ان میں کچھ زہریلے بھی ہوتے ہیں اور بعض ان غار نما پناہ گاہوں میں اپنے شکار کے ساتھ لذت لینے کے لئے تشدد بھی کرتے ہیں۔ یوں ان کی پناہ گاہیں عقوبت خانے بن جاتے ہیں۔ ایسا نسلی اور علاقائی تعصب دنیا کے کسی اور جانور میں نہیں پایا "جاتا۔ اسی کے نام سے ضدی، چالاک اور تیز شخص کا نام شیر و یا شیر وڈر کھا گیا ہے۔ شیکسپیئر نے اپنا مشہور ڈرامہ TAMING THE SHREW" لکھا اور اس میں ایسی صفات والی خاتون کو قابو کرنے کے گُر بتائے۔

شیکسپیئر کو مرے آج کئی سو سال ہو گئے ہیں لیکن یہ گُر آج تک کسی کے کام نہ آئے۔ البتہ اس جانور کا مطالعہ جن دو خصوصیات، نسلی اور علاقائی تعصب کو واضح کرتا ہے اُس کو ذرا انسانی تاریخ پر چسپاں کر کے دیکھیں تو حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھ۔ٹی رہ جاتی ہیں۔ انسان نے رنگ، نسل اور علاقے کے نام پر جتنا خون بہایا ہے اُس کی مثال کسی اور تعصب کی بنیاد پر بہائے جانے والے خون میں نہیں ملتی۔

یہ دنیا ایک طویل عرصے تک انسانوں کے لئے ایک امن و آشتی اور سکون کی جگہ تھی۔ کبھی کسی بادشاہ کو علاقے فتح کرنے اور اپنی نسلی برتری ثابت کرنے کا جنون پیدا ہوتا تو وہ اپنی افواج کے ذریعے لاکھوں کڑوروں لوگوں کا خون کر دیتا۔ بابل کے بادشاہوں، ٹرائے اور ایتھنز کی لڑائیوں، چنگیز خان اور سکندر کے قصوں سے لے کر ہلاکو اور نادر شاہ کے خون آشام افسانوں میں نسلی برتری اور علاقائی قبضہ گیری کا جذبہ بربادی کا باعث بنا۔ 1490 میں کولمبس نے جب امریکہ دریافت کیا تو اُس دن سے لے کر 1890 تک وہاں آباد تقریباً ساڑھے گیارہ کڑور ریڈ انڈین میں سے نوے فیصد لوگ موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ سفید نسل نے براؤن نسل کو تہہ تیغ کر دیا۔ نسل اور زبان کا تعصب پوری انسانی تاریخ کے ہر ورق پر خون سے تحریر کیا نظر آتا ہے۔ درمیان میں ایک عرصہ مذہب کی بنیاد پر صلیبی جنگوں کی خون آشامی کا بھی ہے جس میں پورا یورپ ایک جنگی جنون میں کئی صدیاں مبتلا رہا۔ یوں تو اسے یروشلم فتح کرنے کی جنگ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ دراصل یورپ کے سفید فام عیسائیوں کے غلبے کی جنگ تھی۔ اسی لئے اس میں افریقہ کا کوئی عیسائی شامل نہ ہوا۔ حالانکہ وہاں قدیم ترین عیسائی ملک حبشہ اور عیسائی آبادی بھی موجود تھی۔ اس کے باوجود مغرب کے آزاد خیال فلسفیوں نے ایک پیغام دیا کہ اس لڑائی کی بنیاد مذہب ہے، اسے ریاست سے الگ کر دینا چاہیے۔ جان لاک اِس گروہ کا سرکردہ تھا۔ تحریکیں اُٹھیں، انقلاب آئے، خون ریزیاں ہوئیں اور بالآخر 1908 کے قریب قریب اکثر ممالک جو اُس وقت ترقی یافتہ تھے انہوں نے مذہب کو ریاستی کاروبار سے الگ کر دیا۔ لیکن تاریخ کی حیرت بھی ختم نہ ہوئی۔ انسان جس میں نسل اور علاقے کا تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا وہ اُس چھوٹے سے چوہے نما جانور شیرو کی طرح کیسے چین سے بیٹھ سکتا تھا۔ مذہب کو ریاست سے الگ کرنے کے بعد دنیا کی دو عالمی جنگیں ہوئیں اور انسانی تاریخ کا بدترین قتل و غارت ہوا۔ کڑوروں لوگ مارے گئے اور اتنے ہی جلاوطن ہوئے۔ اکثر کا تو مذہب بھی ایک ہی تھا۔ بس ان کا علاقہ علیحدہ اور نسل مختلف تھی۔ کسی دانشور نے، کسی قوم پرست نے، کسی انصاف اور انسانی حقوق کے علمبردار نے یا پھر آزاد خیال مؤرخ نے آواز بلند نہ کی یہ سب لوگ خواہ اتحادی افواج ہوں یا دوسرے سارے کے سارے سیکولر تھے۔ ان کے آئین اور قانون سیکولر تھے۔ کسی نے نسل، رنگ، زبان اور علاقے کے تعصب کو انسان کے لئے زہر قاتل نہ بتایا۔ بلکہ انسانوں پر ان جنگوں کے بعد سب سے بڑا ظلم نافذ کر دیا گیا۔ ساری دنیا کو کیک کی طرح کاٹ کر ملکوں ملکوں تقسیم کر دیا گیا۔ سرحدیں بنادی گئیں اور ان سرحدوں کی حفاظت کے لئے فوجیں۔ 1920 میں لیگ آف نیشنز کا اجلاس ہوا اور اُس میں پاسپورٹ کا ڈیزائن تیار ہوا۔ اور 1926 اور 1927 کے اجلاسوں میں اس کے قوانین بنائے گئے۔ پہلے یہ ساری دنیا انسانوں کے لئے کھلی تھی۔ کسی کی ایک جگہ قسمت کام نہ کرتی وہ دوسری جگہ اپنے ہنر سے کمانے لگتا۔ جسے کسی ایک ملک میں ظالم حاکم ملتا وہ نجات کے لئے کہیں اور جا بستا۔ اب پوری دنیا کو چڑیا گھر کے پنجروں کی طرح تقسیم کر دیا گیا اور بنیاد تھی نسل، رنگ، زبان یا علاقہ۔ لیکن ان پنجروں کی وجہ سے کیا قتل و غارت ختم ہو گئی، نہیں بلکہ انسانوں نے اپنے اندر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تعصب سے قتل کرنا شروع کر دیا۔ صرف ایک روانڈا میں سو دنوں کے اندر 1994 میں دس لاکھ لوگ قتل ہوئے جو دوسرے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ نسل اور علاقے کی یہ بہت مختصر کہانی ہے جو میں نے بیان کی ہے ورنہ تفصیل اس قدر خونچکاں ہے کہ بیان مشکل ہے۔

لیکن حیرت ہے ہم پر کہ ہم روز "ٹارگٹ کِلنگ" کے "سائنسی" نام پر کوئٹہ اور کراچی میں لاشیں اُٹھاتے ہیں۔ پانی کی بوند کو ترستے اور بجلی کے عذاب میں رہتے ہیں لیکن اسی تعصب کی وجہ سے اتنا پانی سمندر میں پھینک دیتے ہیں جو ہمارے پانچ سالوں کی ضرورت کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ہم انسانی جنگل کے وہ بدترین SHREW ہیں جو زبان اور علاقے پر لڑتے ہیں لیکن ہم میں اور جانور میں ایک فرق ہے۔ ایک شیرو کسی دوسرے شیرو کو قتل نہیں کرتا۔ لیکن ہم وہ بدترین مخلوق ہیں جو کتے، بلیاں، طوطے، کبوتر پال لیتے ہیں لیکن انسانوں کو قتل کرتے ہیں۔ میرے اللہ نے سورہ والتین میں صحیح فرمادیا "ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا اور الٹ کر بد سے بدترین بنا دیا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اللہ پر اور نیک عمل کرتے رہے "اس پیغمبر پر ایمان جس نے کہا تھا تمہاری جاہلیت کے غرور اور نسل کے بُت میرے پاؤں کی ٹھوکر پہ ہیں۔ ہم نے وہ بُت اُٹھائے اور اپنے سینوں پر سجا لئے، اپنے بینروں پر، سیاسی تنظیموں کے ایجنڈوں پر اور منشوروں میں درج کر دیئے۔ ہم سے زیادہ بھی کوئی بدنصیب ہو سکتا ہے۔

اللہ کو حیا آتی ہے

اللہ ہم سے کیوں ناراض ہے۔اس دنیا پر ڈیڑھ ارب سے زیادہ مسلمان بستے ہیں۔ستاون سے زیادہ ملک ہیں۔ان سب پر آفت کیوں نہیں ٹوٹتی۔ان پر بلاؤں کا نزول کیوں نہیں ہوتا۔سارے اہلِ نظر ہمیں ہی کیوں معافی اور استغفار کے لئے کہتے ہیں۔دبئی،شرم الشیخ،بحرین اور بیروت میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔اکثر مسلمان حکمران امریکہ کے کاسہ لیس ہیں۔ہم ان سے مختلف نہیں پھر آپ ہمیں کیوں ڈراتے ہیں۔جو لوگ اس قدر بصیرت رکھتے ہیں، جنہیں زہد و تقویٰ نے نگاہِ دوررس عطا کی ہے وہ ہمارے لئے دعا کیوں نہیں کرتے کہ عذاب ٹل جائے۔ہمیں معافی مانگنے کو کیوں کہا جاتا ہے۔آخر ہمارا قصور کیا ہے۔ہمارے بس میں کیا ہے۔سب حکمران کرتے ہیں۔ہم کیوں اس کی سزا بھگتیں۔ایسے بہت سے سوال ہیں جو مجھ سے گذشتہ دو سال سے پوچھے جا رہے ہیں۔جب سے میں نے اپنے کالموں میں بار بار لوگوں کو اللہ کی ناراضگی اور غیض و غضب سے بچنے کے لئے اجتماعی استغفار کی دست بستہ درخواست کی۔بہت سے لوگ تھے جو میری اس استدعا سے اتفاق رکھتے تھے۔وہ راتوں کو آنسو بھی بہاتے رہے اور اللہ سے گڑگڑا کر مغفرت کی التجائیں بھی کرتے رہے۔لیکن جنہیں اپنے رب کے سامنے جھکنے کی توفیق نہ ملی وہ سوال کرتے رہے اور واقعات کی سیاسی، جغرافیائی اور سائنسی تعبیریں پیش کرتے رہے۔انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تمام مصیبتوں، بلاؤں، آفتوں اور پریشانیوں کی کوئی نہ کوئی سائنسی، معاشی، معاشرتی، سیاسی یا جغرافیائی وجہ ضرور تلاش کرتا ہے اور پھر اُسی وجہ کو اپنی آفت اور مصیبت کی آخری توجیہہ قرار دیتا ہے۔حالانکہ اسے اس کا علم نہیں ہوتا کہ اس وجہ کو تخلیق کرنے والی بھی کوئی ہستی موجود ہے جو اس کائنات کی مالک و مختار ہے جس نے سورہ تغابن میں فرمایا "نہیں آسکتی کوئی مصیبت جب تک اللہ کی طرف سے اذن نہ ہو جائے" اسی لئے سیّد الانبیاء ﷺ بیماری کے دوران قرآن پاک کی یہی آیت دُھراتے "جو مجھے مرض دیتا ہے وہی شفا بھی عطا کرتا ہے" لیکن دنیا پر توکل کے قائل لوگ زلزلے کی تباہی یا سیلاب کی تباہ کاری کو بھی ریسکیو یا حفاظتی اقدامات کی کمی سے تعبیر کرتے ہیں اور اُس کے لئے کئی سو جواز ڈھونڈ لیتے ہیں۔لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ جن ملکوں کو اللہ نے ایسے خوبصورت نظام وضع کرنے کی طاقت عطا فرمائی وہاں انسان کا احترام، انصاف اور قانون کی بالادستی اور انسانی فلاح کے ان اصولوں پر کس قدر عمل ہوتا ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو حکم دیا ہے۔جن بستیوں کو انسانوں نے انصاف، قانون اور احترامِ آدمیت کے اصولوں پر سنوار کر رکھا ہے وہاں اللہ کی نوازشات کا عالم صاف نظر آتا ہے۔اللہ عادل ہے اور اپنی رحمتوں کو کسی مذہب، علاقے یا قوم سے مختص نہیں کرتا ہے۔

اب یہ سوال کہ ہم پر ہی یہ غیض و غضب کیوں، دنیا کے نقشے پر دو سو کے قریب ملک اپنی اپنی سرحدوں اور علاقوں میں ایک مخصوص جغرافیے یا رنگ و نسل کی وجہ سے آباد ہیں۔کچھ نے آزادی حاصل کی اور کچھ کو عالمی طاقتوں نے تقسیم کر دیا۔جیسے مسلمان خلافت کے ٹکڑے کر کے عراق، شام، اردن، مصر اور سعودی عرب کو کیک کی طرح کاٹ کر علیحدہ کیا گیا۔لیکن اس کرۂ ارض پر ہم وہ واحد مملکت ہیں جنہوں نے یہ دعویٰ کر کے علیحدہ ملک حاصل کیا کہ ہم یہاں کے رہنے والے اپنے جیسے نقش و نگار، اپنے جیسی زبان اور اپنی نسل سے تعلق رکھنے والوں سے اس لئے مختلف ہیں کہ ہم ایک اللہ کو مانتے اور اُس کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ہندو راجپوت اور مسلمان راجپوت علیحدہ، سکھ جاٹ اور مسلمان جاٹ علیحدہ اور بدھ گورکھا اور مسلمان گورکھا علیحدہ ہیں۔ہم نے اس ملک کی پیدائش پر ہی اس کے باہر اللہ کے نام کی تختی آویزاں کر دی۔لیکن اس تختی آویزاں کرنے کے عمل میں ہم نے اُس ربِ کائنات کے حضور دس لاکھ شہداء کی قربانی نذر کی جو اس بات پر بے گھر ہو کر راستوں میں شہید کر دیئے گئے کہ وہ اُس واحد مالک حقیقی کے نام کا کلمہ پڑھتے تھے۔ایسے لوگ میرے رب کو بہت عزیز ہوتے ہیں۔وہ ان کی قسمیں کھاتا ہے اور ان کو مرنے کے بعد بھی زندہ ہونے کا اعزاز بخشتا ہے۔ان دس لاکھ شہداء کا ان تریسٹھ سال میں جس طرح تمسخر اڑایا گیا اُس کی مثال نہیں ملتی۔کئی سال تو ہم یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ اس کائنات کا اصل مالک اللہ ہے اور اس ملک کا اقتدارِ اعلیٰ اُسی کا ہے۔پھر آئین میں لکھا گیا اور سجا کر رکھ دیا اور ساری عمر یہ بحث کرتے رہے کہ یہ ملک تو معاشی وجہ سے بنا ہے، گیارہ اگست کی تقریر دیکھو، یہ تو سیکولر ہونا چاہیے تھا۔یہ تو پنجابی، سندھی، بلوچ، پٹھان، سرائیکی اور مہاجر قوموں کا مجموعہ ہے۔حالانکہ صرف چند قدم دور سرحد کے اُس پار بھارت میں جب بستیوں پر ہندو بلوائی حملہ کرتے ہیں، گھر جلاتے ہیں، عورتوں کی آبروریزی کرتے ہیں تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ پنجابی، سندھی، پٹھان یا کشمیری ہے۔مسلمان ہے تو بس واجب القتل ہے۔یہ تقسیم سے پہلے بھی تھا اور آج بھی۔

ہم اس قدر اچھوت تھے کہ برصغیر کے ہزاروں ریلوے اسٹیشنوں پر ہمارا پینے کا پانی بھی الگ ہوتا تھا۔ہندو پانی بیچنے والا الگ اور مسلم پانی بیچنے والا الگ۔لیکن ان تریسٹھ سالوں میں ہم نے اس غلامی سے نجات جو اللہ کے کرم سے ہوئی اور اللہ کے نام کی تختی والے ملک میں ان دس لاکھ شہداء کے خون سے جو مذاق کیا وہ دنیا کی کسی قوم نے اپنے آزادی کے جانثاروں سے نہیں کیا۔دنیا میں کسی ملک نے اپنی مرضی اور اختیار کے ساتھ اپنے ملک کو اللہ کا گھر نہیں کہا۔برونائی سے لے کر مراکش تک کوئی اسلامی ملک اس نام پر تخلیق نہیں ہوا۔

یہ گھر جسے دنیا بھر میں مثال ہونا چاہیے تھا اُس کی خطاؤں پر غور کریں اور اللہ کی ناراضگی کا اندازہ کریں۔دنیا میں ستاون اسلامی ملک ہیں، کاسہ لیس بھی ہیں اور امریکہ کے وفادار بھی۔لیکن یہ اعزاز صرف ہمیں حاصل ہوا کہ ہم مسلمانوں کے خلاف جنگ جسے دہشت گردی کی جنگ کہتے ہیں اُس میں سب سے بڑے اتحادی ثابت ہوئے۔سیاسی تجزیہ نگار ہمیں ڈراتے رہے کہ ہمارا تورا بورا بن جائے گا۔لیکن شاید امریکہ ہم پر حملہ کرتا تو ہمارا اتنا تورا بورا نہ بنتا جتنا اب بن رہا ہے۔ہم نے جتنی لاشیں اُٹھائیں ہیں اتنی افغانوں نے اپنی جنگ میں نہیں اُٹھائیں۔اور جن افغانوں کا تورا بورا بنانے میں ہم نے مدد کی، ہماری سرزمین سے ساٹھ ہزار پروازیں اُڑیں اور ان پر بم برسائے، آج وہ اللہ پر توکل کرنے والے افغان امریکہ کو شکست دے رہے ہیں اور ہم عذابِ الٰہی کے خوف سے ڈر رہے ہیں۔

دنیا کے ہر اسلامی ملک میں جبر سے حکومتیں مسلط کی گئیں لیکن کوئی قوم ہماری طرح بے حس نہ تھی کہ آمر کے آنے پر شہروں، گلیوں اور قصبوں میں مٹھائیاں بانٹتا پھرے، جشن منائے۔جب ہمیں خود اپنے حاکم چننے کا اختیار ملا تو ہم نے امیدواروں کی لسٹ میں سب سے کم ووٹ اُس کو دیئے جو ایماندار، نیک اور پارسا تھا۔ہم پوری دنیا میں وہ واحد ملک ہیں جس کے دانشور اور سیاست دان فراڈ اور جعلی ڈگری کے حق میں بے باکی کے ساتھ دلائل دیتے ہیں۔ہم نے اپنے فراڈیوں کے دفاع میں اسلام کی سب سے محبوب اور مسلمانوں کے دلوں میں عشق کی طرح آباد سیّد الانبیاء ﷺ کی عزت و تکریم اور لحاظ تک نہ کیا اور اپنے جاہل ممبرانِ پارلیمنٹ کو ان کے اُمّی لقب ہونے سے جا ملایا۔ہم نے کرپشن اور اقتدار کے گٹھ جوڑ سے جنم لینے والے معاہدے این آر او کو فتح مکہ کے اعلان سے متشابہ قرار دیا۔

ہم جامعہ حفصہ کی معصوم بچیوں کے قتل سے لے کر وزیرستان میں جسموں کے پرخچے اڑانے والے ڈرون حملوں تک سب پر خاموش رہے۔ہم نے آزاد مسلمانوں کو گرفتار کر کے روپوں کے عوض بیچا۔ایسا جرم جس پر اللہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن میں خود اُس کے خلاف مدعی ہوں گا۔کیا دنیا کے کسی اور اسلامی ملک، ایران، دبئی، سعودی عرب، مصر میں ہمارے جیسے قبضہ مافیا ہیں۔ان تمام ممالک میں کیا انصاف کی دھجیاں ہماری طرح بکھرتی ہیں۔کیا وہاں امن و امان کی حالت اور انسانی جان کا تحفظ ہماری طرح ہے۔کیا وہاں ہماری طرح سیاست دانوں، لیڈروں، یہاں تک کے کونسلروں کے ڈیروں پر بدمعاش پلتے ہیں۔کیا وہاں کرپشن، لوٹ مار اور بددیانتی ہمارے جتنی ہے اور کیا وہ لوگ ہماری طرح اپنے جرائم اور کرپشن کو سیاسی انتقام کا نام لے کر باعزت بن جاتے ہیں۔ہمیں بار بار موقع ملا، اپنی مرضی سے حکمران منتخب کرنے کا اور اپنے آمروں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کا لیکن ہم نے اپنی زندگی سے تعصب، گروہ بندی، فرقہ پرستی اور بددیانتی کے مطابق فیصلہ کیا۔ہم اُس مقام پر آپہنچے ہیں جہاں اصلاح احوال کے لئے ایک ایسے آپریشن کی ضرورت ہوتی ہے جو ناسور کو کاٹ کر پھینک دے۔ہاں اُس کے ساتھ بہت سا صحیح گوشت بھی ضائع ہوتا ہے۔یہی وہ منظر تھا جسے اہلِ بصیرت دیکھ رہے تھے اور اللہ سے رجوع کی درخواست کر رہے تھے۔لیکن کوئی اُس جانب نہ پلٹا۔اب بھی ان کی بصیرت بتاتی ہے کہ سیلاب کا اُمڈ کر آنا اس بات کی علامت ہے کہ شاید یہ لوگ استغفار کریں، ورنہ زلزلے ان کا تعاقب کریں گے اور پھر اللہ ظالموں، بدعہدوں اور اس ملک سے کھیلنے والوں کا خاتمہ ظالموں کے ہاتھ سے کروائے گا کہ یہی اُس کا دستور ہے۔لیکن اس کی کوکھ سے ایک ایسا پاکستان اور ایسی قیادت جنم لے گی جو اس ملک کو پوری دنیا میں سرفراز کرے گی۔یہ سب اس لئے کہ اللہ کو ان دس لاکھ شہداء کی قربانیوں کی حیا آتی ہے اُسے اس تختی پر لکھے اپنے نام کی حیا ہے جو اس ملک کے باہر لٹکی ہے کہ یہ ملک اللہ کے نام پر وجود میں آیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

ڈورا ٹوٹ چکا

کائنات کے پراسرار رازوں میں سے بہت سے راز ایسے ہیں جنہیں عالم غیب کا مالک و مختار اور اس عالم رنگ و بو کا بادشاہ اور فرماں روا انسانوں پر وا کرتا رہتا ہے، کبھی یہ علم اور تحقیق کے پردے سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور دنیا کو حیران کر دیتے ہیں اور کبھی کسی کو ایسی باخبر چھٹی حس عطا کر دی جاتی ہے کہ اُس کے خوابوں بلکہ اکثر اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے والے حادثات و واقعات گھومنے لگتے ہیں۔ اس میں آدمی کے علاقے، مذہب اور نسل کی کوئی قید نہیں جسے یہ ادراک یا نفسیات کی زبان میں INTITUTION عطا کر دیا جائے۔ کچھ یہ بوجھ برداشت کر پاتے ہیں اور کچھ اس حد سے بڑھی عالم حیرت اور آنے والے دنوں اور حادثوں کی پہلے سے خبر کی وجہ سے جذب کے عالم میں آجاتے ہیں۔ سائنسی تحقیق کی اوّلین کہانیاں پڑھیں تو حیرت ہوتی ہے اور اللہ کا وہ دعویٰ کہ اسرار و رموز کو جب لت میں وحی کر دیا جاتا ہے جسے وحئ جبلی کہتے ہیں۔ سچ ثابت ہو جاتا ہے۔ نیوٹن نے کیوں سوچا کہ سیب زمین پر ہی گرتا ہے اوپر کیوں نہیں جاتا اور کشش ثقل ڈھونڈ نکالی، سٹیفن سن نے کیتلی سے نکلتی بھاپ پر کیوں غور کیا اور ریلوے انجن ایجاد کیا۔ فیراڈے نے مقناطیسی قوت کا جائزہ کیسے لیا اور رائٹ برادران نے اڑنے کے بارے میں اچانک کیسے جہاز تیار کر لیا۔ آپ کو ہر ایجاد ایسے لگے گی جیسے کسی شخص کے ذہن میں عام لوگوں سے مختلف بجلی کا ایک کوندا سا لپکا اور اُس نے اُس جانب غور کرنا شروع کر دیا۔ ایسے ہی انسانی ذہن میں سے چند ایک منتخب لوگوں کو اللہ یہ صلاحیت ودیعت کر دیتا ہے کہ جن کو اضطراب، بے چینی یا خوف کسی حادثے کی خبر دے رہا ہوتا ہے، کچھ ایسے ہیں جن کو ایسے خواب آتے ہیں کہ سچ نکلتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا سچے خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہیں۔ خواب استعاراتی بھی ہوں ان میں اللہ کی طرف سے ایک خبر ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ نے اپنے پیغمبر یوسف علیہ السلام کو ان کا علم عطا کیا۔ لیکن ان سب سے الگ کچھ لوگ وہ ہیں جن کی نشانیاں بتاتے ہوئے اللہ نے سورہ آلِ عمران کی آیت نمبر 191 میں فرمایا "جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوں پر لیٹے ہوئے اور آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق پر غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بے مقصد تو نہیں بنایا"۔ اللہ کے ذکر اور کائنات کی تخلیق پر غور انہیں اُس مقام پر لے جاتا ہے جس کے بارے میں سید الانبیاء ﷺ نے فرمایا "مومن کی فراست سے ڈرو، اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھ رہا ہوتا ہے"۔ اللہ کے نور کی وسعت بے حد و حساب ہے اور نور کی مدد سے جو نظر عطا ہوتی ہے اُس سے کائنات کے سربستہ راز آنکھوں پر عیاں ہونے لگتے ہیں۔ جیسے امریکہ میں کسی شخص کے پاس اگر یہ پیدائشی صلاحیت ہے کہ اُس پر وقت سے پہلے خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی ہے یا اُس کے خواب ہونے والا پورا واقعہ دکھ لیتے ہیں، تو اس کی کوئی دلیل نہیں بس مستقل تجربہ اُس کی سچائی ثابت کرتا ہے۔ ایسے ہی ان صاحبانِ بصیرت اور اہلِ نظر کی گفتگو کو سائنس کے ترازو میں نہیں تولا جا سکتا۔ ان کی صداقت کا ایک ہی ثبوت ہے کہ وہ عام زندگی میں بھی کبھی جھوٹ نہیں بولتے، ان کے کردار پر انگلی نہیں اُٹھائی جا سکتی۔ راست بازی اور پاکبازی ان کی پہچان ہوتی ہے اور شریعت محمدی ﷺ کی اتباع ان کی مقصدِ اولیٰ۔ ایسے لوگ اللہ کے سربستہ رازوں کے امین ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے نہ دعوے نکلتے ہیں اور نہ وہ اس امانت میں خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ البتہ جب اللہ ان کی بستی والوں سے ناراض ہو تو وہ بستی کے لوگوں کو خبردار ضرور کرتے ہیں۔ معافی کی، استغفار کی تلقین ضرور کرتے ہیں۔ کبھی ناراضگی اور عذاب کی خبر سخت ہو تو ان پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور پھر اشاروں کنایوں سے اُس عذاب کا تذکرہ کرتے ہیں کہ شاید لوگ استغفار کر لیں، روئیں اور فریاد کریں تو اللہ اس عذاب کو ٹال دے۔ ایک ایسے ہی صاحب بصیرت اور اہلِ نظر کی مجھ پر ایک طویل عرصے سے شفقت رہی ہے۔ نہ آستانہ، نہ پیری مُریدی، نہ دولت و شہرت اور نہ نام و مقام کی پرواہ، راہ چلتے کوئی دیکھ لے تو عام آدمی سمجھ کر نگاہ تک نہ ڈالے۔ لیکن اللہ کی کائنات کے رازوں کے امین ایسے کہ نہ کبھی دعویٰ کیا اور نہ زبان سے کسی پیشین گوئی کی بات۔ لیکن عالم یہ کہ دنیا بھر کے صاحبانِ نظر یوں مؤدب ہو جائیں کہ اب ان کے سامنے پر مارنے کی بھی مجال نہیں۔ تصرف ایسا کہ 2001ء میں حج کی سعادت میں ان کا قرب میسر ہوا، سوال کیا، کیسے پتہ چلے گا حج قبول ہو گیا۔ کہا پتہ چل جائے گا۔ پھر سوال کیا مگر کیسے۔ آنکھیں نیچی کیں اور جواب دیا سخت گرمی میں ٹھنڈی ہوا چلے تو پتہ چلتا ہے نا، عرفہ کا دن، شدید گرمی اور لو، جن لوگوں نے اُسی سال حج کیا گواہی دیں گے۔ لیکن جیسے ہی عرفات کے میدان سے کوچ کے لئے گولے کی آواز آئی صاف آسمان پر پتہ نہیں کہاں سے بادل آئے اور ایسے برسے کہ جل تھل ہو گیا۔ میں ایسے بہت سے واقعات کا گواہ ہوں لیکن سرزنش کے خوف سے اور شفقت سے محرومی کے ڈر سے بیان نہیں کرنا چاہتا۔ یہ سب اس لئے بیان کیا کہ گزشتہ دو سالوں سے مختلف اہلِ نظر اس قوم کو اجتماعی استغفار کی درخواست کر رہے تھے اور میں ان کا حکم سمجھ کر تحریر کرتا تھا۔ لیکن گزشتہ دو ماہ سے سب کی حیرت نمایاں تھی اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے یہ لوگ استغفار کی طرف مائل ہی نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ ناراض ہیں۔ زمین عدل سے خالی ہو گئی ہے اور اصلاح کی صورت نظر نہیں آتی۔ ایسے میں وہ سورہ الانعام کی 129 ویں آیت سناتے کہ "اور یوں ہم مسلط کرتے ہیں بعض ظالموں کو بعض پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے" یا پھر سیّد الانبیاء ﷺ کا یہ قول بتاتے کہ آپ نے فرمایا "اللہ ظالموں کو ظالموں کے ذریعے ختم کراتا ہے"۔ میں نے یہ بھی تحریر کیا اور ایک بار پھر اللہ سے رجوع اور استغفار کی درخواست کی۔ ٹارگٹ کِ لنگ شروع ہوئی تو دل خوف سے کانپنے لگا کہ اب تو صفائیوں کا موسم آ گیا۔ لیکن جس پریشانی اور تردد میں یہ سطریں میں تحریر کر رہا ہوں اُس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی دفعہ ان صاحب نے اپنی زبان سے ایسے لفظ ادا کئے ہیں کہ یوں لگتا ہے ہمارے اعمال کی سزا کا تعین ہو چکا ہے۔ پہلے ان سے درخواست کرتے تھے تو وہ خاموشی سے مسکرا دیتے، یا کہتے مجھے تو دیوار کے پار بھی نظر نہیں آتا۔ لیکن آج انہوں نے اچانک مجھ سے رابطہ کیا اور فرمایا "ستون نیچے سے نکال لیا گیا ہے اور چھت گرنے والی ہے لوگوں سے کہو معافی مانگیں، استغفار کریں" مجھے وہ خواب یاد آ گئے جو ان دنوں بہت لوگوں نے دیکھے۔ شہروں میں ظالم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو کر بھوکے بھیڑیوں کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ مارگلہ کی پہاڑیوں سے آتش فشاں پھٹا ہے اور لڑھکتے پتھر بھاگتے لوگوں کو روندے جا رہے ہیں۔ سیلاب ہیں کہ اُمڈے چلے آتے ہیں۔ سیّد الانبیاء ﷺ کی ترمذی میں درج اس حدیث پر بات ختم کرتا ہوں کہ اپنے گریبان میں جھانکیں اور دیکھیں کیا ہم عذاب کے مستحق ہیں یا نہیں اور کیا ہمیں استغفار کرنی چاہیے یا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "جب غنیمت کو ذاتی دولت ٹھہرایا جائے، امانت کو غنیمت سمجھا جائے، زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جائے، غیر دین کا علم پڑھا جائے، آدمی اپنی بیوی کی اطاعت کرے اور ماں کی نافرمانی، دوست کو نزدیک رکھے اور باپ کو دور، مساجد میں آوازیں ظاہر ہوں، فاسق و فاجر شخص قبیلے کا سردار بن جائے، قوم کا سردار ذلیل اور کمینہ شخص ہو، آدمی کے شر سے ڈرتے ہوئے اُس کی عزت کی جائے، گانے بجانے والیاں اور باجے ظاہر ہوں، شراب پی جائے، اس وقت کے لوگ پچھلے والوں کو لعنت کریں تو اُس وقت انتظار کرو، سُرخ ہوا کا، زلزلوں کا، زمین میں دھنس جانے کا، صورتیں بدلنے کا، پتھروں کے برسنے اور پے در پے نشانیوں کے ظاہر ہونے کا، جیسے موتیوں کی لڑی کا ڈورا ٹوٹ جائے اور دانے پیہم گرنے لگیں۔

راست باز گروہ

کس کس کے ہاتھ میرے گریبان تک آگئے" شکیل بدایونی کا یہ مصرعہ آج اتنی شدت سے یاد آرہا ہے کہ میں" نے بیوروکریسی کے ماضی اور حال پر ایک سرسری تبصرہ کیا کر دیا میرے ٹیلیفون پر کالیں، پیغامات، ای میل پر تبصرے ہی تبصرے اور خطوط، ایک تانتا بندھ گیا۔ میں گذشتہ دس سال سے کالم لکھ رہا ہوں، اس سے پہلے پندرہ سال پاکستان ٹیلی ویژن پر ڈرامے لکھے، مسلسل شاعری کی، ان تمام اصناف میں میرے اللہ نے یہ توفیق عطا کی کہ حاکم کوئی بھی ہو، گروہ خواہ اپنا ہی ہو، مسلک وہی ہو جس سے میں منسلک ہوں، میں نے ان سب سے بالاتر ہو کر اپنی بساط اور حیثیت کے مطابق سچ بولنے کی کوشش کی اور اس سچ کو ذاتی زندگی اور نوکری کے تسلسل پر قربان نہ کرنے کا حوصلہ بھی مجھے اُس ذاتِ واحد نے عطا کیا۔ میرے لئے آزمائشیں تھیں لیکن میرے اللہ نے آسان کر دیں۔ مجھے اس بات پر کبھی رنج اور ملال نہیں رہا کہ میرے اس تخلیقی کام اور کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا کہنے کے عمل میں میرے ساتھی میرا کس قدر تمسخر اڑاتے ہیں یا عرفِ عام میں مجھے کس طرح ایک کامیاب بیوروکریٹ کی لسٹ سے خارج سمجھتے ہیں۔ میں خود ان "عظیم" سرکاری ملازمین کی فہرست میں شامل ہونے سے ڈرتا ہوں جو نوکری کے تیس پینتیس سال کاسہ لیسی اور مصلحت کوشی میں یوں گذارتے ہیں کہ اس ملک پر ہونے والے تمام مظالم میں حصے دار بھی ہوں اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد اُس پر کھل کر تبصرے کریں اور راز افشاء کریں۔ میں اُس سچ کو جرم سمجھتا ہوں کہ جب اُس کی ضرورت تھی تو نہیں بولا گیا اور وقت گذرنے کے بعد اُسے افشاء کر دیا گیا۔ اس قوم کی تقدیر کے ساتھ یہ کھیل برسوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ مجھے اس بات پر کبھی ملال اور رنج نہیں ہوا کہ میں چار سال کے لئے دس ملکوں کی تنظیم ای سی او کے ایک اعلیٰ عہدے پر پوسٹ ہو کر چار سال کے لئے ایران گیا تھا۔ کئی سو امیدواروں کے درمیان سے میرا انتخاب ہوا تھا۔ مجھے ماہانہ تقریباً پانچ ہزار ڈالر تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن میرے وہاں پہنچنے کے صرف ڈھائی ماہ بعد لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا وہ آپریشن ہوا تھا کہ جس طرح کے ظلم کی مثال انسانی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ اگر اُس لمحے خاموش رہتا، اپنا سفارتی مرتبہ برقرار رکھنے کی فکر میں رہتا تو شاید خود کو کبھی معاف نہ کر پاتا۔ میری آواز کیا بلند ہوئی صرف چوبیس گھنٹے کے اندر مجھے واپس بلا کر او ایس ڈی کر دیا گیا۔ لیکن ایسا کرنے والوں کو شاید اس کا علم نہیں کہ یہ پانچ ہزار ڈالر مہینہ جس مالک کائنات کے اس حکم پر قربان ہوئے جس نے حق کی گواہی دینے کا حکم دیا ہے وہاں سے خسارہ کا تصور نہیں اور منافع اتنا کہ سوچ اور گمان سے الگ۔ یہ قصہ اس لئے بیان کرنا پڑا کہ اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ حق اور انصاف کے ساتھ درست بات کروں خواہ وہ میرے اپنے قبیلے، گروپ یہاں تک کہ میرے اپنے مفاد کے خلاف کیوں نہ ہو۔ میں نے اپنے کالم کو کبھی ذاتی تشہیر کا ذریعہ نہیں بنایا۔ کبھی کسی فرد کا نام لے کر اُس کے خلاف کالم نہیں لکھا۔ کسی کی شخصیت کا اپنے کالم میں مذاق نہیں اڑایا۔ میں نے کبھی اس راستے میں آنے والی مشکلات، مصائب، نوکری کی جنگ کا ذکر نہیں کیا کہ یہ میرا اور میرے اللہ کا معاملہ ہے اور میں اپنا اجر وہاں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میرے ساتھ جس نے جو بھی سلوک کیا، جیسا برتاؤ کیا، میں نے کبھی اپنے کالم میں، تحریر و تقریر میں اُس کا ذکر تک نہیں کیا کہ میں اپنے مقدمے اُس بارگاہِ ایزدی کی عدالت میں جمع کرواتا ہوں جہاں سے بے انصافی کی توقع کرنا ایمان سے خارج ہونا ہے۔

میرے ان کرم فرماؤں نے بیوروکریسی کے بارے میں میرے گزشتہ کالم پر بہت کچھ کہا۔ آج تک کسی فوجی ڈکٹیٹر یا سیاستدان نے کبھی میرے ساتھ یہ لہجہ اختیار نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے تم سچ کہتے ہو لیکن حالات ایسا نہیں کرنے دیتے۔ مجھے ان "افسران" سے کوئی گلہ نہیں اور میں ان سب کو صدقِ دل سے درگذر کرتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ سب لوگ ایک ایسے بدترین دور سے گذر رہے ہیں جہاں زندگی کی بقا گروہوں کے تعصب کی مرہونِ منت ہو گئی ہے۔ ڈاکٹروں، نرسوں، وکیلوں، صحافیوں، سیاستدانوں کے گروہ، سُنی، شیعہ، بریلوی، دیوبندی کے گروہ، برادریوں اور نسلوں کے گروہ۔ ان گروہوں میں خرابی یہ ہے کہ یہ اپنے بے ایمان، بددیانت، قاتل اور چور تک کی حمایت میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور دوسرے گروہ کے ایماندار، سچے اور شریف انسان پر بھی تہمت لگاتے ہیں۔ ایسے میں اگر کسی کو اپنا صحیح اور جائز حق بھی حاصل کرنا ہو تو وہ ان گروہوں کے تعصب کا حصہ بن کر حاصل کرتا ہے۔ اسی لئے اگر بیوروکریسی کی صوبائی سروس نے اپنا گروہ بنا لیا تو عجیب نہ تھا۔ لیکن اس گروہ کو مظلوم اور پاکبازی کی سند دینا میرے لئے مشکل تھا اور اگر مرکزی بیوروکریسی جس کا میں حصہ ہوں جسے عرفِ عام میں ڈی ایم جی کہتے ہیں تو انہوں نے خود کو پارسائی اور قابلیت کے مقام پر ہونے کا دفاع شروع کیا تو میرے لئے اُس طرف کھڑا ہونا بھی ناممکن تھا۔ ایسے میں اکثر لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ پھر تم کس طرف ہو۔ کس گروہ کے ساتھ ہو۔ پتہ نہیں کیوں آج میں اپنا ایک خواب بیان کرنا چاہتا ہوں جو میں گذشتہ دو دہائیوں سے دیکھتا چلا آرہا ہوں۔ دنیا کے ہر ملک میں حکومتی نظامِ کار کو چلانے کے لئے دیانت دار اور اہل لوگوں کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں ان دیانت دار لوگوں کی اکثریت اور غلبہ ہو وہاں انصاف اور امن کا راج ہوتا ہے اور جہاں بددیانت سپاہی اور پٹواری سے لے کر اعلیٰ عہدوں پر چھائے ہوئے ہوں وہاں قوموں کی تباہی کا افسانہ تحریر ہو رہا ہوتا ہے۔ میرے ملک کے لاکھوں سرکاری ملازمین میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو رزقِ حلال کماتے ہیں اور کمانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ چپڑاسی سے چیف سیکرٹری تک ہر جگہ موجود ہیں۔ لاکھوں اُستاد ہیں، ڈاکٹر اور انجینئر ہیں، ڈسپنسر اور نرسیں ہیں۔ ہر محکمے میں آپ کو ان کی کثیر تعداد ملے گی۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ اس ملک پر اور بیوروکریسی پر غلبہ طالع آزما سیاسی منظور نظر اور بددیانت لوگوں کا ہے جو ان دیانت دار لوگوں کو یوں پس منظر میں رکھتے ہیں کہ ان کا سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ طالع آزما اور بددیانت لوگ اپنی خوشامد، چاپلوسی اور کرپشن کی وجہ سے اہلِ اقتدار کے دلوں میں گھر کرتے ہیں اور ہر دور میں یکساں مقبول رہتے ہیں۔ فوجی آمر ہو یا سیاستدان سب کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بہت منظم ہیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ انہیں بچاتے ہیں۔ جس انجینئر کا سیکرٹری کے ساتھ لین دین کا رشتہ ہو وہ اسے بچائے گا، جس تحصیلدار کا ڈی سی او کے ساتھ کرپشن میں حصے داری ہو وہ اسے تحفظ دے گا۔ یہاں نہ ڈی ایم جی کی شرط ہے نہ پی سی ایس کی، نہ ڈاکٹر اور انجینئر، سب اپنے اپنے گروپ بھلا کر کرپشن کے حصے دار کا تحفظ کرتے ہیں، انہیں کسی گروہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن میرا ایک خواب یہ ہے کہ اس ملک کے تمام سرکاری ملازمین کا ایک ایسا گروہ وجود میں آئے جو اس بات پر حلف دے کر اکٹھا ہو کہ ہم نے کرپشن نہیں کی اور نہ کریں گے۔ ہم نے کسی کے دباؤ میں غیر قانونی کام نہ کیا ہے اور نہ کریں گے، ہم نے اس قوم کی امانت کی خیانت نہیں کی، سرکاری پلاٹ نہیں لئے، ہم نے اپنی پوسٹنگ کے لئے کسی سفارش اور بددیانتی کا سہارا نہیں لیا۔ یہ سب لوگ ڈی ایم جی سے ہوں، کسٹم انکم ٹیکس سے، پی سی ایس سے، ڈاکٹر، استاد یا انجینئر۔ ایک حلف لیں کہ ہم ہر اُس شخص سے قطع تعلق کریں گے جو بددیانت ہے خواہ ہمارے گروپ کا ہو، ہم اُس کا دفاع نہیں کریں گے۔ یہ وعدہ ہر مسلمان عشاء کی نماز میں دُعائے قنوت پڑھتے ہوئے اپنے اللہ سے کرتا ہے (وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ) "ہم ان سے قطع تعلق کرتے ہیں جو تیرے احکامات کے منکر ہیں" اور بددیانتی بھی اللہ کے احکام کا انکار ہے۔ اس گروہ کا کوئی نام دے لیں۔ راست باز سرکاری ملازمین، راست باز ملازمین ایسوسی ایشن۔ اگر یہ گروہ اکٹھا ہو گیا تو پھر کسی سیاستدان کو، جرنیل کو یا حاکم کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہو گی کہ میں کیا کروں مجھے دیانت دار اور اہل لوگ ملتے ہی نہیں۔ اگر دیانت داروں کا ایسا گروہ موجود ہوا تو یہ ایک پیمانہ بن جائے گا حکمرانوں کے لئے۔ جو اس پر انحصار کرے گا وہ دیانت دار اور جو دوسروں پر کرے گا وہ بددیانت۔ اگر ایسے لوگ اکٹھے ہو گئے تو مجھے اگر اُن کے کنونشن میں جھاڑو دینے، دریاں بچھانے اور کرسیاں ڈھونے کی ڈیوٹی بھی دی گئی تو میں اسے اپنے لئے فخر اور اپنی آخرت کے لئے سرمایہ سمجھوں گا۔

انجام کی جانب بڑھتے گروہ

اب تک یہ دونوں گروہ اس ملک کے وسائل کو لوٹنے اور اس میں اپنا حصہ وصول کرنے پر متفق ہو چکے ہوں گے، معاملات طے پا چکے ہوں گے۔ ساری بیوروکریسی چین میں آ گئی ہو گی۔ وہ جو باسٹھ سال تک اس ملک کے عوام کو شودر سمجھ کر ان پر حکمرانی کرتے رہے، کسقدر حیرانی کی بات ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کو یہ احساس ہوا کہ اسے لوٹ مار میں اتنا حصہ میسر نہیں آرہا جتنا باقی صوبوں میں میسر ہوتا ہے تو وہ دوسرے گروہ کے ساتھ دست و گریبان ہو گیا۔ میں اس بات پر کبھی قلم نہ اٹھاتا اگر ایک فائیو سٹار ہوٹل کے دبیز قالینوں اور ائر کنڈیشنڈ ہال میں کھڑے ہوئے کئی سو بیوروکریسی کے صوبائی عہدیداروں کے نمائندے نے للکار کر نہ کہا ہوتا کہ تم ایک طرف ہو جاؤ، یا تو حسین کی طرف یا یزید کی طرف اور پھر سورہ نساء کی ایک آیت کا بھی حوالہ دیا۔ مجھے اس قدر حیرت ہوئی کہ جس قافلہ کے سالار نے خود کو حسین کہا ہے ذرا اس کے شامل لوگوں کی طرف ایک نظر بھی اٹھا لیتے تو اسے اس مقدس نام کو لیتے ہوئے شرم محسوس ہوتی۔ یہ ملک کی تاریخ کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ باسٹھ سال جو لوگ شیر و شکر ہو کر اس ملک کے عوام کے ساتھ وہ سلوک کرتے رہے کہ اس کے بیان سے روح کانپ اٹھتی ہے انہیں آج کے اس دورِ ابتلا میں اپنے حصے کی لوٹ مار میں اضافہ چاہیے اور دوسری جانب وہ ہیں کہ اپنی اس زیادہ لوٹ مار میں ان کو شریک نہیں کرنا چاہتے۔ وہ جنہوں نے اس مملکتِ پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک سولہ کروڑ لوگوں پر سیکریٹریٹ کے دروازے بند رکھے، کس قدر مذاق کی بات ہے کہ کہتے ہیں ہم سیکریٹریٹ کی تالہ بندی کر دیں گے۔ یہ لوگوں پر بدترین حکمرانی میں برابر شریک تھے۔ بیوروکریسی اس مکمل گروہ کا نام ہے جس میں وہ چپڑاسی بھی شامل ہے جو دروازے پر کھڑا سائل سے رقم وصول کرتا ہے اور صاحب سے ملنے دیتا ہے اور اس سیکریٹری کا نام جس کی ملاقات کو لوگ مہینوں ترستے رہتے ہیں۔ فائیو سٹار ہوٹل کا وہ ہال جس کی جانب عام آدمی دیکھ بھی نہیں سکتا وہاں ان "محروم" افسران کی میں تقریریں سُن رہا تھا تو مجھے پٹواری کے پٹوار خانے میں مٹھی میں تڑے مڑے پسینے سے بھیگے نوٹ تھامے لوگ یاد آرہے تھے جو ایک جائز قانونی فرد حاصل کرنے کے لئے اُس کے دفتر کا بار بار طواف کرتے ہیں، ڈانٹیں اور جھڑکیاں کھاتے ہیں۔ قانونگو، تحصیل دار اور سب رجسٹرار کے دفاتر میں کلف لگے کپڑوں میں قبضہ مافیا کے لوگوں کا ہجوم یاد آرہا تھا اور چلچلاتی دھوپ میں وہ بے آسرا عوام کا روتا پیٹتا سمندر جن کی زمینوں پر ان تحصیل داروں، اور سب رجسٹراروں کی مدد سے چند غنڈے آبیٹھے تھے اور اب قانون کی کتابوں تک سے ان کا نام تک خارج ہو چکا تھا۔ چھپن سال تک مجسٹریسی نظام اور اُس کے تحت کچلے ہوئے لوگ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے، جس نے ہر حکومتِ وقت، آمریت ہو یا جمہوریت محکوم اور مجبور کو روند کر اُسے مستحکم کیا۔ کیا کیا گُر تھے جو یہ گھاگ مجسٹریٹ اور تحصیلدار جیسے لوگ اپنے افسرانِ بالا کو بتاتے تھے اور پھر وہ اپنے سیاسی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے ان پر عملدر آمد کرنے کو کہتے اور یہ کس خوشی اور دلجمعی سے ان پر عمل در آمد کرتے۔ اس ملک کے وہ سارے الیکشن میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے اور ان افسران کی وہ فنکاریاں یاد آگئیں جو نہ کسی سیاسی رہنما کی سمجھ میں آتی تھیں اور نہ اخبار نویسوں کی، بس نتیجہ ان کی مرضی کا بر آمد ہو جاتا تھا۔ مدتوں ان کا پولیس کے ساتھ گٹھ جوڑ تھا جس میں ایک عام آدمی اگر حق بات بولنے کیلئے ان کے پاس بیانِ حلفی بھی دینے جاتا تو پولیس کے حوالے ہو جاتا۔ یہ لوگ پچپن سال تک تھانوں کے انچارج رہے اور ان کی آنکھوں کے نیچے اُس تھانے میں تھانیدار مظلوم، بے بس اور بے سہارا لوگوں کے پورے خاندان کو اُٹھا کر لاتا اور مہینوں تک بغیر کسی رپٹ کے حبس بے جا میں رکھتا۔ ان کی تہہ بازاریوں کے قانون کی آڑ میں قبضہ کروائی گئی سرکاری زمینیں آج اس صوبے کے ہر شہر، قصبے اور علاقے میں نظر آتی ہیں۔ ان کی داستانیں سننی ہوں تو کسی بھی شہر میں کسی سائل کے سامنے ان کا نام لے کر دیکھ لو۔ کسی شخص کے نام کی ضرورت نہیں بس اتنا کہہ دو تحصیل، کچہری اور اُس کے زخم رسنا شروع ہو جائیں گے۔

اس سیکریٹریٹ جہاں یہ تالا لگا کر کام روکنا چاہتے تھے وہاں ان کی دست برد سے تو اس ملک کا مہذب ترین طبقہ تک محفوظ نہیں۔ سیکشن آفیسر کی ٹوٹی کرسیوں سے سیکرٹری کے عالیشان کمرے تک پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر اپنی چھٹی کی درخواستوں، پرموشن کے کیسوں کے لئے بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں۔ ان کی نذر میں تحفے اور تحائف پیش کرتے ہیں۔ ہر کیس کی فائل کو آگے بڑھانے کے لئے ان کی اعلیٰ مشینری میں تیل ڈالنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ان سب کو کٹہرے میں کھڑا کیا جائے اور ان استادوں، ڈاکٹروں، انجینئروں حتیٰ کہ ان کے اپنے ماتحت محکموں کے کلرکوں کو زبان دی جائے تو وہ بتائیں کہ انہوں نے کس کلرک سے لے کر اعلیٰ افسر تک کس کو کتنی رشوت دی۔ یہ تو وہ ڈائن ہیں جو اپنے ہی محکمے کے معمولی ملازمین کے پنشن پیپروں اور ٹی اے کے بلوں تک پر کمیشن وصول کرتے ہیں۔

زمینوں اور پلاٹوں کے اس قدر شیدائی ہیں کہ اس ملک میں موجود سب سے طاقتور طبقے صحافیوں کی کالونی میں بھی اپنے لئے پلاٹ الاٹ کروا لیتے۔ نہ یہ صحافی ہوتے ہیں اور نہ صحافت سے ان کا دور دور تک کوئی تعلق لیکن ایک رات میں قانون تبدیل ہوتا ہے اور میرے دوست صحافی بھی ان کی بلیک میلنگ کا شکار ہو کر انہیں صحافی کالونیوں میں پلاٹ الاٹ کر دیتے ہیں۔ ان کے تحصیلدار ہاؤس سے لے کر ڈی سی اور اب ڈی سی ہاؤس اور سیکرٹریوں کے بنگلوں تک سب رہائش گاہیں عام آدمی کے لئے ایسی ہیں جیسے اگر وہ اندر داخل ہوا تو ان کے دربانوں کے خوف سے پتھر کا ہو جائے گا۔ یہ وہ گروہ ہے جس نے باسٹھ سال اس ملک کے حکمرانوں، سیاستدانوں کو وہ گُر سکھائے جس سے میرا ملک دیوالیہ ہو گیا۔ انہوں نے ان کے راستے کی ساری رکاوٹیں دور کیں۔ خود بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے اور انہیں بھی نہلایا۔ اب جنگ و جدل کے طوفان میں حقوق کی آواز بلند کرتے ہیں۔ ایک جی او آر سے دوسرے جی او آر کی جنگ، ایک عہدے سے دوسرے عہدے کی جنگ۔ ایک گروپ سے دوسرے گروپ کی جنگ۔

یہ ہے وہ قافلہ جس کے قافلہ سالار کہتے ہیں کہ وہ اُس کے حسین ہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اُس نے مجھے کسی ایسے قافلے کا قافلے سالار نہیں بنایا۔ میرے دامن میں نہ نو سال ڈپٹی کمشنری کے دوران کوئی پلاٹ کا داغ ہے اور نہ بحیثیت صحافی اور اللہ نے مجھے یہ سب مراعات لینے سے انکار کی جراٴت عطا کی ہے۔ مجھے قرآن کی وہ آیت ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ تمہیں کسی گروہ کی محبت مجبور نہ کر دے کہ تم انصاف کا دامن چھوڑ دو۔ میں 1990 سے اپنے ڈراموں اور گذشتہ دس سال سے اپنے کالموں میں اپنے ہی گروہ کے بارے میں جو سچ تھا وہ لکھا اور ان کی نفرت بھی کمائی۔ میرے نزدیک یہ دونوں ایک ہیں، صرف ظالم جبکہ مظلوم تو عوام ہیں۔ ہاں اگر ان دونوں میں سے افسران کا ایک گروہ نکل کر ایسا آجائے جس کے دامن پر کوئی داغ نہ ہو، جو کہے ہم "ایماندار بیوروکریسی ایسوسی ایشن" بناتے ہیں تو میں ان کی جوتیاں سیدھی کرنے کو بھی تیار ہوں کہ یہ ہو گا حسین کا قافلہ۔ ورنہ جس قافلے میں بددیانت، بے ایمان اور ایماندار کی پہچان مشکل ہو وہ حسین کا قافلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان سب گروہوں کو اندازہ نہیں کہ جس ملک میں فاقہ کش لوگ تخت و تاج اُلٹنے والے ہوتے ہیں وہاں میرا اللہ ایسے ظالم گروہ کو اکٹھا کر دیتا ہے تاکہ لوگ پہچان سکیں کہ ان کو کس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنا ہے اور پھر جب لوگ اپنے اپنے دکھوں کا غصہ لئے سڑکوں پر نکلتے ہیں تو انہیں یہ سب لوگ ایک ساتھ کسی فائیو سٹار ہوٹل میں مل جاتے ہیں جیسے پیرس کے نواح میں ورسائی محل میں سب لوگ اکٹھے عوام کے غصے کا نشانہ بنے تھے اور کوئی ان کی چیخیں تک سننے والا نہیں تھا۔

سنت الٰہی

ہم پر ظالم مسلط کیسے ہوتے ہیں۔ کیوں ہوتے ہیں۔ کیا ہم ہی رہ گئے ہیں جن کے مقدر میں بددیانت اور نااہل صاحبانِ اقتدار ہوں۔ ہمارے دن کیوں نہیں بدلتے۔ ہمیں نجات کیوں نہیں ملتی۔ کیسے ملے گی نجات۔ کون ان سے لڑے گا۔ کون ان کو ختم کرے گا۔ ہم تنگ آگئے ہیں۔ مایوس ہو چکے ہیں۔ اہلِ نظر اور صاحبانِ بصیرت کی بشارتیں بھی تسلی کے دو حرف ہیں۔ نجوم اور ستارہ شناسی کے ماہر بھی بس آنے والے اچھے دنوں کی بات کرتے ہیں لیکن بتاتے کچھ نہیں۔ سیاسی تجزیہ کار تو بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ کوئی یقین کوئی اطمینان نہیں۔ یہ ہیں وہ سوال جو اس ملک کے ہر دردمند شہری کی زبان پر ہیں۔ کوئی غصے میں تِلملاتا ہوا پوچھتا ہے تو کسی کے دل میں درد اور آنکھ میں آنسو ہوتے ہیں۔ مجھے اکثر ان سوالات کا سامنا رہتا ہے۔ لیکن سوال کرنے والے اگر اس کائنات کے خالق اور مالک حقیقی کی آخری الہامی کتاب قرآنِ مجید کے صفحات کھول کر دیکھیں اور سیّدالانبیاء ﷺ کی پُرنور احادیث میں بتائی گئی نشانیوں کی روشنی میں دنیا کی پانچ ہزار سالہ معلوم تاریخ کا مطالعہ کریں تو اُنہیں قوموں پر ظالم، بددیانت اور خائن حکمرانوں کے مسلط ہونے کی وجہ بھی معلوم ہو جائے گی اور اس بات کا بھی ادراک ہو جائے گا کہ جب کسی خطے میں ظلم، زیادتی، بددیانتی اس قدر بڑھ جائے کہ زمین جہنم بن جائے تو اللہ نے ظالموں سے نجات اور ان کی بیخ کنی کا بھی اپنا ایک نظام وضع کیا ہوا ہے اور جب مٹھی بھر لوگ کسی قوم کو یرغمال بنا کر زمین کو فساد سے بھر دیں تو اللہ ان سے زمین کو پاک کیسے کرتا ہے۔ سورہ الانعام کی 129 ویں آیت اللہ کے اس تکوینی نظام سے پردہ اُٹھاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اور اس طرح ہم مسلط کر دیتے ہیں ظالموں کو ایک دوسرے پر ان کی کرتوتوں کے سبب" یہ ہے وہ کلیہ اور قاعدہ۔ جیسے وہ زمین سے مردار اور گندگی کو گدھوں اور مُردار کھانے والے جانوروں سے پاک کرتا ہے اور اُسے خوبصورت رکھتا ہے اسی طرح وہ جس سرزمین پر ظلم و زیادتی بڑھ جائے اور کوئی راستہ دکھائی نہ دے تو ظالموں کو ظالموں کا یوں خون کا پیاسا بنا دیتا ہے کہ یہ خود ایک دوسرے کی موت بن جاتے ہیں۔ دنیا پوری میں جانوروں کی آبادیاں انسانوں سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ روزانہ ان میں کروڑوں موت کی آغوش میں جاتے ہیں۔ قبرستان میں دفن ہوتے ہیں نہ جلائے جاتے ہیں۔ کروڑوں پرندے روزانہ موت کا رزق بنتے ہیں لیکن بدترین ملک بھی جہاں عام صفائی کا انتظام بھی درست نہ ہو، وہاں پر بھی ان کی لاشوں کے انبار نہیں لگتے، بدبو اور سڑانڈ سے بستیاں آلودہ نہیں ہوتیں۔ اسی طرح جس معاشرے میں انسانی اعمال کی بدبو سے تعفن پھیل جائے تو میرا اللہ اس زمین کی فضا کو درست کرتا ہے۔ سیّدالانبیاء ﷺ کے ارشاد کے مطابق جھوٹ ایک ایسا گناہ ہے جس کی بدبو سے فرشتہ کئی فرسنگ دور بھاگ جاتا ہے۔ جن معاشروں میں آج امن اور سکون ہے انہوں نے اپنی سیاست اور معاشرت سے جھوٹ کو ممکن حد تک نکال پھینکا ہے۔ وہاں کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے فراڈ کیا، میری ڈگری جعلی ہے لیکن اے میری قوم مجھے دوبارہ ووٹ دے کر منتخب کرو۔ وہاں صرف سچ چھپانے پر نکسن کو صدارت چھوڑنا پڑتی ہے۔ لیکن جب ایک جھوٹ ہی نہیں، بددیانتی، تعصب، گروہی اور مسلکی اختلاف اس قدر شدید ہو جائے کہ انصاف کی موت واقع ہو جائے تو پھر اللہ ظالموں پر ظالموں کو مسلط کر دیتا ہے اور وہ خونخوار بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے کا گوشت نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں۔ رومنوں پر افریقہ کے بربر چڑھ دوڑتے ہیں، بغداد کی ہلاکو اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے، نادر شاہ دلّی میں قتلِ عام کرتا ہے۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد پورا برطانیہ بحری قزاقوں اور بھتہ خوروں کی بستی بنتا ہے اور پھر دونوں ایک دوسرے کو ذبح کر کے ختم ہو جاتے ہیں۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ جب یہ بھیڑیئے لڑ لڑ کر کمزور ہونے لگتے ہیں تو پھر لوگوں کا جمِ غفیر ان پر ٹوٹ پڑتا ہے اور ان کی بوٹیاں نوچ لیتا ہے۔ لوگ جو ان کے ظلم سے تنگ آئے ہوتے ہیں، جنہیں سکھ کا سانس بھی مشکل سے میسر آتا ہے، اچانک ان میں بجلی جیسی طاقت آجاتی ہے۔

سورہ الانعام کی اس آیت کی تفسیر میں عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ؑ سے لے کر موجودہ دور کے م ف سرین نے سیّدالانبیاء ﷺ کی جو احادیث بیان کی ہیں وہ بھی ہمارے موجودہ المیے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ امام عبدالرزاق، ابن ابی حاتم اور ابوشیخ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ ؑ سے یہ قول نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان ان کے اعمال کے مطابق حاکم مسلط کرتا ہے۔ امام ابوالشیخ نے منصور بن الاسود سے اع مش سے اس کی تفسیر کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ جب لوگوں کے اعمال بگڑ جائیں تو شریر لوگوں کو ان پر حاکم مسلط کر دیا جاتا ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت یحییٰ بن ہاشم کی سند سے یونس بن اسحاق نے اپنے باپ سے یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جیسے تم ہوتے ہو ویسے تم پر حکمران مقرر کیے جاتے ہیں" امام بیہقی نے حضرتِ حسن رضی اللہ عنہ ؑ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے فرمایا "میری رضامندی اور ناراضگی کی واضح علامت یہ ہے کہ میں اگر راضی ہوں تو ان پر شریف اور نیک حکمران مسلط کروں گا اور اگر ناراض ہوں تو ان پر شریر حکمران مسلط کروں گا" یہ ہے اُس پہلے سوال کا جواب کہ ہم پر ظالم کیوں حکمران ہوتے ہیں۔ اپنے گریبان میں جھانکیں اور ساٹھ سالوں میں اپنے علاقوں میں امیدواروں کی فہرست اُٹھا لیں، جو سب سے زیادہ شریف، نیک چلن اور ایماندار ہو گا اُس کو سب سے کم ووٹ ملے ہوں گے۔ کیسا مضحکہ اُڑایا جاتا ہے۔ اس نے کونسا جیتنا ہے۔ ہمارے اجتماعی گناہوں کا تو حساب بھی مشکل ہے۔ ظلم و بربریت پر خاموشی، بددیانت، ظالم، رسہ گیر اور چور کی عزت، تعصب کا وہ عالم کہ اپنے گروہ کے چور، ڈاکو، بے ایمان، ظالم اور قاتل تک کی حمایت اور دوسرے گروہ کے شریف اور ایماندار شخص کی ذلت و رُسوائی۔ یہ تھے ہمارے اعمال جن کی وجہ سے ہم پر ہمارے جیسے حکمران مسلط کئے گئے۔ کیا ہم بدل گئے کہ ہمارے حالات بدل جائیں، ایسا کیسے ہو گا۔ یہاں اللہ قرآن میں ایک اور اصول وضع کرتے ہیں کہ "اللہ نے کبھی اُس قوم کی حالت نہیں بدلی جب تک اُسے اپنی حالت خود بدلنے کا خیال نہ آئے" یہ وہ کیفیت تھی جسے اہلِ نظر ایک طویل عرصے سے محسوس کر رہے تھے کہ اس ملک کا عام آدمی اپنے حالات بدلنے کی خواہش کرتا ہے، آرزو کرتا ہے، رو کر دعا بھی کرتا ہے اور مجبوری میں بددعا بھی دیتا ہے لیکن اُس کا بس نہیں چلتا۔ اُسے یرغمال بنا لیا گیا ہے۔ اُسے تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اُسے خوفزدہ بنا دیا گیا ہے۔ جب کوئی راستہ سجھائی نہ دے اور زمین ظلم، زیادتی اور بددیانتی کی بدبو سے تعفن زدہ ہو جائے تو پھر ظالم ایک دوسرے کو خود ختم کرتے ہیں اور کوئی ان کو روکتا تک نہیں۔ وہ جنہیں اللہ نے بصیرت عطا کی ہے وہ دیکھ رہے ہیں کہ اب تعصب اور گروہ بندی کی بربریت میں عام آدمی کے سر نہیں بلکہ ان کی گردنیں نشانے پر ہیں جنہوں نے زبان کے نام پر، مسلک کے نام پر، علاقے، پیشے اور نسل کے نام پر معصوموں کی جان سے ہولی کھیلی۔ بتانے والے تو یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ طوفان اس قدر شدید ہو گا کہ جس جس نے نفرت کی فصل بوئی ہے اُسے پناہ تک نہیں ملے گی۔ کوفے والے جب اپنی منافقتوں اور بدعہدیوں کی وجہ سے اس مقام پر آگئے تھے کہ ان سے اللہ کو خیر کی اُمید ختم ہو گئی تھی۔ ان کے جرائم میں سیّدنا امام حسین علیہ السلام سے لے کر امام زید بن علی سے بدعہدی اور منافقت مسلم ہو گئی تو ان کے ظلم پر حجاج کا ظلم مسلط ہوا اور اُس کا وہ تاریخی فقرہ آج پھر گونجتا سنائی دے رہا ہے۔ حجاج نے تمام شہر کے سرکردہ لوگوں کو مسجد میں اکٹھا کیا اور کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ سروں کی فصلیں پک چکی ہیں اور کٹنے کو تیار ہیں" اور پھر میرے اللہ کی وہ سنت قائم کر دی گئی جو سورہ الانعام میں ہے کہ "ہم ظالموں کو ظالموں پر مسلط کر دیتے ہیں ان کے کرتوتوں کی وجہ سے"۔

کاسٹک سوڈا اور میل

جس کسی کو کوئی گروہ، قبیلہ، قوم، گروپ یا شعبہ میسر آجاتا ہے وہ پاک، پوتر، معصوم عن الخطاء اور اعلیٰ مقاصد کا ترجمان ہو جاتا ہے۔ دنیا کے سارے عیب، ساری برائیاں اور سب نقائص دوسرے گروہوں میں ہوتے ہیں اور اپنا گروہ قبیلہ اور گروپ ان سب سے پاک اور مبراء۔ دنیا میں کسی بھی قوم کی تباہی اور بربادی کی تاریخ اُٹھالیں، آپ کو وہاں یہ صفت سب سے نمایاں نظر آئے گی۔ جب اپنے گروہ اور قبیلے کا تعصب اس قدر شدید ہو جائے کہ سارے ذاتی اختلافات بُھلا کر کسی ایک مشترکہ دشمن کے خلاف متحد اس طرح ہوں کہ اپنی بُرائی اور عیب پر بھی فخر کرنے لگیں تو پھر قومیں اللہ کے قرآن کے مطابق عذاب کو دعوت دیتی ہیں اور تاریخ کی گواہی کے مطابق یا تو ملیامیٹ ہو جاتی ہیں یا پھر کشت وخون کے سیلاب میں اس قدر نہاتی ہیں کہ ان کی ساری غلاظتیں دور ہو جاتی ہیں ۔ شعیب علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی اقوام الہامی کتابوں میں نشانیوں کے طور پر درج ہیں کہ یہ سب اپنے گناہ پر اصرار کرتی تھیں اور پھر اُس کے دفاع کیلئے متحد ہو جاتی تھیں۔ لیکن تاریخ روم، یونان، فرانس، روس اور ایران کی ملیامیٹ ہوتی اور خون میں نہاتی بستیوں کا ذکر کرتی ہے تو ایک ہی جرم ان کے کھاتے میں نظر آتا ہے۔ جو گروہ طاقتور ہو گئے، جن کے ہاتھ میں کسی بھی قسم کا اختیار آگیا انہوں نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ہم پاک ہیں، عیب سے بالاتر ہیں۔ ہم روم میں سٹیڈیم میں شیروں کے سامنے قیدیوں کو ڈال کر تماشہ دیکھیں، یونان میں ہم جنس پرستوں کے مجسمے بنا کر چوراہوں پر لگا کر فخر کریں، فرانس میں ہزاروں لوگوں کو شیاطینی روح کے اثر میں گردان کر آگ میں جلائیں، روس میں راسپوٹین کی جنسی وحشت کو روحانی کمالات کا روپ بتائیں یا ایران میں ہزاروں لوگوں کو ترقی اور امریکی کاسہ لیسی میں قتل کریں، ہمیں اپنے کسی فعل پر کوئی شرمندگی نہیں۔ ان سب کاموں میں جو ہمارا ساتھی ہے وہ جو کچھ بھی کرے معصوم ہے اور جو مخالف ہے وہ کچھ بھی نہ کرے لیکن خطا کا پُتلا ہے۔

ہم آج ٹھیک اُس حالت پر پہنچ چکے ہیں۔ آپ کسی کی دُم پر پاؤں رکھ کر دیکھیں پورے کا پورا گروہ گھورتا، غراتا، آنکھیں لال کرتا ہوا آپ پر ٹوٹ پڑے گا۔ تمہیں جرأت کیسے ہوئی ہماری جانب اُنگلی اُٹھانے کی۔ میرے ملک میں کبھی یہ کیفیت صرف ایک دو گروہوں کی ہوتی تھی اور وہ بھی اہلِ اقتدار یا ان کے شریک افراد کی۔ لیکن ڈھکی ستر چھپی۔ ان گروہوں کی رعونت اور عام آدمی کو شودر اور خود کو برہمن کہلانے کا اندازہ لگانا کس قدر آسان تھا۔ کی دہائی تک یا تو جھنڈے والی گاڑیاں ہوتی تھیں یا آرمی کی فلیگ کاریں۔ باقی سولہ کروڑ عوام کی بسیں، کاریں، سائیکلیں اور موٹر سائیکلیں۔ پھر سُرخ، سبز اور نیلے رنگ کی مخصوص پلیٹوں کا رواج شروع ہوا۔ پہلے صرف دو طبقے اس مرض میں مبتلا ہوئے، ایم این اے، ایم پی اے اور سینیٹرز ایک طبقہ اور ڈی سی، ایس پی، اے سی وغیرہ دوسرا طبقہ۔ حسبِ منشاء نیلی لال ایمبولینس کی بتیاں بھی گاڑیوں کی زینت بنیں اور سڑکوں پر ان فرعون صفت سواریوں کی آمدورفت شروع ہو گئی۔ ان کی دیکھا دیکھی ضلع کونسل، زکوۃ کمیٹی، کونسلر میدان میں کودے، یہاں تک کہ جس کے پاس موٹر سائیکل ہی تھی اُس نے بھی اپنی علیحدہ نمبر پلیٹ سجالی۔ اس ذات پات کی دوڑ میں ان دونوں گروہوں کی پیروی کرنے والا طبقہ صحافی نکلا، اپنی گاڑیوں کے ساتھ علیحدہ طور پر یا آدھی نمبر پلیٹ پر پریس لکھوا کر یہ بھی زناٹے بھرنے لگے۔ فوج کی گاڑیاں تو پہلے دن سے نمایاں تھیں کہ نمبر پلیٹ ہی علیحدہ تھی ۔ سرکار نے بھی اپنی گاڑیوں کی نمبر پلیٹوں کا رنگ سبز کر لیا۔ دوسری جانب جس فوجی افسر کو سرکاری گاڑی میسر نہ تھی اُس نے سٹیکر کی صورت میں یا نمبر پلیٹ پر پاک آرمی لکھوا لیا۔ اس دوڑ میں شریک ہونے والے اگلے دو طبقات تھے ڈاکٹر اور وکیل۔ پہلے سٹیکر لگے پھر نمبر پلیٹیں تک لگنے لگیں۔ پہلے تین طبقات یعنی فوج، بیوروکریسی اور سیاست دان اپنے طور پر نمایاں ہونے کے علاوہ جو مراعات لیتے تھے ان میں بحیثیت گروہ پلاٹ ایک بہت بڑا اثاثہ تھا جو سولہ کروڑ عام آدمیوں کو میسر نہ تھا کہ وہ کسی گروہ سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ یہ تینوں گروہ سولہ کروڑ عوام کی ملکیت سرکاری زمین کو کوڑیوں کے مول پلاٹوں کی صورت میں بحیثیت ایک گروہ اپنے آپ میں تقسیم کر لیتے۔ یہ اس گروہ کا بحیثیت مجموعی رویہ تھا۔ یہ دلیل دیتے کہ یہ ایک عام فوجی کا حق ہے جو پچیس سال فوج کو دیتا ہے، یہ عام سرکاری ملازم کا حق ہے جو عمر سرکار کی نذر کرتا ہے۔ حالانکہ پلاٹ ملتا خاص لوگوں کو زیادہ اور عام لوگوں کو کم ۔ ریلوے کالونی، پی آئی اے کالونی، واپڈا کالونی، جس کے ہاتھ میں جو زمین عوام کی تھی اُس نے پورے گروہ پر قربان کر دی۔ ایسے میں صحافی کیسے پیچھے رہتے۔ صحافی کالونیاں وجود میں آئیں اور وہ بھی سولہ کروڑ عوام کی ملکیتی زمین پر اور "غریب و نادار" صحافیوں کے لئے، جوڈیشل کالونیاں بنیں ججوں کے لئے۔ سب گروہ اس ملک میں اس قدر طاقتور ہو گئے کہ کوئی کسی کا عیب تو نکال کر دکھائے۔ کوئی ان کی گاڑی کو تو ہاتھ لگائے۔ جس طرح جم خانہ اور دیگر کلبوں میں جو ہوتا رہے کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکے اسی طرح وکیلوں اور صحافیوں کے کلب بھی مقدس ترین مقامات بن گئے۔ ان کی گاڑیاں مقدس ترین سواریاں ہو گئیں۔ اور ان سب گروہوں کی گھورتی ہوئی آنکھیں عام انسانوں کے لئے خوف کا تازیانہ بن گئیں۔ جیسے کبھی کوئی چودھری گاؤں میں کہتا تھا کہ کون ہے جو ہمارے عیب اُچھالتا ہے اُس کی زبان خاموش کر دو، اسی طرح یہ سارے گروہ ایک دوسرے پر یوں پل پڑے جیسے خوفناک لشکر ایک دوسرے کے خلاف، سیاست دان نے ڈاکٹر کی پٹائی کی، ڈاکٹر نے صحافی کا کیمرہ توڑا، صحافی نے یوں کسی کی عزت اُچھالی کہ منہ دکھانے کے قابل تک نہ رہا۔ حقوق کی جدوجہد، مار کھانے کے تمغے اور حق وصداقت کے پرچم ہر ایک کے سینے پر سج گئے۔ اگر کوئی اس ملک میں بے توقیر، بے عزت، بے گھر اور کم مرتبہ رہا تو وہ اس ملک کا عام آدمی تھا۔ مفلوک الحال کسان جو ہل چلاتا اور یہ سب کھانا کھاتے، جو مل میں کام کرتا تو یہ گروہ کپڑا اور جوتا پہنتے۔ سارے قانون، سارے مقدمے، سارے جوتے اسی کے لئے تھے۔ سیاست دان، جرنیل، بیوروکریٹ اور جج پر پہلے ہی کوئی ہاتھ نہ ڈال سکتا تھا۔ مدتوں سے پولیس کے افسران میں محکمۂ اطلاعات کے افسران صحافیوں کی خطاؤں کو ختم کرنے کی کئی سال تک ڈیوٹیاں دیتے رہے اور اب تو پولیس ویسے ہی اپنی کرپشن عیاں ہونے کے خوف سے میڈیا کے ساتھ ایک غیر تحریری سمجھوتے میں ہے۔ وکیلوں نے ایک جنگ عدلیہ کی بحالی کے لئے کیا لڑی اُن کا اب یہ حال ہو گیا ہے جیسے فاتح فوج مفتوح علاقے پر آگھسی ہو۔

یہ میرے ملک کا وہ المیہ ہے جس نے اس کو گروہ در گروہ تقسیم کر دیا۔ ہر گروہ اپنا تحفظ کرنا قانونی حق سمجھتا ہے اور اس لڑائی میں وہ انصاف کے تمام اُصول پامال کر دیتا ہے۔ انصاف کی کرسی سب کے پاس ہے، سیاست دان، بیوروکریٹ، وکیل، صحافی۔ لیکن اپنے قبیلے کے بارے میں انصاف کا ترازو توڑ دیا جاتا ہے۔ موٹی موٹی لال آنکھیں نکال کر کہا جاتا ہے، بتاؤ ہم میں کون خراب ہے، نام لو، واضح کرو اور سامنے والے کو پتہ ہوتا ہے اس کے جواب میں کیا آئے گا۔ سب اپنے گناہوں کے خوف کے سمجھوتے میں ہوتے ہیں۔ جب قومیں بے انصافی کے غرور میں ڈوبے گروہوں میں یوں بٹ جائیں اور اپنے اندر جھانکنا چھوڑ دیں تو میرے اللہ کا ایک قانون ہے کہ ظالموں کے گروہوں کو ظالموں سے لڑا کر زمین کو پاک کرتا ہے تاکہ یہ انسانوں کے لئے رہنے کی جگہ بن سکے۔ یہ دنیا اُس کا باغ ہے اور وہ اس باغ کو اُجڑتا نہیں دیکھنا چاہتا۔ جب اس قدر جھاڑ جھنکار ہو جائے کہ سچ اور انصاف کی فصل اُگنا مشکل ہو جائے تو پھر پورے کھیت پر ہل چلایا جاتا ہے اور اب ہل چلانے کا موسم آگیا ہے۔ کپڑا جب صابن سے رگڑنے یا ڈنڈے سے کوٹنے سے بھی صاف نہ ہو تو دھوبی اُس میں کاسٹک سوڈا ڈال کر اُبالتا ہے جس سے میل اُبل کر باہر آجاتی ہے۔ کاسٹک سوڈا ڈل چکا۔ سب کی میل اُبل اُبل کر سامنے آرہی ہے۔ اللہ کے دستور کے مطابق ظالموں کے گروہ آپس میں ٹکرا کر خود ہی پاش پاش ہوں گے یا تاریخ کے فیصلوں کے مطابق لوگ اُٹھیں گے اور کاسٹک سوڈے سے واضح ہونے والی میل سے اپنی دھرتی کو پاک کر دیں گے۔ انجام سامنے ہے۔ آج یا کل، دھرتی نے تو پاک ہونا ہی ہے۔ اس لئے کہ جب گروہوں کی عصبیت انصاف کے راستے کی رکاوٹ بن جائے، مسالک کی جنگ اللہ تک پہنچنے کے راستے مسدود کر دے تو پھر باغ کو سنوارنے کے لئے قضائے قدرت کے کارندے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔

کچھ نہیں بچے گا

سرزمین حرم میں جب سیّدنا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے دربار پر ہونے والے سانحے، انسانی جانوں کے زیاں، اور ایک ایسے مقام کی بے حرمتی کہ جہاں ملک بھر سے پردیسی، بے آسرا اور بے خانماں لوگ دو وقت کی روٹی اور رات کی نیند کا ٹھکانہ پاتے ہیں، ایسے محبتوں اور عقیدتوں سے جڑے آستانے کی خبر جب مجھے ملی تو میں عین خانۂ خدا کے روبرو، اُس پر نظریں گاڑے اپنے اُس ملک کی سلامتی اور ظالموں سے نجات کی دعائیں مانگ رہا تھا، جو اس کرۂ ارض پر واحد ملک ہے جو اُس خانۂ خدا کے مالک اور کائنات کے حقیقی فرمانروا کے نام پر وجود میں آیا ہے۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ اور اب واپس اس بلدالامین تک سیّدالانبیاء ﷺ کی ایک حدیث یاد آتی رہی کہ میری اُمت کا عذاب یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ کر اور ایک دوسرے کو قید کر کے عذاب کا مزا چکھو گے۔ لیکن اس حدیث مبارکہ سے جو لرزہ میرے وجود پر طاری تھا ایسے میں صرف عذاب سے نجات کی دعا مانگنے کے لئے ہاتھ اُٹھاتا تو معلوم نہیں کیوں ظالموں سے نجات کی دعائیں نکلنے لگتیں۔ اپنی اس کیفیت کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ مغرب کی نماز کھڑی ہو گئی اور حرم کے در و دیوار پر امام کی زبان سے قرآنِ پاک کی وہ آیات گونجنے لگیں جس میں حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے دُعا کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان ظالموں کا زمین پر وجود تک ختم کر دے۔ میرا خوف اس قدر شدید تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ حرم کے صحن اور مسجد نبوی کی پُرنور فضاؤں میں بیٹھے ہوئے میں صرف ایک بات سوچتا رہا کہ میرے ملک کے علماء خواہ وہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں انہوں نے قرآن میں بیان کی گئی عذاب کی علامتوں اور وجوہات اور سرکارِ مدینہ ﷺ کی بتائی ہوئی نشانیوں کو حدیث کی ہر کتاب کے بابِ فتن میں ضرور پڑھا ہو گا۔ کیا میرے اللہ نے ان سے بصیرت چھین لی ہے کہ وہ مملکت خداداد پاکستان پر چھائے ہوئے اللہ کے خوفناک عذاب کو جنگ سے تعبیر کر رہے ہیں۔ ایک ایسی جنگ جسے جیتنے کی ان مدرسے کے مدرسوں، خانقاہ نشینوں اور مسجد کے خطیبوں میں نہ ہمت ہے اور نہ طاقت، ہاں اللہ سے استغفار کریں اور مدد طلب کریں تو اُس کی نصرت سے دلوں میں محبت پیدا ہو جائے۔ جو اللہ قریش اور انصارِ مدینہ کو قرآن پاک میں بتلاتا ہے کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے لیکن ہم نے آپ کے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی۔ میرے ملک کے علماء سے تو مدینہ کے اوس و خزرج کے وہ قبائل زیادہ ہوشمند تھے کہ مدتوں ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے اور پھر سیّدالانبیاء ﷺ کے حضور حاضر ہوئے اور عرض کی، آپ مدینہ تشریف لے آئیں تاکہ آپ کی وجہ سے ہمارے دلوں سے نفرتیں دور ہو جائیں۔ کیا ان علماء نے سورہ قریش میں اللہ کا وہ دعویٰ نہیں پڑھا کہ یہ وہی ہے جو بھوک میں کھانا دیتا ہے اور خوف میں امن۔

لیکن یہ کہانی اتنی سادہ نہیں۔ یہ گورکھ دھندہ اتنا اُلجھا دیا گیا ہے کہ اگر یہ سب علماء مل کر نہ بیٹھے تو کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔ آج سے تقریباً ایک سال قبل، ابھی سوات کا آپریشن شروع نہیں ہوا تھا، میں ایک ٹیلی ویژن کے پروگرام میں ایک "عظیم دانشور" کے ساتھ موجود تھا۔ دہشت گردی کا چرچا تو ہر پروگرام میں ہوتا ہے۔ اس عظیم دانشور نے کہا میں نے حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ ان خودکُش حملہ آوروں کے خلاف "سوادِ اعظم" کو اکٹھا کریں یہ خود ان سے نپٹ لیں گے۔ ان کا یہ فقرہ سُن کر میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ میں نے کہا آپ تو فسادِ خلق کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ لیکن پھر تھوڑے ہی عرصے میں وزارتِ مذہبی امور سے لے کر صوبائی اوقاف کے محکموں تک اس مشورے کی گونج سنائی دینے لگی۔ بیانات، فتوے، جلوس، سب کچھ شروع ہوا۔ حکومتی سطح پر میڈیا کو اس ساری جدوجہد کو نمایاں کرنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے جس جگہ تک رسائی تھی، ہاتھ جوڑ کر کہا ایسا مت کرو۔ وہ جو خودکش حملہ آور ہے اسے تو غلط ترغیبات اور فتووں سے بڑھکایا گیا ہے۔ اسے سب لوگ غلط سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر اسے مسالک کی جنگ بنایا گیا تو یہ بہت خوفناک ہو گا۔ لیکن کون سنتا تھا۔ اس جنگ کو آگ دینے والے بہت تھے۔ کتنے دردِ دل رکھنے والے علماء مجھ سے ملے۔ آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ کہ اللہ کے واسطے کوئی انہیں سمجھائے۔ دونوں جانب ایسی آگ بڑھکے گی کہ ختم نہ ہو سکے گی۔ ادھر امریکی سفارت خانے نے اپنے خزانے کھولنا شروع ہوئے۔ مسجدوں، مزاروں اور مدرسوں میں بحالی کے کام کے نام پر لاکھوں ڈالر دیئے گئے۔ ایسی ہی ایک تقریب جہانگیر کے مقبرے پر منعقد ہوئی۔ میں بھی وہاں مدعو تھا کہ لاہور شہر کی سنہری مسجد کے لئے امریکی سفیر نے ہزاروں ڈالر دینے کا اعلان کرنا تھا۔ مجھے نیتوں کا علم تھا اس لئے وہاں نہ گیا۔ لیکن وہاں نعرۂ تکبیر "سے لے کر ہر نعرہ لگانے کے بعد آخر میں امریکی سفیر زندہ باد کا نعرہ بھی بلند کیا گیا۔ یہ مسلمانوں کا "مصالحانہ رویہ ظاہر کرنے کا اقدام تھا جو امریکیوں نے رینڈ کارپوریشن کی سفارشات کے بعد شروع کیا تھا۔ جس میں صوفی اسلام کا ٹھیکیدار ہر کوئی بن بیٹھا۔ پہلے صوفی کونسل پرویز مشرف نے بنائی اور اب اکادمی ادبیات بھی صوفیاء کی امین بن گئی۔ کیا کوئی اس بات کا جواب دے سکتا ہے کہ برصغیر کے تمام صوفیاء حکومتوں سے کتنا دور رہے بلکہ ان کے ہر غلط عمل کے خلاف علم جہاد بلند کرتے رہے۔ مفتی اور فتویٰ فروش علماء تو ال تحت مش کے ساتھ تھے اور قطب الدین بختیار کاکی اپنے مُرشد معین الدین چشتی اجمیری کے ہمراہ اُس کے سامنے بو علی قلندر کا وہ فقرہ کہ "ورنہ بخشم ملکِ تو ما دیگری" (تمہارا ملک کسی دوسرے کو بخش دوں گا)، ہنوز دلی دور است کا نعرہ مستانہ کسی مفتی نے نہیں ایک صوفی نے لگایا تھا اور اکبر اور جہانگیر کے سامنے کلمۂ حق کہنے مجدد الف ثانی کھڑے ہوئے تھے اور گوالیار کے قلعے کی قید انہیں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی وہ المیہ ہے کہ جب اقبال مجدد الف ثانی کے دربار پر حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی تو کشف سے جو جواب ان کو ملا وہ ہماری آج کی حالت سے مختلف نہیں:

ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار
پیدا کلہ فقر سے یاں طرۂ دستار

یہی وہ مایوسی تھی کہ اقبال پکار اُٹھے:

قم باذن اللہ کہنے والے رُخصت ہو گئے
اب مزاروں پر مجاور رہ گئے یا گورکن

اس ساری فتنہ پردازی میں امریکہ، اربابِ اختیار اور وہ دانشور پیش پیش تھے جو چاہتے تھے کہ یہ جنگ حکومتوں سے نکل کر مسالک کی جنگ بن جائے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے احمدیہ ٹی وی پر قادیانیوں کے موجودہ سربراہ کو جامعہ حفصہ کے واقعے کے بعد اور اس سے ذرا پہلے انہی دانشوروں کے کالموں کا حوالہ دیتے ہوئے سنا اور اُس نے کہا دیکھو آج جو بات یہ کالم نگار کہہ رہے ہیں مرزا غلام احمد نے کہی تھی کہ میں ایسا پیغام لے کر آیا ہوں کہ اب جہاد بالسیف کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس کی یہ تقریر جولائی 2007ء کے کسی جمعہ کے دن کی ہے۔ کیا میرے ملک کے علماء کو اس بات کا علم نہ تھا کہ فتنوں کے زمانے کے بارے میں سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا "لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ قاتل کو معلوم نہ ہو گا کہ کس سبب سے اُس نے قتل کیا اور مقتول کو یہ علم "نہ ہو گا کہ اُسے کس سبب سے قتل کیا گیا۔

ایسا کس طرح ہو گا فرمایا کہ ہرج ہو گا، اس میں قاتل و مقتول دونوں دوزخ میں ہوں گے (مسلم)۔ لیکن کیا کریں ہم ابھی بھی امریکہ کے کہنے پر اسے دہشت گردی کی جنگ کہتے کہتے اپنا ملک اُجاڑ بیٹھے ہیں۔ ہم سے تو وہ افغان ہزار درجہ بہتر رہے کہ انہیں اتنا یقین تو تھا کہ جس سے لڑ رہے ہیں وہ کافر ہے اور مریں گے تو شہادت یقینی۔ اور آج اللہ نے ان کی قلیل تعداد کو فتح سے ہمکنار کیا۔ لیکن ہم وہ بزدل تھے جو ڈرتے رہے کہ ہمارا تورا بورا نہ بن جائے اور آج پورا ملک تورا بورا بن گیا۔ اور اب ہم اس تورا بورا کو مسالک کی بھٹی سے آگ دے کر سلگا رہے ہیں۔

سیّدالانبیاء ﷺ کے سبز گنبد کے سائے تلے کھڑا میں التجاؤں سے سوچ رہا ہوں کہ اگر ہم نے آپ کے فرمان کے مطابق اس کو عذاب نہ سمجھا تو پھر اس عذاب میں اہلِ نظر کو کٹتی ہوئی سروں کی فصل میں ہرے، کالے، سفید، نارنجی سب عماموں والے سر بھی نظر آ رہے ہیں۔ چنگیز جب نیشاپور فتح کرنے نکلا تو وہاں فریدالدین عطار موجود تھے۔ فوج جاتی وہ ایک پیالہ اوندھا کر دیتے۔ نیشاپور فوج کی نظروں سے غائب ہو جاتا۔ دو روز ایسا ہوا۔ تیسرے روز چنگیز خود روانہ ہوا۔ ایک شخص فریدالدین عطار کے سر پر آ کھڑا ہوا اور کہا بس اب حکم خداوندی آ گیا ہے، اگر پیالہ اوندھا کیا تو تمہارا سر قلم اور تمام مقامات چھین لیں گے۔ چنگیز نیشاپور میں داخل ہوا اور پہلا سر فریدالدین عطار کا قلم ہوا۔ اے میرے پروردگار! اے رحمٰن و رحیم! اے التجاؤں کے سننے والے! یہ علماء جانتے ہیں، سمجھتے ہیں، انہیں ادراک عطا کر تاکہ یہ تیرے غضب کے اشارے کو سمجھ سکیں ورنہ اس کے بعد قلم لکھنے کی تاب نہیں رکھتا۔ استغفر اللہ

☆☆☆☆☆

نگاہ یا رسول اللہ ﷺ نگاہ

اس قوم کے زوال، تباہی، خستہ حالی اور پریشانیوں کا نوحہ تو ایک مدت سے رویا جاتا رہا ہے۔ یہ نوحہ خواں آنسوؤں میں ڈوبے لفظ لکھتے رہے ہیں اور فریاد سے پر نغمے تحریر کرتے رہے ہیں۔ حالی نے جب مدوجزر اسلام کے عنوان سے اپنی مشہور مسدس تحریر کی تو اس میں دنیا کے تاریخی نقشے پر اپنے عروج و زوال کی کہانی تحریر کرتے ہوئے وہ اس دعا پر یوں لگتا ہے دل سے رو پڑے ہوں گے۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دُعا ہے
اُمت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دین جو نکلا تھا بڑی شان سے وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

حالی کا نوحہ خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد کا نوحہ ہے۔ جب اس پوری مسلم اُمت کو یوں کاٹ دیا گیا تھا جیسے میز پر رکھ کر کیک کاٹا جاتا ہے۔ یہ حجاز ہے تو یہ عراق، شام ہے تو اُردن۔ اس تقسیم کا بنیادی مقصد اس اُمت کی تقسیم اس لئے تھی کہ اس خطے میں تیل دریافت ہو چکا تھا اور اگر سلطنت عثمانیہ جیسی بڑی اور طاقت ور قوت کے ہاتھ میں تیل کی دولت بھی آجاتی تو پھر اس دنیا کے نقشے پر ان سے بڑی کوئی طاقت نہ ہوتی۔ اسی لئے جہاں تیل زیادہ تھا اُس حصے کو مختصر ترین حکومتوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ صرف متحدہ عرب امارات میں ہی سات ریاستیں تھیں، اس کے علاوہ اس پٹی میں کویت، بحرین، قطر اور مسقط جیسے ایک ایک شہر پر مشتمل ملک وجود میں لائے گئے اور یہ سب اتحادی فوجوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی ذلت آمیز شکست کے بعد ہوا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُس وقت اس برصغیر میں ایک قیامت خیز تحریک اس خلافت کو بچانے کے لئے متحرک تھی۔ یہ لوگ خود غلام تھے لیکن خلافت عثمانیہ کو بچانے کے لئے اپنے قابض حکمرانوں سے لڑ رہے تھے۔ لیکن اس پورے قومی جذبے کے سامنے جس میں گاندھی اور سوامی شردھانند جیسے کٹر ہندو بھی مسلمانوں کا ساتھ دے رہے تھے اس برصغیر میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جس نے فوج میں بھرتی ہو کر عراق میں عثمانی فوجوں کے ساتھ جنگ کی اور حجاز کی مقدس سرزمین پر خانہ کعبہ پر گولیاں چلائیں اور اُسے فتح کر کے اتحادی فوجوں کا پرچم اُس سرزمین پر لہرا دیا۔ اُس کے بعد اس ملک میں جاگیروں، جائیدادوں، تمغوں اور اعزازات کا ایک سلسلہ چل نکلا، کوئی خان بہادر ہوا تو کوئی نواب، کسی کو وکٹوریہ کراس ملا تو کسی کو ملکہ برطانیہ کی خاص سند۔ اس دن سے لے کر آج تک اس قوم کے عوام کی رائے ایک طرف اور ان لوگوں کی غلامی اور کاسۂ لیسی کی روح دوسری طرف ہی رہی۔ پہلے انگریز نے انہیں ایک نامزد کردہ قسم کی اسمبلی کا رکن بنا کر اس قوم کی تقدیر ان کے ہاتھ میں دے دی۔ کسی کو اعزازی بھرتی کرنے کا کام سونپ دیا گیا۔ یوں جب یہ لوگ عطا کردہ جاگیروں اور حاصل کردہ عہدوں کے حوالے سے اپنے اپنے علاقوں میں طاقت، اقتدار اور قوت حاصل کر کے فرعونوں کی مسند پر جا بیٹھے، ان کا حکم آخری اور اُس کی خلاف ورزی کی سزا انتہائی بھیانک ہونے لگی۔ تو پھر اقبال کی ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کے اس شعر کے مطابق جس میں ابلیس اپنے حواریوں سے کہتا ہے:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب کبھی آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

یعنی ان کی قیادت پر جمہوریت کی مہر تصدیق ثبت کر دی گئی۔ یہی لوگ اپنے اثر و رسوخ، عطا کردہ جائیدادوں اور حاصل کردہ عہدوں کے طفیل اسمبلیوں میں پہنچے اور اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ آج کی قیادت کا شجرۂ نسب تلاش کریں تو آپ کو کہیں نہ کہیں کوئی خان بہادر، کوئی اعزازی مجسٹریٹ، کوئی نواب، سردار، تمن دار یا وکٹوریہ کراس حاصل کرنے والا جانثار فوجی ضرور ملے گا۔ آج بھی اس ملک کی سیادت اور قیادت انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے لیکن آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بھی اس قوم کا ذہین ترین طبقہ اپنی حالت پر ماتم کرتا تھا، نوحہ کناں تھا اور آج بھی ہے۔ اس منافقانہ قیادت نے ایک ایسا بیج اس قوم میں بویا کہ جس کی جڑیں دور دور تک پھیل گئیں۔ یہ قیادت اللہ پر یقین رکھتی تھی لیکن حاکم انگریز کو مانتی تھی۔ وہ نعرہ جو اس ملک کے در و بام پر ذلت و رُسوائی سے تحریر تھا کہ ملک اللہ کا، حکومت بادشاہ کی اور حکم کمپنی بہادر کا، آج دو سو سال گذرنے کے بعد بھی یہی منافقانہ نعرہ ہمارے ملک پر حکمران ہے۔ صرف الفاظ بدل گئے ہیں۔ آئین کے تحت یہ ملک اللہ کا ہے، حکومت صدر یا وزیراعظم کی ہے اور حکم امریکہ بہادر کا۔ ایسی قیادت کا ایک عجیب و غریب اثر ہوتا ہے۔ ایک زہر ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ قوموں میں سرایت کر جاتا ہے جسے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک قول میں کس خوبی سے سمجھایا ہے۔ آپ نے کہا، "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِم" (لوگ اپنے بادشاہوں کے راستے پر ہی چلتے ہیں)۔ یوں اس قوم میں وہ منافقت آہستہ آہستہ جڑ پکڑنے لگی۔ سب کہتے تھے کہ بادشاہ حقیقی تو اللہ کی ذات ہے لیکن حکم ہے وہاں پر برادری کا، خاندان کا، دوست کا چلنا شروع ہوا۔ پھر اپنی ذات سب پر مقدم ہو گئی۔ اپنے نفس کی حکمرانی غالب آگئی۔ یہی وہ مقام تھا جب اقبال نے شکوہ جیسی نظم میں اس اُمت کے زوال کا رونا رویا تو جو الہامی جواب انہوں نے جواب شکوہ میں تحریر کیا اُس کا یہ شعر ہمارے زوال اور مغرب کے عروج کی کہانی بیان کرنے کے لئے کافی ہے۔

عدل ہے فاطر ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئین ہوا کافر تو ملیں حور و قصور

یعنی جب کافر مسلمانوں جیسی اعلیٰ اقدار اختیار کر لیتا ہے تو پھر وہی اللہ کی جانب سے مراعات کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ اور اگر مسلمان ان اقدار کو چھوڑ دیتے ہیں تو ذلت و رُسوائی ان کا مقدر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ عادل ہے۔ میں اس قوم کی اخلاقی زبوں حالی کا ماتم نہیں کرنا چاہتا کہ اب یہ مقام ماتم سے آگے نکل چکا ہے۔ اب ہم بد دیانت، چور، کرپٹ شخص کا ببانگ دہل دفاع کرتے ہیں۔ ہم اپنی اخلاقی برائیوں اور جنسی بے راہ رویوں کو انسانی حقوق کا نام دیتے ہیں۔ ہمارا پورے کا پورا انتظامی ڈھانچہ گر کر تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ ہمارے چپڑاسی سے وزیر تک کوئی شخص اگر ایماندار نظر آجائے تو اُسے عجائب گھر کی زینت بنانے کو جی چاہتا ہے کہ کہیں ہم پھر اسے دوبارہ نہ دیکھ سکیں۔ ہماری نفرتوں کا یہ عالم ہے کہ ہم صرف ہاتھ باندھ کر پڑھنے یا ہاتھ کھول کر پڑھنے پر نمازیوں کو فاسق اور واجب القتل قرار دے دیتے ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی ظلم ہوتا تھا مغرب کے فلسفی و دانشور اُس کی مخالفت میں اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ سارتر اور برٹینڈر رسل کی مثال مشہور ہے۔ ہمارے پڑوس میں لاکھوں لوگ ذبح کر دیئے جاتے ہیں ہم خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہماری حالت اقبال کی اُس رُباعی کی طرح ہو چکی ہے:

مسلماناں بخویشاں در ستیزند
بجز نقش دوئی بر دل نہ ریزند
بنالند از کسے خشتے بگیرد
ازاں مسجد کہ خود ازوے گریزد

مسلمان اپنے بھائیوں اور دوستوں سے لڑتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اختلاف کے سوا کوئی اور نقش موجود نہیں۔ اگر مسجد کی ایک اینٹ بھی کوئی اُٹھا کر لے جائے تو یہ احتجاج کرتے ہیں لیکن خود اس مسجد سے کوسوں دور بھاگتے ہیں" اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ ظالم اور نااہل حکمرانوں کا عذاب مسلط کر دیتا ہے۔ لیکن قومیں جب اجتماعی طور پر ناقابلِ اصلاح ہو جائیں تو پھر وہاں ایک ایسا عذاب مسلط ہوتا ہے۔ ایک ایسی سرجری کی جاتی ہے جس سے کینسر کی تمام رسولیاں کاٹ کر پھینک دی جاتی ہیں۔ شاید اس آپریشن کا وقت آن پہنچا ہے۔ اس لئے کہ گذشتہ تین سالوں سے اس قوم کو اس کے نوحہ خواں اللہ سے معافی و استغفار کی درخواست کرتے رہے۔ ہم اجتماعی استغفار کے شاید قائل نہیں کہ سب کے سامنے ہمارا سر کیوں جھکے، ہم کیوں اللہ کے سامنے خود کو کمزور کہیں۔ ایسے میں میرے اللہ کا ایک ہی فیصلہ ہوا کرتا ہے نہ جھکنے والے سروں کو توڑ دیا جائے۔ اس آفت و عذاب کی آمد پر صرف ایک جانب نظر اُٹھتی ہے۔ ایک طرف سے دعا کی درخواست چاہتا ہوں۔ جو اقبال نے چاہی تھی:

مسلماں آں فقیر کج کلاہے
امید از سینہ او از سوز آہے
دلش نالد، چرا نالد، نداند
نگاہے یا رسول اللہ ﷺ نگاہے

مسلماں ایک کج کلاہ فقیر ہے لیکن اس کا سینہ سوز و آہ سے خالی ہو چکا ہے۔ دل روتا ہے، کیوں روتا ہے، کوئی خبر نہیں۔ بس اے سید الانبیاء ﷺ آپ کی ایک نگاہ درکار ہے، ہم پر نگاہِ کرم کیجئے۔ ہماری نسبت آپ سے ہے، ہم آج بھی آپ پر مر مٹنے کو تیار ہوتے ہیں۔

مظلوم انسان، مضطرب صدائیں

تم پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ مقتول کو اِس بات کا علم نہیں ہو گا کہ وہ کیوں قتل کیا گیا اور قاتل بھی اس بات سے بے خبر ہو گا کہ اُس نے یہ قتل کیوں کیا۔ سیدالانبیاء ﷺ کی حدیث کا یہ مفہوم کس زمانے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ وہ عذاب ہے جس کی جانب آپ نے اشارہ کیا اور آج ہم جس کا مزا چکھ رہے ہیں۔ جنازوں کو کندھا دینے والوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور آنکھوں میں تیرتے آنسو ہر سمت نظر آتے ہیں۔ خوف سے ہجرت کرنے والوں کے ہجوم اب ایک شہر سے دوسرے شہر تک پھیلتے جا رہے ہیں۔ یہ غیر محسوس ہجرت اور لوگوں کی دربدری ہمیں دکھائی نہیں دے رہی کہ ہم اپنے حال میں مست ہیں۔ پہلے اربابِ اختیار مست ہوتے تھے اب حکومت کا چوتھا اور نوزائیدہ ستون میڈیا بھی اپنی رنگینیوں میں گم ہے۔ سوچتا ہوں کس کا ماتم کروں اور کس کے لئے نوحہ لکھوں۔ بم دھماکوں اور طالبان کے ہاتھوں مرنے والوں کے نوحہ خواں تو گلی گلی کوچے کوچے موجود ہیں کہ یہی رائج الوقت ہے۔ لیکن بلوچستان میں لگی ہوئی آگ اور اُس میں جھلستے ہوئے انسانوں کے لئے آنسو بہانے سکے کے لئے کسی کو چند لمحے میسر نہیں آتے۔ کہ ایسا کرنے سے نہ اسلام کا نام بدنام ہوتا ہے، نہ سیکولرازم کے دعوے کو تقویت ملتی ہے اور نہ ہی امریکہ کی عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حصہ ڈال کر قیمت وصول کی جا سکتی ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس میڈیا کی چکاچوند میں اگر آدمی کو مرنا بھی ہو تو ان کے ہاتھوں سے مرے جنہیں میڈیا ظالم سمجھتا ہے اور جنہیں گالی دینا چاہتا ہے۔ ورنہ اُس کی موت کسی شعیب اور ثانیہ کے دعوتِ ولیمہ کی شہنائیوں میں یوں گم ہو جائے گی جیسے بارات کی گاڑی کے نیچے کوئی معصوم بلی آ کر کچلی جائے لیکن بینڈ باجے کا شور اور رقص و سرود کی دھما چوکڑی ایسی ہو کہ اُس کی آخری چیخیں تک سنائی نہ دیں۔ ایسا ہی تو ناظمہ طالب کے ساتھ ہوا۔ ایک مرنجامرنج، حساس اور بلوچستان کے مسائل کا درد رکھنے والی استاد کئی سو میل دور سے کوئٹہ میں پڑھانے کے لئے آئی۔ اُس وقت وہاں میڈیا کا مضمون پڑھانے والا کوئی نہ تھا۔ چوبیس سال پڑھانے کے بعد اُس کے کتنے بلوچ شاگرد ہوں گے جنہیں اخباروں، ٹی وی چینلوں اور دیگر اداروں میں نوکریاں ملی ہوں گی اور انہوں نے ان کے ذریعے اپنے مسائل کو زبان دی ہو گی۔ ایک حساس شاعرہ جو پیدا تو کراچی میں ہوئی لیکن اُس کی شاعری میں بلوچستان جھلکتا تھا۔ یوں خاموش کر دی گئی۔ کاش وہ پنجاب یونیورسٹی میں ہوتی اور اُسے کوئی مذہبی تنظیم زخمی کرتی۔ کم از کم اُس کا خون تو میڈیا کی زینت بنتا۔ اُس کی عظمت کے ترانے اور مارنے والوں کی بہیمیت کی داستانیں بیان ہوتیں۔ لیکن یہ تو اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں اور اپنے اپنے قلم اور زبان کی عصمت ہوتی ہے بلکہ اب تو کیمرے کی بھی عصمت ہے جس کے بس میں ہوتا ہے وہ اُسے سنبھال کر رکھتا ہے اور جو چاہتا ہے اُسے اپنے ارادے، نظریے اور تعصب کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے۔

کوئٹہ، سوات اور وزیرستان کے زخم ایک جیسے ہیں۔ خوفزدہ انسان اور بے گھر گھرانے ایک طرح کے دکھ سہتے ہیں۔ لاپتہ افراد کا المیہ بھی ایک ہے۔ لیکن ہمارا رویہ اور ہماری بے حسی ان سب سے مختلف نوعیت کی ہے۔ میرے دفتر میں کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جب بلوچستان سے ہجرت کرنے والا کوئی خانماں برباد شخص اپنی کہانی لے کر نہ آئے۔ اس میں صرف پنجابی نہیں بلکہ پشتون، بلوچ، ہزارے اور بروہی سب شامل ہوتے ہیں۔ سب خوف کے عالم میں وہاں سے کوچ کر کے آتے ہیں کہ ان کے نزدیک راکٹ لانچر، خودکش حملہ آور، بندوق کی گولی یا گرنیڈ پہچانتا نہیں کہ سامنے کپڑوں میں کس رنگ، نسل اور زبان کا آدمی ہے۔ کوئی تجزیہ نہیں کرتا کہ یہ سب کہاں، کس جگہ اور کس لئے ہو رہا ہے۔ بلوچستان کا پشتون بھی اتنا ہی محروم ہے، اُس کے ہاں بھی نہ سڑکیں ہیں نہ ہسپتال، نہ سکول ہیں اور نہ وافر خوراک۔ لیکن وہاں امن کیوں ہے۔ اس لئے کہ وہاں کسی پرویز مشرف کی ذاتی انا اور فرعونیت کی تسکین کے لئے دستے نہیں بھیجے گئے۔ انگریز کی آمد سے لے کر مشرف کی آمریت سے پہلے تک ڈیرہ بگٹی بلوچستان کا سب سے پرامن خطہ تھا۔ وہاں ذوالفقار علی بھٹو کے ملٹری آپریشن کے دوران بھی امن تھا۔ وہاں آگ کس نے لگائی۔ وہ نواب اکبر بگٹی جسے سب بلوچ رہنما اپنا غدار سمجھتے تھے اور پس پردہ اپنی محفلوں میں اُس کے خلاف نازیبا زبان استعمال کرتے تھے، اُس کی شہادت کا تحفہ بلوچ سیاست کو کس نے دیا۔ اور پھر بلوچستان کو آگ اور خون میں کس نے ڈبو دیا۔ جب تعصب کی ہوا چلتی ہے تو پھر انسانیت کوچ کر جاتی ہے۔ 1985ء سے 1999ء تک یہ ہوا ختم ہو چکی تھی لیکن آج اس کے طوفان سے کسی کا گھر سلامت نہیں۔

کیا کوئی میڈیا کا صاحبِ غیرت قلم کار یا پروگرام کرنے والا یہ سوال اُٹھائے گا کہ چلو پنجابی کو تو غاصب گردان کر قتل کیا جا رہا ہے کہ یہ بلوچ رہنماؤں کا ایک فیشن ہے۔ لیکن مجھے بھارت کے شہر اندور میں کئی سو ہندو خاندان ملے جو بلوچستان میں انہی بلوچ آزادی کے علمبرداروں کے ہاتھوں سے تنگ آ کر ہجرت کر چکے تھے۔ میرا دوست گردھاری لعل بھاٹیہ کتنے ماہ قید میں رہا، تاوان ادا کیا اور پھر چپکے سے ملک چھوڑ گیا۔ بلوچ تو بلوچستان میں عراق کے شہر حلب سے آ کر آباد ہوئے لیکن ان سے پہلے صدیوں سے آباد یہاں آتش پرست پارسی رہا کرتے تھے۔ ایک چھوٹی سی کالونی جس کی خوبصورتی مثال کی تھی۔ آج وہاں کتنے لوگ رہ گئے۔ کس کے ہاتھوں خوفزدہ ہوئے۔ نوشکی، مستونگ، دالبندین اور خضدار کے ہندو کہاں چلے گئے۔ میں چاغی میں تھا تو ایک ہندو لڑکے کی کچھ بلوچ لڑکوں سے لڑائی ہوئی۔ میں نے کیس درج کرنے کے لئے کہا تو پوری ہندو پنچایت میرے پاس آ گئی، خوفزدہ سہمی ہوئی۔ ان کے ہاتھ ان کے ننھے ننھے بچوں کی شرمناک تصویریں تھیں۔ کہنے لگے یہ ہمیں خوفزدہ بھی کریں گے اور بدنام بھی۔ کاش ان ہندوؤں کو کسی مولوی نے بلوچستان سے نکالا ہوتا۔ کسی طالبان کے خوف سے انہوں نے ہجرت کی ہوتی۔ ایسے میں انسانی حقوق کے علمبرداروں، دانشوروں کا قلم اور این جی اوز کا احتجاج سب یوں میڈیا کی زینت بنتے کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ کتنے بدنصیب تھے وہ ہندو اور پارسی جو بلوچ قومیت کی نذر ہو گئے۔ کتنا بدقسمت تھا گردھاری لعل بھاٹیہ جو قومیت کے خوف سے ملک چھوڑ کر گیا۔ کاش مسلم قومیت کے نام پر ظلم کا شکار ہوتا تو کوئی سعادت حسن منٹو ایک بار پھر ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسی کہانی تو لکھ دیتا۔

یہ تعصب کی داغ بیل ہم نے ڈالی ہے۔ ہم نے انسانوں کو رنگ اور نسل میں بانٹا ہے۔ ہم نے علاقوں کو اہمیت دی اور انسانوں کو ذلیل و رسوا بنا دیا۔ یہ ہمارے اعمال ہیں۔ ہم وہ دہرے معیارات رکھنے والی قوم کے شہری ہیں جنہیں امریکہ کہے تو اپنے شہروں کو ویران کر دیں۔ وہاں دہشت گردی کی جنگ میں مرنے والے بچوں اور عورتوں کے نام تک کسی اخبار میں نہ آئیں۔ ہم اس قوم کے شہری ہیں جو "سب سے پہلے پاکستان" کے نام پر اگر پرویز مشرف کہے تو پورے بلوچستان کو آگ اور خون میں نہلا دیں۔ دس سال تک بلوچستان سے لاپتہ ہونے والوں، مرنے والوں اور ہجرت کرنے والوں کے نام تک اخبارات میں نہ آئیں اور آج وہاں ناحق مرنے والوں کا نوحہ بھی کوئی نہیں کہتا۔ لیکن ہمیں ان سب سے کیا۔ آیئے ان ناحق مرنے والوں، ہجرت کی دربدری میں زندگی گذارنے والوں، لاپتہ لوگوں کے غم میں دن رات آنسو بہانے والوں کا غم غلط کریں۔ کسی اور ثانیہ اور شعیب کو ڈھونڈیں، کوئی اور امن کی آشا کی تلاش کریں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ جیتنے پر جشن منائیں۔ لیکن وہ جنہیں میرے رب میں نظر عطا کی ہے انہیں خبر ہے کہ جس سرزمین پر مظلوم انسانوں کی قبریں بڑھنے لگیں وہاں سے مضطرب دلوں سے اُٹھنے والی صداؤں کی گونج مستقل ہو جاتی ہے اور میرے رب کا غصہ اور غضب ایسے عذاب کی صورت نازل ہوتا ہے کہ لوگوں کو سزا دینے یا قتل کرنے کے لئے کسی لشکر یا فوج کی ضرورت نہیں ہوتی، میرے ہادیٔ برحق سیدالانبیاءؐ کے مطابق "تم ایک دوسرے کو قتل کر کے عذاب کا مزہ چکھتے ہو"۔

یہ تو خلافت واپس چاہتے ہیں

ایک جانب دنیا اس بات سے آشکار ہو رہی تھی کہ مسلمانوں کی آخری خلافت سلطنت عثمانیہ کے عرب علاقے تیل کی ایسی دولت سے مالا مال ہیں کہ اگر یہ مسلم امہ کے اجتماعی قبضے میں آ گئی تو دنیا کے نقشے پر مسلمانوں کی خلافت سے زیادہ طاقتور، وسائل سے بھرپور اور ایک امت کے تصور میں متحد قوم کی موجودگی میں کسی اور طاقت کا چراغ نہیں جل سکے گا۔ اس وقت موجود دنیا میں عالمی سامراجی طاقتیں فرانس اور برطانیہ اس امت کی مرکزیت یعنی خلافت کو بزور طاقت اور بذریعہ سازش ختم کرنے کی کوششوں میں لگی تھیں۔ 1916ء میں کرنل ٹی ایس لارنس جسے دنیا لارنس آف عریبیہ کے نام سے جانتی ہے جزیرہ نمائے عرب کے مسلمانوں کو قومیت کا درس دے کر ترکوں کے خلافت بھڑکا رہا تھا اور اسی کی کوششوں سے شریف مکہ نے علم بغاوت بلند کیا ہوا تھا۔ میک موہن جن دنوں شریف مکہ سے مذاکرات کر رہا تھا انہی دنوں فرانسیسی اور انگریز ایک خفیہ معاہدے پر کام کر رہے تھے کہ کیسے مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں کا انتظام آپس میں بانٹنا ہے۔ لیکن دوسری جانب پورا مغرب ایک اور سازش کا بیج مسلم امہ میں بونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ 2 نومبر 1917ء کو یروشلم کی فتح سے ایک ماہ قبل برطانیہ کے وزیراعظم جارج لائیڈ نے اپنے وزیر خارجہ آرتھر بالفور کو ایک خط لکھا کہ مندرجہ ذیل اہم اعلان کیا جائے "شہنشاہ معظم کی حکومت، فلسطین میں یہودی لوگوں کیلئے ایک خود مختار ریاست بنانے پر آمادگی کا اظہار کرتی ہے اور اس مقصد کے حصول کیلئے تمام تر حمایت اور کوششیں بروئے کار لائے گی"۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عرب فلسطین کی مجموعی آبادی کا 90 فیصد تھے۔ جبکہ یروشلم کے مقدس شہر میں مسلمان 50 فیصد تھے جبکہ باقی 50 فیصد میں عیسائی اور یہودی شامل تھے۔ مسلمانوں کی مرکزیت کو پارہ پارہ کرنے کے بعد اور انہیں قومیت کے جھگڑوں میں الجھانے اور ایک دوسرے سے برسرپیکار کرنے کے بعد یورپ سے جس طرح یہودیوں کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک نہ ختم ہونے والے نفرت کے سیلاب کا شکار کیا گیا اور پھر انہیں دھکیل دھکیل کر اس فلسطین کی سرزمین پر آباد کروایا گیا جہاں ایک دن بقول قائداعظمؒ "مغرب کے حرامی بچے "اسرائیل" نے جنم لینا تھا۔ 1933 میں یہاں یہودی 18 فیصد ہو گئے اور صرف تین سال بعد 1936ء میں ان کی آبادی 30 فیصد تک جا پہنچی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی نے ہٹلر سے ملاقات کی اور کہا کہ یورپ میں یہودیوں کی سازشانہ حرکتوں میں پیدا ہونے والی نفرت کا نتیجہ ہم لوگ کیوں بھگتیں۔ یہ لوگ تو بخت نصر کے زمانے سے جس ملک میں بھی آباد ہوئے انہوں نے اپنے ہی مادر وطن یا پناہ دینے والے خطے سے غداری کی اور پھر لوگوں نے انہیں نفرت سے دھتکارتے ہوئے اپنے علاقوں سے نکال دیا۔ 1421ء میں انہیں اور لینز اور ویانا سے نکالا گیا۔ 1424ء میں کولون سے، 1439ء میں آگ سبرگ سے، 1442ء میں باویریا سے، 1454ء میں موراویا سے، 1485ء میں پیروگیا سے، 1486ء میں ویلنزا سے، 1488ء میں پارما سے، 1489ء میں میلان سے اور 1492ء میں ٹسکنی سے انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ صرف ایک صدی کی تاریخ ہے جب کہ ہر صدی ان کی اپنے ملک کے ساتھ غداری اور جلاوطنی سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن جنگ عظیم اول کے بعد مسلمانوں کی مرکزیت تھی اور نہ امت مسلمہ کا کوئی تصور۔ یہ سب تو قومیت کے سیلابوں میں بہہ چکا تھا۔ اب صرف یہودیوں کی یلغار تھی اور تیل کی دولت پر قبیلہ در قبیلہ تقسیم کی گئی عرب اقوام۔ اور یوں دنیا کے نقشے پر "مغرب کا حرامی بچہ" اپنے وجود میں آیا۔ اس کے وجود میں آنے کے بعد 1967ء میں عرب اسرائیل جنگ ہوئی اور وہ مسلم امہ جس نے اس سرزمین پر صلاح الدین ایوبی کی لازوال داستان رقم تھی اس نے ایسے شکست کھائی کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ دریائے اردن کا مغربی کنارہ، صحرائے سینا، غزہ، گولان کی پہاڑیاں سب اسرائیل کے قبضے میں تھیں اور جوتیوں سے ٹھوکریں مارتے ہوئے اسرائیل جرنیل اس مسجد اقصیٰ کے دالانوں میں گھوم رہے تھے جہاں میرے پیارے رسولؐ نے تمام انبیاء کی امامت کی اور اپنے معراج کے سفر کا آغاز کیا۔

لیکن اس عرب قومیت کے نعرے، جس میں جمال ناصر جیسا شخص اپنے آپ کو آل فرعون کہتا تھا اور ذلت آمیز شکست کھاتا تھا، اس کے مقابلے میں وہ مسلمان جو ایک اللہ کی وحدانیت اور رسولؐ کی رسالت پر ایمان رکھتے تھے۔ جن کے ہاں رنگ، نسل اور زبان کے بت بے معنی تھے انہوں نے بہت آوازیں بلند کیں۔ ان میں سے ایک آواز اخوان المسلمون کی تھی۔ مصر کے حسن البناؒ اور سید قطبؒ کے خون نے جس تنظیم کی آبیاری کی۔ اس تنظیم کی فلسطینی شاخ کے چند افراد نے جب اسرائیلی مظالم، عالمی خاموشی اور مسلم امہ کی سرد مہری کو دیکھا تو 1987ء میں حرکت المقاومتہ اسلامیہ کے نام سے ایک تنظیم بنائی جسے عرف عام میں حماس کہا جاتا ہے۔ شیخ احمد یٰسین، عبدالعزیز رنتیی اور محمد طٰہ جس کے بانیوں میں سے تھے۔ یہ وہ تنظیم تھی جس نے سالانہ 70 ملین ڈالر کے بجٹ کے ساتھ فلسطینیوں کی رفاع کے منصوبے بنائے، ہسپتال، سکول، وظائف، ایمبولینس، یتیم خانے اور مہاجرین کی مدد۔ ان لوگوں کی دیانت اور امانت پر پورا مشرق وسطیٰ فخر کرتا تھا۔ یہی وہ اعتماد تھا کہ جنوری 2006ء میں حماس نے فلسطین کا الیکشن واضح اکثریت کے ساتھ جیتا۔ اس کے بعد کی کہانی خونچکاں بھی ہے اور خوفناک بھی۔ نہ اس کے بعد مغرب کی مہذب دنیا کو جمہوریت یاد رہی اور نہ بھوک اور پیاس سے مرتے ہوئے فلسطینی۔ سازشوں کے ذریعے اور طاقت کے استعمال سے انہیں مغربی کنارے سے نکال کر غزہ دھکیل دیا گیا اور پھر اس علاقے کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ ڈیڑھ سال سے وہاں کے ہسپتالوں میں اسپرین کی گولی تک نہ پہنچنے دی گئی۔ وہ لوگ بجلی اور پانی کو ترستے رہے اور عین اس دن جب میرے ملک کے تمام نشریاتی ادارے اپنی ایک لیڈر کی شہادت کی برسی کے پروگراموں میں مگن تھے، ان نہتے لوگوں پر حملہ کر دیا گیا۔ ہم اس قدر محو خرام تھے کہ یہ خبر ویسے ہی گزر گئی جیسے سیاسی جلوس میں لوگوں کے پاؤں تلے آ کر کچلے جانے والے شخص کی چیخیں تک لوگوں تک نہیں پہنچتیں۔ وہ تو بس اپنے نعروں میں مگن اسے روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اب اسرائیل فوج اپنے ٹینکوں سمیت غزہ میں داخل ہوئی ہے اور اس کا پہلا شکار ایک بچہ ہے۔ پانچ سو سے زیادہ معصوم افراد شہید ہو چکے ہیں۔ فلسطینیوں پر یہ مصیبت نئی نہیں۔ ان کے مہاجر کیمپ اور ان میں موجود لوگ اپنے پیاروں کے چلے جانے، ان پر ظلم و تشدد اور بربریت کے شاہد ہیں۔ انہیں صابرہ اور شطیلہ بھی یاد ہے اور بلڈوزروں سے گرتے گھر بھی، انہیں ہر ظلم یاد ہے اور ان کی ویب سائٹس ان تصویروں سے بھری پڑی ہیں جنہیں دیکھنے کی ہمت مشکل سے ہوتی ہے۔

لیکن میں صرف ایک سوال پوری مسلم امہ کے سامنے چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر مسلمانوں کی مرکزی خلافت موجود ہوتی جسے اس لئے توڑا گیا کہ تیل کی دولت اور دیگر وسائل اس امت پر تقسیم ہو کر اسے خوشحال نہ کر دیں۔ اس مرکزی خلافت کے پاس یہ وسائل بھی ہوتے اور ایٹمی قوت بھی تو کیا عالمی برادری کا ضمیر ایسے ہی مردہ رہتا، کیا ایسے ہی کوئی ایک ایک کر کے ہم پر چڑھ دوڑتا۔ حیرت ہے کہ جو یورپ دو عظیم جنگیں لڑتا ہے، کروڑوں لوگوں کا خون بہاتا ہے، آپس میں سو سالہ روزیز کی جنگ لڑتا ہے وہ ایک پرچم اور ایک پارلیمنٹ اور ایک کرنسی میں متحد ہوتا ہے اور جب امت مسلمہ ایسا کرنا چاہے، جو یہ نعرہ بلند کرے وہ دہشت گرد ہے اور بش اور اس کے حواری صرف ایک فقرہ بولتے ہیں۔ (THEYWANTKHILAFABACK) انہیں خلافت واپس چاہیے اور اگر ایسا ہو گیا تو عالمی امن خطرے میں پڑ جائے گا۔ بش اور ٹونی بلیئر کی تقریریں ریکارڈ پر ہیں۔ لیکن کیا کریں ہم وہ بے حس اور بے ضمیر لوگ ہیں کہ جس جنگ کو مغرب اپنے لائف سٹائل کیلئے خطرہ کہتا ہے، جس جنگ کو وہ خلافت اور مرکزیت کی جنگ کہہ کر دہشت گردی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم اسے اپنی جنگ کہہ کر اپناتے ہیں۔ اپنوں کا خون بہاتے ہیں۔ جہاں غیرت اور سربلندی سے جینے کا راستہ موجود ہو وہاں بے غیرتی سے گم سم کھڑے اپنے شہریوں کو مرتے دیکھتے ہیں۔ خواہ غزہ میں اسرائیل کے جہاز ماریں یا سرحد میں امریکہ کے ڈرون۔